

Handwritten text in purple ink on aged, stained paper. The text is written in a cursive script, likely Persian or Urdu. The visible characters include:

شاه
پسر

The text is partially obscured by the right edge of the page and the binding of the book.

آخرِ شب کے مسافر

قُرَّةُ الْعَيْنِ حیدر

چودھری کبیر می

۳۱۳۔ ذوالقرنین چیمبرز گنپت روڈ، لاہور

ناشر ————— محمد خالد چودھری
 اہتمام ————— میاں محمد اسلم
 مطبع —————
 قیمت ————— پینتیس روپے

مطبوعہ
 عبد اللہ سنز پرنٹرز
 ۱۴ - دربار مارکیٹ - لاہور

پیش لفظ

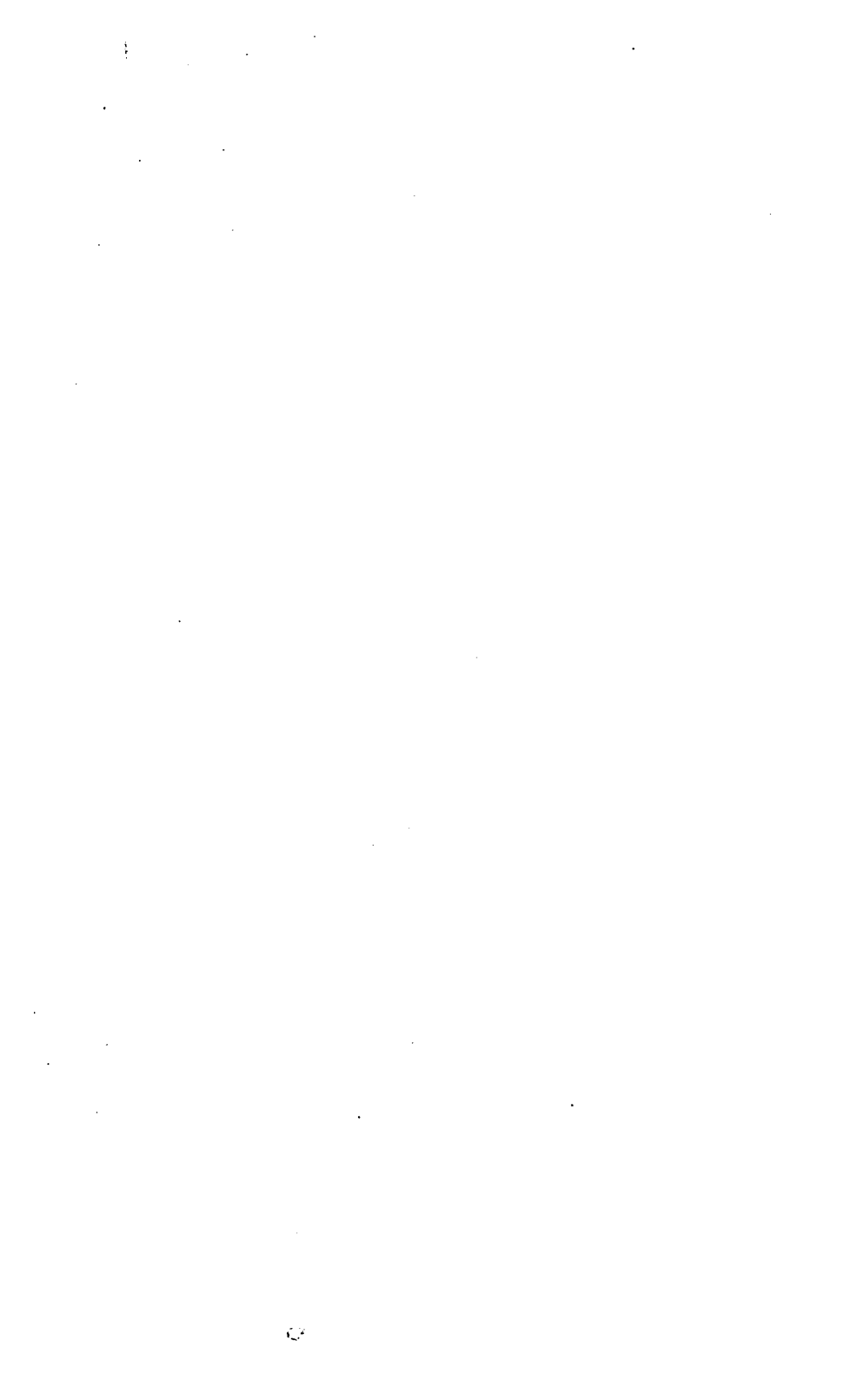
بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک ۱۹۴۲ء کا اندولن، مطالبہ پاکستان، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ولیم کینٹ ویل نام کا کوئی انگریز ڈھاکہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد ”چارلس بارلو، بنگال سولین“ اسی طرح سرایہ ورڈ سے لے کر فوجوان رچرڈ تنک سارا بارلو خاندان، دیپالی مرکار، ریمان الدین احمد، پادری بنرجی، ادمارٹے، نواب قمر الزماں چودھری، جہاں بیگم، ناصرہ نجم السحر، یاسمین بلونٹ، وغیرہ وغیرہ سارے کردار اور ان سے منسوب واقعات خیالی اور محض افسانہ ہیں۔ اور کسی ہندوستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی شخصیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

اس ناول کے اٹھائیس ابواب ۱۷۶۷ء میں رسالہ گفتگو (مجمعی) میں شائع ہو چکے ہیں۔

سرورق کی تصویر اسمبلاز میں ناچیز نے بنائی ہے۔ کرمان کا جھونپڑا مسجد، کالی باڑی، کبی راستے اور نوکائیں، عہد ایٹ انڈیا کمپنی کا جارجین کوئٹل مکان اور دخانی جہاز مشرقی بنگال کا مخصوص نظارہ ہے۔ کوئٹل میٹشن انگریز جاگم یا پلانٹر یا بڑے بنگالی زمیندار کی جائے رہائش، مشرقی بنگال کے عظیم دریاؤں پر چلنے والا اور مشرقی بنگال کے ”سہرے ریشے“ پٹ سن کو کلکتہ اور اسکاٹ لینڈ لے جانے والا جہاز بنگال کے تین سو سالہ سیاسی، ذہنی اور تہذیبی ریش کنکشن کی علامت بھی ہے۔

حقوۃ العین حیدر

مجمعی ۱۹۷۹ء



الواب

نمبر صفحہ

۹

۱۷

۲۰

۲۲

۲۸

۴۸

۶۲

۶۶

۷۱

۷۵

۸۲

۹۱

۹۴

۹۸

۱۔ چند رکچ

۲۔ طوفان سے پہلے

۳۔ ووڈ کینڈل

۴۔ جوار بھانا گیت

۵۔ کھاری اودارائے

۶۔ ریلورڈ پال میتھیو بنرجی

۷۔ نیا عجم نامہ

۸۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنک

۹۔ کلثوم آیا

۱۰۔ ویشو بیراگی

۱۱۔ رلی کاٹج

۱۲۔ شانتی نکیتن

۱۳۔ مس روزی بنرجی اور سولیڈرٹی

۱۴۔ امار پرائیوٹ آرام موٹیر ائسند

- ۱۵۔ سندربن ۱۰۱
- ۱۶۔ ارجسند منزل ۱۲۵
- ۱۷۔ گوڑ ملہار ۱۲۷
- ۱۸۔ میگلہ رنجی رائی ۱۵۱
- ۱۹۔ بھیرلی کا خواب ۱۵۴
- ۲۰۔ ہرے بنگال کا "آئندہ کائنات" ۱۶۳
- ۲۱۔ اگست اندولن اور سپلز وار ۱۶۸
- ۲۲۔ بدروی ۱۷۱
- ۲۳۔ گنگا اور برہمپتر ۱۸۰
- ۲۴۔ چارلس بارلو، "بنگال سولین" ۱۸۹
- ۲۵۔ فواب قمر الزماں چودھری ۲۳۲
- ۲۶۔ ریحان الدین احمد ۲۳۷
- ۲۷۔ جہاں آراء میگو ۲۴۱
- ۲۸۔ رونگیلا نائیر مانجی ۲۴۷
- ۲۹۔ شرمستی رادھیکا سانیاں ۲۷۳
- ۳۰۔ ڈاکٹر منوہر چندر سرکار ۲۷۹
- ۳۱۔ دہن کی پاکلی ۲۹۱
- ۳۲۔ محل اور اتمل ۲۹۹

- ۳۳ - بر دژ آف پیراڈائز
- ۳۲۳ - ایستفگري بالاسنبري
- ۳۲۴ - یاسین بلونٹ، "ڈارک ڈانسر"
- ۳۲۷ - پائلٹ آفیسر اکمل مرشدزاده
- ۳۳۲ - ششکری کاناج
- ۳۳۵ - گڈلک ڈائری
- ۳۵۰ - شہر زاد کرینا بلونٹ
- ۳۵۳ - سوای آتم آند ششکری
- ۳۵۶ - جلسہ گھر
- ۳۷۰ - نامہ نجم السمرقادی
- ۳۷۶ - رچرڈ بارلو
- ۳۸۲ - آتار شتاتی - ؟
- ۳۸۷ - ونگلہ راگنی
- ۳۹۲ - بھیروراک



چندر کنج

ڈھاکہ شہر کے ایک درمیانی درجے کے رہائشی علاقے میں ام اور کیلے کے درختوں میں جیسی وہ ایک پرانی دمنج کی سفید کوٹھی ہے۔ اس کی دیواریں کاٹی سے سبز ہو چکی ہیں اور روشن دالوں اور کھربوں میں کئی جگہ پریشیوں کی جگہ ٹین کے کنستریٹ ٹکڑے اور رقتیاں لگی ہیں۔ سائے کے برآمدے میں ایک سرے پر باتشاک کی مضبوط چٹائیاں کھڑی کر کے ایک کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کی ادھی ساری کاپردہ۔ ٹنگا ہے۔ اندر ایک بیچ، ایک میز اور طبی معائنے کا ادنیٰ سا بلنگ بچا ہے، جس کے گدے کا نیلا چمڑا جگہ جگہ سے اُدھر لگایا ہے۔ دواؤں کی الماریاں اور نام مینی کی چیمپی کا اسٹینڈ ایک دیوار کے برابر لگا ہوا ہے۔ میز کے پیچھے بڑا کیسلنڈر آویزاں ہے۔

برآمدے اور کٹناہہ ہوادار کمروں کے سرخ و سفید فرش با افراط پانی سے دھوئے جانے کی وجہ سے صاف ستھرے اور چمکیلے ہیں۔ برآمدے میں ایک بیچ اور دو تین موٹے پڑے ہیں اور دو سائیکل کھڑی ہیں۔ برآمدے میں سے اندر "بیٹھک خانہ" صاف دکھلائی دینا ہے۔ اس میں مید کا ایک صوف اور چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ کونے کی ایک میز پر کامی غلات سے ڈھکا ہار مونیم اور دیوار کے سہارے ایک ایسراج بھی موجود ہے۔ بیٹھک کی دیواروں پر آئینے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کے دو بڑے پورٹریٹ آویزاں ہیں۔ ان پر ایسی دھندلی دھندلی سی کیفیت طاری ہے، جو کسی پراسرار نامعلوم کیمسٹری کے ذریعے ان لوگوں کی تصویروں پر آپ سے آپ چھا جاتی ہے، جو مریچکے ہیں۔ عورت نو عمر اور دلکش، لٹمی ساری سے سر ڈھانپنے اور ایک انکلی اپنی ٹھوڑی پر رکھے خاصی خوابناک آنکھوں سے کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں سنہیدنتال لپیٹے ایک خوش شکل نوجوان سر جھکائے غور سے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا ہے۔

چند ضخیم کتابیں مخمیں میز پر پیش کر رکھی اس کی ایک کھتی کے نزدیک رکھی ہیں۔ دونوں تصویروں پر گولے کے ہار پڑے ہیں، جن کا جھٹکا ٹھکانا قریباً بالابڑ چکا ہے۔

”بیٹھک خانے“ کے دروازے پہلو کے ددکروں میں کھلتے ہیں۔ دائیں جانب والے کمرے میں کھانے کی میز اور نعمت خانے کے نزدیک برابر برابر تین چار پائیاں۔ کونے میں بید کی تین میزوں پر اسکول کی کتابوں کے انبار بھوٹی ریشمیں اور قمیضیں۔ کینوس کے نئے اور پرانے جوتوں کا ڈھیر ایک کونے میں پڑا ہے۔ ادھ کھلے ٹین کے بکس چار پائیوں کے نیچے ٹھنسیں ہیں۔ کھانے کی میز کھرک کے پاس پھی ہے۔ یہ کھرک پہلو کے ہرے بھرے احاطے میں کھلتی ہے۔ اسی کمرے کے برابر میں ایک اور چھوٹا کمرہ ہے جس کی ایک دیوار پر کھڑی کے تختے لگا کر کانس سے بنادی گئی ہے۔ اس پر دواؤں کی شبینیاں، پرلنے خطبیتز، قلم دوات، چند زنانہ بنگالی رسالے اور سلائی کی ٹوکری رکھی ہے۔ کانس کے نیچے پتیلے سے تخت پر فنخاف بستر لگا ہے۔ ایک کونے میں مختصر سا مندر ہے۔ صندل کی چوکی پر رکھی ہوئی مورتیوں پر گنبدے کے تازہ ہار پڑے ہیں۔ مورتیوں کے سامنے اچلی رکھی ہے۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹی تصویر، جس میں ایک وکیل صاحب گاؤں پہنچے ہیں۔ اس تصویر پر بھی تازہ ہار پڑا ہوا ہے۔ چوکی کے سامنے سبتل پائی بھی ہے جس کے ایک کنارے پر کھڑاؤں کی جوڑی رکھی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں سستی کی انگی بریغیر گئی کی چند سفید ساریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کمرے کا دروازہ پچھلے برآمدے میں رسوئی گھر کے عین مقابل میں کھلتا ہے۔

”میٹھک خانے“ کے بایں جانب والے کمرے میں جو مطب سے ملحق ہے، صرف ایک پلنگ اور ایک آرام کرسی پڑی ہے۔ کونے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کمرے کا مبین دنیاوی ضروریات سے خاصا بے نیاز اور لے پیرا ہے۔

اس کمرے کے پیچھے ایک اور کمرہ ہے۔ اس میں سلاخوں والی کمڑ کی کئی نیپے کھادی کی چادر سے ڈھک پلنگ بچا ہے۔ سر ہانے ایک الماری ایک میز بائستی کی دیوار کے ساتھ ایک ٹرنک اور اس کے اوپر ایک چمڑے کا اٹچی کیس، کھوٹی پر چند سوئی سا رباں۔ الماری کے ایک ... میں آئینہ، لنگھی، ناریل کے تیل کی کٹوری فرش پر ایک کونے میں بھی خوش

رنگ دری پر کتبوں اور کابیوں کا ڈھیر۔

پچھلے برآمدے کے ایک سرے پر درسوئی گھر اور دوسرے پر گودام ہے، جس کے دروازے
 جس بھاری تالا بڑا ہے۔ غسلخانے برآمدے سے باہر آنگن میں ایک قطار میں بنے ہیں جن تک پہنچنے
 کے لئے ایک چوبی تختے پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ غسلخانوں کے برابر میں سے زمین کو مٹی کی چھت پر بنے
 سرے اور مین کے سائبان کی طرف جاتا ہے۔ سرسبز آنگن کے وسط میں تالاب جس میں روپو
 پھلیاں پلے ہیں۔ تالاب کے سامنے تنسی کا متقش گملا اور دو ایک گوشے میں آم کے گھنے درخت
 بے نیچے جھلیوں والی بند گاڑی کھڑی ہے۔ جس کی کھڑکیوں میں چڑھیلوں نے گھونسے بنائے ہیں۔
 لگن کے تین طرف سرخ اینٹوں کی دیوار ہے۔ دیواروں کے چوڑے دروازے کے باہر اونچی
 بچی گھاس میں سے گزرتی ایک پگڈنڈی آگے جا کر پچھوڑے کی سمنان سروٹک سے جاملتی ہے۔
 ان میں کپڑوں کی خالی انگنی پر کڑے آن بیٹھے ہیں۔

فہاڑ ابھی برس کر چکی ہے۔ کوٹھی میں بڑا سناٹا ہے۔ خالی کمرے میں بھیگی ہوئی ہوا
 لے دروازوں میں سے گزرتی سنڈلاتی پھر رہی ہے۔ ایک غسلخانے میں سے پانی گرنے کی آواز آرہی
 اور بھاٹک کے باہر ایک کھاراکروں میں ٹھہرا چل رہا ہے۔ جھٹ پٹکی نیم تاریکی میں اس کی
 کی روشنی کبھی کبھی نیڑی سے چمک اٹھتی ہے۔ بھاٹک کے ایک ستون پر جو برسہا برس کی بازو
 دچھاڑ سے ترجھا ہو کر ایک طرف کو دھنس گیا ہے۔ ”ڈاکٹر بنوئے چند رسرکار ایم بی۔ بی۔
 “ کا بورڈ لگا ہے۔ دوسرے ستون پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر رنگالی میں ”چند رکنج“ نقش ہے۔
 اندر مطلب کی دیوار پر لگے چرخہ کاتے گاندھی جی اور منہم جوان سال نہرو کی بھڑی رنگین
 یروں والے کیلنڈر کے ورق بوڑھی گنگا پر سے آتی ہوئی اس بھیگی ہوا میں آہستہ آہستہ بھٹکتا
 ہے ہیں۔

اس روز، دسمبر ۱۹۴۷ء کی اس تاریک شام، جب سارا گھر سمنان بڑا تھا۔ چند رکنج کے
 برآمدے والے گودام میں جو رہی ہو گئی۔
 سیند لگانے والی، اس گھر کی انیس سالہ بیٹی دیپا کی تھی۔

ڈاکٹر بنوئے چند سرکار مطب بند کر کے حسب معمول ہوا خوری کے لئے باہر جا چکے تھے۔ اُن کے تینوں لڑکے کھوکھو، شوخو اور ٹونو ابھی فٹ بال کے میدان سے نہیں لوٹے تھے اور عسانی نے میں پانی گرنے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر سرکار کی بیوہ ہیں بھوتارنی دیہی اشنان کے چند منٹ بعد پوچھا میں مصروف ہونے والی ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر سرکار کی اکلونی لڑکی دیپالی لالین ہاتھ میں لٹے زینے سے نیچے باغ میں اُتری، اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور وہ اندھیرا پڑنے تک کوٹھے والے کمرے میں جہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی "ہوم ورک" کرتی رہی تھی۔ نیچے آکر اس نے لالین تلخی لے کر کھلے کے نیچے جھپادی لہور دے پاؤں برآمد کی میٹر بھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی جو میٹھک خانے کے بائیں جانب تھا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی بھوتارنی دیہی غسل خانے سے نکل کر کھڑاڑ پہنے کھٹ کھٹ کرتی چوبلی بل پر سے گزر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔

دیپالی دم سادھے کوٹھے کے نیچے کھڑی رہی اور چند منٹ بعد بیچوں کے بل چلتی بھوتارنی دیہی کے کمرے میں گئی جو سیٹل پائیپر لگتی پانی میچہ گرلو بان سلگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے دنیا دیکھا سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ دیپالی نے چند لمحوں کی چمکا ہٹ کے بعد آگے بڑھ کر کنبیوں کا موٹا گچھا ان کی پشت پر پڑے پتو سے کھولا اور باہر آگئی۔ تلخی کے نیچے سے لالین لال کر گودام تک پہنچی اُردوڑتے ڈرتے نالا کھولا۔ اندر جا کر لالین ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور چاروں طرف دیکھا۔ گودام میں شدت کا جیس اور سیلن تھی۔ آنگن کے رخ والی مقفل کھڑکی کے شیشوں پر امرت بازار تریکا کے پیسے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ متفرق فالتو مسلمان کے علاوہ کوٹھری میں ایک بہت بڑا چوبلی صندوق اینٹوں کے اوپر رکھا تھا۔ اس صندوق میں بنا رسی اور بالوچہ بوٹے دار ساریاں اور دوسرا قیمتی سامان مقفل تھا۔ برسال جاڑوں میں بھوتارنی دیہی صندوق کھول کر بڑے انتہام سے بالوچہ ساریاں باہر نکالیں اور آنگن میں چارپائیوں پر پھیلا کر اُن کو دھوپ میں سُکھایا جاتا۔ اس کے بعد یہ بالوچہ ساریاں پھونم کے پتوں کی تہہ دے کر اس کا احتیاط سے بکس میں واپس رکھ دی جاتیں۔

دیپالی نے سانس روک کر صندوق کا نالا کھولا۔ اس کے کپڑوں پر کچی کشمیری شال سرکار تہہ میں سے ساریاں نکالیں اور اُن کو جلدی جلدی فرش پر رکھ گئی۔ بنا رسی اور جلدانی کی ساریاں ایک طرف

کر کے اس نے ”باؤچر بوٹے دار“ ساریاں بلبندہ کیں جو خدا میں نہیں تھیں۔ باہر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے لالٹین کی لواؤچی کر کے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔ ساریاں سید پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی نوالی کے مرشد آباد کے گڑھوں سے اتری ہوں۔ موقع کی نزاکت کے باوجود وہ ان کے آنچلوں پر بنے نقش و نگار کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔ کاستی، نارنجی، فیروزہ۔ کاستی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مرشد آباد کے نواب بچوان نوش کر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلو پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگلینڈ ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزہ ساری کے آنچل پر منخل سیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سوکھنے میں مصروف تھیں۔ وقت شیشم کے اس تانے بانے میں الجھ کر ختم چکا تھا۔

اچانک برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ دیپالی نے پھرتی سے تیزوں ساریاں سفید ملل کے ٹکڑے میں بیٹیں۔ باقی سلمان صندوق میں واپس رکھا۔ اور سہم کردروانے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ مگر اب پھر ناموشی چھا چکی تھی۔ صحن میں کپدے اور سینا چھل کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بہت دور سڑک پر ایک ٹھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں نجانے کہاں جا رہی تھی۔

دیپالی نے لمبا سانس لیا اور ساریوں کا بندل اپنے آنچل میں چھپا کر باہر نکلی۔ گودام میں تالا ٹایا۔ بندل برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈال دیا اور بھوتارنی دیہی کے کمرے میں جا کر نہایت صفائی سے کنبیاں ان کے پتوں میں باندھ دیں۔ بھوتارنی دیہی چڑچڑی اور تنک مزاج ہونے کے علاوہ غیروں کے معاملے میں حد سے زیادہ سخت گیر اور محتاط تھیں۔ وہ ڈولی تنک کا تالا صرف اپنے تھ سے کھولتی تھیں۔ کنبیاں ان کے پتوں میں باندھنے کے بعد دیپالی نے پوری طرح آنکھیں کھول رہی تھیں۔ مگر وہ کی طرف دیکھا اور دروازے سے نکلی۔ سیڑھیوں پر سے بندل اٹھا کر آنگن میں سے ماگتی دیوڑھی سے تیر کی طرح نکل کے پھیل سڑک پر پہنچ گئی۔ پھاٹک پر بیٹھا کہاں جلم ختم کر کے کہیں اسیب ہو چکا تھا۔ دیپالی نے چاروں طرف دیکھا اور چند قدم آگے بڑھی۔ سڑک کی پیلا کے نزدیک نوجوان سائیکل سنبھالے کھڑے نیازی سے آسمان کو تنک رہا تھا۔ دیپالی کو دیکھ کر اس نے تھکا لکا سا اشارہ کیا۔

دیپالی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اچانک کر سائیکل کے پیچھے کمرہ پر بیٹھ گئی۔

نواب پورے کی ایک گلی کے سرے پر ایک قدیم مکان کی بیٹھک میں چند نوجوان فرش پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن میں سے ایک نے نظر اٹھا کر دیکھا دیسیاں سرکار سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر بندل نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا۔ ایل نوجوان نے بندل کھولا۔

”دادا۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز میرے گھر میں نہیں ہے۔“

اس نوجوان نے جسے دیسیاں نے مخاطب کیا تھا۔ ساریاں اٹھی بلیٹیں۔ ”باؤچر ساریاں“ اُس کے

منہ سے نکلا۔ اس نوجوان نے اپنے شانوں پر زلفیں چھٹکار کھی تھیں۔

”باؤچر۔!“ دوسرے نوجوانوں نے حیرت اور اشتیاق سے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔

”مگر جھائی ان کو خریدے گا کون۔؟ یہیں تو نور اچھے سو روپے چاہئیں۔“

”سار سو تک میں نہیں بک جائیں گی؟“ دیسیاں نے منتظر ہو کر پوچھا۔

”باؤچر ساریاں؟ آج کل دیسیاں اپر کلاس لیڈ میز انگریزی جارجیٹ پہنتی ہیں۔“

”مگر یہ۔۔۔ یہ تو بے مثلی چیز ہے اور نایاب۔“ دوسرے نوجوان نے کہا۔

”ہندوستان کا بیشتر پرانا فن نایاب اور بے مثال ہے۔ پہلے نے چڑک جواب دیا۔“ اس سے

لیا فرق پڑتا ہے۔“ پھر وہ دیسیاں سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارے پاس اور کچھ نہیں؟“

”دیسیاں نے تاسف سے سر ہلایا۔ دفعتاً اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”ان کو بیچنے یا گروی رکھنے کی

وشش تو کیجئے اکتے دادا۔“

زلفوں والا نوجوان گہرا سانس لے کر فرش پر سے اٹھا۔ ”اچھا۔ تھینک یو۔ دیسیاں۔ اب تم لوں

جھاگ جاؤ فوراً۔“ اور دفعتاً وہ تینوں نوجوان، جن میں سے تیسرا بالکل خاموش رہا تھا۔ بندل سمیت کونٹری

کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اب رات کے نوج رہے تھے اور میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ بھوتارنی دیہی حسبِ عادت بڑبڑاتی

ہوئی رسوئی گھر اور کھانے کے کمرے کے پھرے کر رہی تھیں۔ کھو کھو، شو نو اور گونج سے واپس آکر تندہی

سے کھیل پر بحث کرنے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر سرکار چل قدمی سے لوٹ آئے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کر

پر نیم دراز حسبِ عادت ایک پاؤں ہلانے ہوئے سوچ بچار میں مصروف تھے۔

”دیپالی۔“ انہوں نے آواز دی۔

دیپالی اپنے کمرے سے نکل۔ ڈاکٹر سرکار آرام کرسی سے اٹھ کر بیچک خانے سے گزرنے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک بھاری جسم کے متین چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ ان کے چہرے کے سکون سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاموشی اور صبر کی دوسرا صف میں زندہ رہنا انہوں نے سیکھ لیا ہے۔

کھانے کی میز پر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے دیپالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ اسی وقت اندر آرہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار نے ذرا تعجب سے اس کا جائزہ لیا۔

”کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟ اتنی گھرائی ہوئی کیوں ہو۔“

”جی نہیں۔ بابا۔ میں روزی۔ روزی کے گھر گئی تھی۔ واپس آرہی تھی تو۔“ لپٹا کے پاس ایک بھینسہ مل گیا۔ اُس کے در سے دوڑتی دوڑتی آرہی ہوں۔“ اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا چاہا۔

”اتنی رات گئے روزی کے گھر سے اکیلی آرہی ہو؟“ ڈاکٹر سرکار نے ذرا درشتی سے اُسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”جی۔ جی نہیں۔ جو رات ساتھ آیا تھا۔“ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے تینوں چھوٹے بھائی شور مچاتے ہوئے کھانا کھانے میں جُٹ چکے تھے۔

”ایک خوش خبری تمہارے لئے۔“ کھانے کے دوران میں ڈاکٹر سرکار نے دیپالی سے کہا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ ”کیسی خوش خبری۔ بابا؟“

”اشیت بابو۔“ ڈاکٹر سرکار نے کرسی پیچھے سرکا کے جواب دیا۔ ”میں ابھی اشیت بابو کے

ہاں گیا تھا۔ وہاں ان کے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔“

”کلکتے والے؟ حیوتی بابو۔؟“

”حیوتی بابو۔ وہ تمہارے ریکارڈ بھرنے چاہتے ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ دی ریکارڈ۔“

”میرے ریکارڈ؟ ایچ بابا۔ سچ بتائیے۔؟“

تینوں لڑکوں نے کھانا چھوڑ کر غل مچا ثمر و ع کر دیا۔

”دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ گھر گھر دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ کھوکھو نے زنگیہ سے اعلان کیا۔
”دیدہ امیر ہو جائے گی۔“ منجھلا شو تو زور سے چلا یا۔

”دیدہ ہم کو پیسے دے گی۔“ ٹوٹو نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔

”ہمارے سائٹس ماسٹر شینل بابو کی بڑی دیدہ کے ریکارڈ سارے انڈیا میں بکتے ہیں۔ وہ اتنی
امیر ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاس تو موٹر بھی ہے۔“ شو تو بولا۔

”دیدہ ریڈیو سے جتنے پیسے ملتے ہیں لا کر تم لوگوں پر خرچ کر دیتی ہے۔“ کھوکھو نے ڈانٹ بنائی۔

”دیدہ اتنے پیسے کیا کرے گی؟“ سب سے چھوٹے ٹوٹو نے جو سب سے لاڈلا تھا ملاحظہ کیا۔

”اپنا جہیز بنائے گی، اور کیا تمہارا سر کرے گی۔“ بھوتارنی دیہی نے جواب تک تیوری پر بل

ڈالے چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول تھیں، گرج کر کہا۔

دیپاتی ذرا سی سرخ ہو گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس سارے ہنگامے میں وہ شام کی

مہم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ میز پر سے اٹھنے لگی تو ڈاکٹر سرکار نے اس سے کہا۔ ”جیوتی بابو۔“

انہوں نے تم سے کل ریڈیو اسٹیشن پر ملنے کو کہا ہے۔ تم کو ریکارڈنگ کے لئے ملکہ جانا ہو گا۔ تم ریڈیو

اسٹیشن کل کس وقت جاؤ گی؟“

”صبح کو بابا۔ دس بجے۔“

”کالچ پھر ناغہ۔؟“

”بابا۔ اب تو چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اور (ط) کے اب ہڑمچانے یا تھ دھونے کیلئے

باہر جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیہی چپ چاپ برتن میٹھنے میں مصروف تھیں) بابا۔ پروگرام کے پیسے جمع کر

کے پتوں کے کپڑے بنادیتے تھے۔“ وہ ٹھٹھک گئی۔ ”بابا۔ میری ساریاں بھی بالکل پھٹنے والی ہو رہی

ہیں۔“ اس نے جھینپ کر بات ختم کی۔

ڈاکٹر سرکار نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور گودام کے نزدیک والے

نل کے پاس کھڑے ہو کر کھانا کرنے لگے۔ دیپاتی چیکے چیکے پیچھے آئی اور گودام کے بند کواڑوں کو نور سے

دیکھا جن میں لگا لوہے کا وزن تھا تالا بھد ساکت اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

طوفان سے پہلے

”ابانی گنگو پادھیائے۔“

”پریزنٹ۔“

”مولینا گھوشال۔“

”پریزنٹ۔“

”موزی بنرجی۔“

”پریزنٹ۔“

”جہاں آراچودھری۔“

”پریزنٹ۔“

”دیپالی سرکار۔“

”ایبسنٹ۔“

سوکس (civic) کی لیکچرر مسز بوس نے سیکنڈ ایر آرٹس کی حاضری لیتے ہوئے روزی بنرجی اور جہاں آراچودھری کے برابر والی تیسری خالی کرسی پر نظر ڈالی۔

”دیپالی پھر غائب ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”دیکھئے کروٹا دی۔“ جہاں آرا نے پتو منہ پر رکھ کر کھی کھی کرتے ہوئے سرورسنی چھپا کی کوشش کی۔ ”دیپالی بیمار ہے۔“

”تم کو کیسے معلوم؟ تم تو اس کے گھر سے اتنی دور رہتی ہو۔؟“

”وہ کل۔۔۔ میرا مطلب ہے، کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیمار پڑ گئی ہے بے چاری۔“

”لڑکیو۔“ مسز بوس نے کلاس کو بڑے دکھ سے مخاطب کیا۔ ”فائنل امتحان سر پر ہیں اور

تم سب کی سب ہوگی فیمل - اور روزی -

”ایس کردنادی -“

”تم دونوں - تم اور دیپا آتی ہر وقت ڈر لے کرنے میں جٹی رہتی ہو یہ وقت - ایک ٹریس ہوگی؟“
”کھی کھی کھی -“ روزی اور جہاں آرانے ہنسی روکی -

”کہہ دوں -؟“ روزی نے چپکے سے جہاں آراء سے پوچھا۔
”کہہ دو -“

”کردنادی - دیکھئے کردنادی - اصل میں دیپا آتی کلکتے جا رہی ہے - ایچ - ایم - وی ریکارڈ بھر جانے“
”ایچ - ایم - وی ریکارڈ -“ ساری کلاس نے خرہ لگایا۔

”آج وہ گراموفون کمپنی کے ڈائریکٹر سے ملنے جا رہی تھی تو راستے میں میرے گھر پر چھٹی کی غمی
چھوڑ گئی -“ روزی نے کہا۔

”کہاں بے عرضی -؟“

”بھول آئی کردنادی - کھی کھی کھی -“

مسز بوس ایک بینک دل اور شریف خاتون تھیں۔ انہوں نے ذرا جھلا کر روزی کو گھورا
اور باقیانہ کلاس کی ماضی لگانے کے بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ لہجہ اختیار کر کے سامنے
دیکھتے ہوئے کہا - ”صفحہ ۲۱۸ کھولو - گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء -“

”ادہ - ہو - ہو - ادہ - دیپا آتی کی خوشی میں کردنادی - آج جلدی چھٹی پلیئر - پلیئر - پلیئر -“

”جاؤ - جاگو - منہ جلی چڑھائیں -“ آدھ گھنٹہ پڑھانے کے بعد مسز بوس نے مصنوعی غصے کے ساتھ
کتاب زور سے بند کی۔ لوگ کیاں بھڑکھڑکتی مکرے سے نکل کر باہر گھاس پر بکھر گئیں۔

روزی اور جہاں آراء نے ٹلک شباب پر جا کر چاٹ خریدی۔

ابانی نے قریب آکر چپکے سے روزی سے کہا - ”چائٹ پر کوئی روکا دیپا آتی کو پوچھ رہا ہے -“

”وہی -؟“

”ہاں -“

”میں جاتی ہوں -“

روز ہی بھاگتی ہوئی دور چھانک پر پہنچی۔ نوجوان جو کل شام دیپالی کو سائیکل پر بٹھا نواب پور لے گیا تھا، اطمینان سے درخت کی آڑ میں کھڑا پاؤں جبار ہاتھ۔ قریب ہی ایک گائے سن پر نکھرے چاٹ کے خالی دونوں پر منہ مارنے میں مصروف تھی۔

”دیپالی نہیں آئی ہے۔ کوئی پیغام۔؟“

”ہاں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اس سے کہنا ۱۹ تاریخ کی شام کو ریڈیو اسٹیشن کی برساتی ٹھیک سات بجے ضرور پہنچ جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ جس کام کے لئے کل گئی تھی وہ امید ایک دو دن میں ہو جائے گا۔“

”اور کچھ۔؟“

”بس۔ نو مشکار۔“ لڑکا سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا ہوا ہو گیا۔
روز ہی جو بے حد تیزی سے دوڑتی چھانک پر آئی تھی اب سر جھکائے سوچ میں ڈوبی ملک نشا پہنچی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہو کر کسی نئی خبر پر زور زور سے تبصرہ کر رہی تھیں۔
”اور سنائتم نے روز ہی۔“ سندھیانے کہا۔ ”مس ہیڈ کے آج کہہ دی تھیں کہ مس اومارے مسے واپس آگئی ہیں اور شاید پھر یہاں بڑھانا شروع کر دیں۔“
”مارے گئے۔ دیدی کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ دیدی کہتی ہیں کہ بس جان نکال لیتی تھیں۔“
قے نے کہا۔

”ہمارے تو بھیا مزے ہیں۔ ہم تو انٹر کے بعد گھر بیٹھ جائیں گے۔ ابانے حکم دے دیا ہے!“
آرانے کیا۔ ”تم لوگ اپنے مرقی رہو۔“

”تیرا تو۔ اس کا جہاں آرا کا نوکسی ڈرھیل مولوی سے بیاہ ہو گا۔ جناب مولوی بے نو مرین احمد صاحب۔“ مولیٰ مسخری دو سولانے منہ پھاڑ کر بول کر تے ہوئے کہا۔ اور چنے چٹائی پر مدارے ہٹ بھاگ۔

”تو خود بھاگ۔“

سہ منزلہ عمارت میں پانچویں پیرید کی گھنٹی بجی۔

”چلو بھائی۔ آگیا مس گرین فیلڈ کا گھنٹہ۔“ روزی نے منہ بنا کر کہا۔

”وہیں وہیں دیں۔“ روٹولا منہ ٹیڑھا کر کے مس گرین فیلڈ کی نقل کرتی، چپے چھانکتی اُگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے روزی بنرجی اور جہاں آرا چودہری لڑکیوں کے غول میں شامل عمارت کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس وقت جاٹوں کی سہانی دھوپ ہماری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈ گریڈ کالج کی بلند عمارات پڑھائی کی سفیدہ خاموشی میں ڈوب گئیں۔ جس طرح جہاز آہستہ گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ان عمارتوں کے روشن مکروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی منجھرائیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھ رہیں۔ جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی، قدیم بنگال کی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جمی حصولِ علم میں مہمک تھیں اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیکراں پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ دی گئیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لئے وہ لڑا کرتے تھے۔ وہ فراموش کر دیئے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کی ہمت دنیا کو بہت دیر لگی۔ لیکن سیکراں زندگی میں ہر آواز، ہر کرب اور وقت کا ہر عکس موجود ہے اور زندہ ہے اور دفعتاً کالج پر پھیلایا ہوا سنسناٹا گہرا ہو گیا کہ اُسے باسانی سنا جاسکتا تھا۔ طوفان

چھانے والا سنسٹا

۳

وِڈِلِیَنڈز

رسمنا کی ایک عالیشان کوٹھی کے ایک پہلو کے کمرے کے فرانیسی درجے میں سے م اور نیلا آسمان نظر آسکتا تھا کیونکہ حدِ نظر تک ہر بالی کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ اکا دکا پورا

پھولوں کے تختوں میں پیچھے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھے۔ دریچے کی سیٹ پر جوئریخ ب کے پھولوں والے جھالہ دار غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی، ایک نوجوان خاتون عینک لگائے بیت کے عالم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ سیزران کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ دریچے کے قریب لکڑی کی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹے چھوٹے بیضوی فریموں میں چند اور ارسو کرٹیک سنگائی تین کی تعداد پر جھلار ہی تھیں۔ مکروہ جوائنگری اصطلاح میں مارننگ روم کہلاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر گلاب کی سبل کے نکلے گلابی اور زرد، اور کاسنی اور سبز بیڑن والا دل مندھا تھا۔ اس طرح کا دل پیر ایک زمانہ میں امرائے مملکتہ خاص طور پر ولایت سے منگوا کر بنے مکروں میں لگواتے تھے۔

دیواروں پر سنہری فرموں والی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ لارڈ بائرن یونان کے ساحل تی سے اتر رہے ہیں۔ کانسٹیبل کا ایک دیہاتی منظر۔ آبری بیرڈنلے کی مشہور سلوٹس مکرو اٹلڈ والی جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس، تھالی میں دھرے یو جٹا پیغمبر کے بریدہ، سر کے بال پکڑے ہیں بھر رہی ہے۔ ایک تصویر مسٹر پک وک کی تھی۔

دروازوں پر اور دیوچوں میں موٹی ریشمی ڈوریوں سے بندھے بھند فوں والے دیویشمی پردے تھے۔ آئینہ دان پر ڈریڈن چائنا کی چرواہی بیٹھی تھی۔ اس کمرے کا اور سائے گھر کا طرز آرائش، طور پر مغربی اور دکٹورین تھا۔

لیکن جو خاتون اس مارننگ روم میں موجود تھیں وہ دکٹورین نہیں تھیں۔ وہ ایک جوشیلی باشعور اور سنجیدہ سیاسی کارکن تھیں جس پر وہ خط لکھ رہی تھیں اس کے اوپر کے ایک کونے دو وڈینڈز، رمنا، ڈھاکہ، گوٹھک پرنٹ میں ثبت تھا۔ مگر مکتوب الیہ لندن اسکول آف لٹس کا ایک برطانوی یہودی کمیونسٹ پروفیسر تھا۔

خط لکھتے لکھتے دفعتاً انہوں نے غصے سے توڑ مروڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ فری سیزر۔ ذرا سے اٹھ کر اخلاقاً اس کی طرف لپکا۔ لیکن خاتون اسی طرح دل گرفتہ اور جھنجھلائی ہوئی بیٹھی رہیں۔

لہذا کو بیا آگیا تھا کہ یہ خط سارا کا سارا اس سر کی نذر ہو جائے گا چند منٹ بعد سر ہاتھوں میں لے کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگیں اور پھر کرب سے انہوں نے

سوچا۔ اب مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ انہوں نے مینک انا کر انکھیں زور سے میچ لیں۔ اور اسی طرح ساکت بیٹھیں رہیں۔ اب وہ دانے گیمبریل روزیٹکی کی دامتوزیل معلوم ہو سکتی تھیں۔

جب بیرسٹر پری تو شکار رائے نے اپنی وسیع و عریض کوٹلی کا نام ”وڈو بیٹنڈ“ رکھا تو وہ آج رواج کی تقلید کر رہے تھے جس کے تحت ہندوستان کا نیا مغربی تعلیم یافتہ ادب ہی طبقہ تقریباً سو برس سے اپنی کوٹھنوں کے انگریزی نام رکھنے میں مصروف تھا۔ ہمارا راجہ کوچ بہار کے کلکتے والے محل کا نام بھی وڈو لینڈ تھا۔ مگر بیرسٹر رائے کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بیرسٹر رائے برہمنو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان چودھری پر یواروں کی مانند زمیندار تھے اور مذہبی لحاظ سے قدامت پسند ہندو۔ زیادہ تر دت، سیکن اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں برہمنو ہو چکی تھیں۔ لیکن بیرسٹر رائے کے دادا کیشپ چندر سین کے چیلے بن گئے تھے اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی سے برہمنو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹر رائے کی والدہ اور چھو بیٹیوں تک نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔ بیرسٹر رائے کی بیوی مشہور ”سوشل فلگر“ تھیں۔ اسی کا بڑا بڑا کزن ملینڈو، بڑا دیندنی مملکت میں اعلیٰ ایگریکلیٹ اور ”کنفرنڈ بیلے“ تھا۔ اور زیادہ وقت ریس کو ریس پر اور شراب نوشی میں گزارتا تھا۔ بیرسٹر رائے کو نکاحی کر ان کی لڑکی بھی کہیں کنفرنڈ اسٹیٹسمن بن جائے۔ آٹا یہی نظر آتے تھے۔ مگر اس صورت حال کا مداوا اُن کے پاس نہیں تھا۔ اُن کے باپ کی نسل نے بچپن کی شادی اور دوسری سماجی خرابیوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور آزادی نسوان کا پرچار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اور اب اوما اُن کی لڑکی اٹھائیس سال کی ہونے کو آئی تھی اور شادی سے منکر تھی۔ اور وہ اور ان کی بیوی اوما کی خلاف ورزی شادی پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔ بیرسٹر رائے اکثر دکھ سے سوچ رہا تھا کہ ”خواتین کا جن میں اوما بھی شامل ہے، کیا انجام ہوگا؟“ مگر اوما نے اس سوچ سے ایک ترقی یافتہ سماج ہے، مگر پرانی اور نئی اقدار کی اس اوپریش کی زد خود اپنی زندگی پر پڑے تو کیا کرنا چاہیے؟ اوما کی شکل بہت معمولی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے اس کے لئے آ سکتے تھے۔ لیکن وہ میا سست کے چکر میں مبتلا تھی۔ اوما یہی ایک گول موٹل چیرے والی گد بدی سی

پہنچی تھیں۔ اُن کے ناموں دھرتندر موہن سین ڈی آئی۔ جی پولس، بھانجی کے سواگت کے لئے شمالی بنگال سے ووڈ لینڈز ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ اور اُن کے محلے کے کانٹیل اور پولس انسپکٹ ووڈ لینڈز کے احاطے میں ہر طرف پھرتے پھرتے تھے۔

ابھی ڈائینگ روم میں لیچ کاسر بلا کھنٹہ بچے گا۔ ماں اور بابا اور ماما کھانے کی طویل میز پر سیدنا لنگی سے آکر بیٹھیں گے اور کھڑکھڑاتے — سفید نیپکن کھولتے ہوئے اس سے بڑی سفر کے حالات دریافت کریں گے۔ جنگ چھڑنے کے بعد آتما کے خیریت وطن واپس آجانے کی سزا کنبے میں خوشیاں منائی جائیں گی۔ آتما اُدھے سر کے درد کی مریض تھیں۔ لندن جانے سے قبل انڈیا میں جب درد مرکا دوزہ پڑتا تھا تو وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے رائے خاندان کے کارڈن ہاؤس چلی جاتی تھیں۔ جو دریائے میگھنا کے ایک خوبصورت جزیرے پر پلاش کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ آج صبح بریک فاسٹ کی میز پر ماسوں نے ان کی مضمحل صورت دیکھ کر تجویز کیا تھا کہ وہ سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے چند روز کو کارڈن ہاؤس چلی جائیں، لیکن خود آدما رائے کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑنے والی ہیں اور بہت سی متوقع اور غیر متوقع مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا انھیں بہت جلد سامنا کرنا ہے۔ سفید کشمیری شمال کندھوں سے اچھی طرح لپیٹ کر وہ دند و سیٹ پر سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

۴

جواری بھاتا کا گیت

ڈھاکہ کے ایک مسلمان رئیس کی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر حکومت نے حال ہی میں اس میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ یہ کوٹھی بھی ڈھاکہ کی ساری عمارتوں کی طرح قدیم، دقیا فوسی اور مافی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب دیہاتی نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔ ڈاکٹر سرکار بڑی باقاعدگی سے اس کے ساتھ آتے تھے اور چھڑی کی موٹے پر ہاتھ دھرے برآمدے کی ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھے

رہتے تھے۔ لیکن تین چار بار آنے کے بعد وہ اگتا گئے تھے۔ مطب کے حرج کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مگر انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن غیر اخلاقی نئے نہیں ہے۔ ملکہ شہر میں بڑی آزادی تھی۔ لیکن فیوڈل ڈھاکر ابھی سید قدامت پسند اور بے مائدہ تھا۔ اور خود ڈاکٹر سرکار غفار کاؤں منسلح میمن سنگھ کے جس مفلوک الحال زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں لڑکیوں کا تنہا گھر سے باہر نکلنا بہت محبوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب دیپالی اکیلی ریڈیو اسٹیشن آتی تھی یا کبھی کبھار کھوکھو اس کے ساتھ آ جاتا تھا۔ وہ عباس الدین احمد کی شاگردی میں مشرقی بنگال اور بالخصوص میمن سنگھ کی لوک سنگیت کی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نغمہ پر پروگرام بھی مقبول ہو چکے تھے۔

۱۹ دسمبر کی شام، وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ برابر کے ایک دروازے پر ڈاکٹر سرکار کے پرانے دوست اور شائقِ نمکیتوں کے پروفیسر، ماہرِ لسانیات سید مرتضیٰ حسین اس سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر اور چھڑی اٹھا کے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بابا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں کا کا!“ وہ تیزی سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن سید مرتضیٰ حسین اس کے پیچھے لپکے۔

”اور سنو لڑکی، تم نے ہمارے ہاں آنے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟“ سید مرتضیٰ حسین نے چھڑی ہوا میں لہرائی۔ دیپالی نے بغیر یقینی انداز میں سر ہلا دیا۔ اور گیلری کے سرے پر آدیں اٹھا کر پر نظر ڈالی تینا کے سات بج رہے تھے۔ اب وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف ایک تار اور البسراج اٹھائے فن کاروں اور ریڈیو کے اراکین کی آمد و رفت جا رہی تھی۔

پروفیسر سید مرتضیٰ حسین جو ہندوستان اور یورپ کی قدیم و جدید بینیں ہمیشہ زبانوں کے ماہر تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔ ”یہ تو فون کی طرح سرکویں ہلا رہی ہو؟“ انھوں نے درستی سے مطالعہ کیا۔

اندر عباس الدین احمد نے کانا شروع کر دیا تھا اور ان کی خوبصورت جان لیوا آواز پدما کی لہروں کی طرح سارے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ پدما کے ہانگی کا گیت۔ جو ابھٹا کانا نغمہ۔ عباس الدین احمد کی اس سنگیت۔ بھٹی آتی۔

دیپالی نے برآمدے کے ایک در سے ٹپک کر پل کی پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

”تم خوش قسمت ہو دیپالی کہ تم کو عباس الدین احمد کی شاگردی میسر ہے۔ زندگی کا یہ لمحہ غنیمت جانو۔“

دور پردہ کی تاریک چڑسکون لہروں پر سے بہتی سید مرتضیٰ حسین کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ یہ میرا دیس، یہ بدلتا آواز دیکھتا اور ہم بہتیر۔ یہ سنگیت۔ یہ حیران کلام۔ یہ سب اسی طرح رہے گا۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاریک راتوں میں اہم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین کو جس شاید پوری طرح معلوم ہیں کہ ہم کیا کرتے والے ہیں! وہ خود اور ہم سب کہاں ہیں۔ اس کی ہمت دوبارہ عود کر آئی اور اس نے ذرا ابتلاشت سے کہا۔ ”کا کا اب قرع میں ڈانٹے تو۔ یا۔“ ”کیا بات ہے۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو۔“ پروفیسر نے دریافت کیا۔ اور اسے بڑے غور سے دیکھا۔ ”کبھی ایسا موقع زندگیاں دے دینا کہ بعد میں پچھتاؤ کہ تم نے اپنے خواب کیوں نہ پورے ہونے دیئے۔“ انہوں نے باہر نظر ڈالی۔ ”وہ دیکھو تم کو کوئی بلانا ہے شاید۔ جاؤ۔ بھاگو۔“ اتنا کہہ کر وہ چھپا ک سے برابر کے کمرے میں گھس گئے۔

دیپالی سرعت سے برساتی میں اُتری۔ بیجا مبر نوجوان نیم تاریک لان پر مزے سے ٹھیل رہا تھا اُسے دیکھ کر وہ سرٹک پر آگیا۔ وہ دونوں عمارت کے پھاٹک سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچے۔ نوجوان نے کرنے کی جیب سے ایک لمبا، موٹا لافہ نکال کر اُسے تھما دیا۔ ”ریحان دوا۔ ریحان دوائے کہا ہے یہ خط دیپالی سرکار کے ذریعے ہماری آوارائے کو پہنچا دیا جائے۔ جلد از جلد۔“

”آوارائے۔“ ”دیپالی نے چیپکے سے پوچھا۔ ”لیکن میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔“

”جان جاؤ گی۔“ نوجوان نے غنغر سا جواب دیا۔ وہ سڑک پر کچھ دور نکل آئے۔

”آوا دیدی، پیار بڑی ہیں۔ ان کے ٹوی آئی جی ماموں اُن کے یہاں مقیم ہیں۔ اس وجہ سے دوپٹہ پر بولس کا بیہرہ ہے۔ آوا دیدی کے بیڑہ روم تک دیپالی صرف تمہاری رسائی ہو سکتی ہے۔“ نوجوان نے پھر بات متروک کی۔ ”چلو تم کو سریندر داسے ملو اؤں۔ میری جگہ یہ اب تم سب سے رابطہ رکھیں گے میں با رہیسا ل جا رہا ہوں۔“

وہ دونوں تنگ اور نیم تاریک سڑک پر ذرا اور آگے بڑھے۔ ایک دیوار کے سائے میں ایک نوجوان اُن کا منتظر تھا۔ ”ہلو دیپالی۔ ا۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”سریندر دوا۔ ا۔“ دیپالی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”آپ کھلے خزانے گھوم رہے ہیں

کیا سافٹی مانگ لی۔“ اُس نے غصے سے پوچھا۔

نوجوان ہنس پڑا۔ ”تم نے دیپاتی میرے متعلق غلط افواہ سنی تھیں میں ابھی بلیک لسٹ پر نہیں ہوں۔ ہم وہی کلاسیکل ریولوشنریز (REVOLUTIONARIES) کے زمانے کی بات کرتی ہو! اب تکنیک بدل چکی ہے۔“

”میکے کا کلاسیکل ریولوشنری تھے۔“ دیپاتی نے اُداسی سے کہا۔
 وہ تینوں سر جھکائے تیز تیز چلتے گھوڑا گاڑی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔
 ”وہ ساڑیاں تمہاری۔ بک کیٹس۔ پورے ساڑھے پانچ سو میں۔“ سر تیدر مگر جی نے سیکریٹ سلگانے کے بعد دیاسلائی جھٹک کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔
 ”اچھا۔“ دیپاتی کا دل ڈوب گیا۔

”ہاں۔“ سر تیدر مگر جی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”جن صاحب کے پاس ہم یہ ساڑیاں لے کر گئے وہ تو ان کو دیکھ کر بالکل اچھل پڑے۔ کہنے لگے بھائی یہ تو میوزیم بیسی ہیں۔ فوراً ملکیت میوزیم کے لئے خریدو انا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ۔“ سر تیدر مگر جی نے سیکریٹ کی راکھ جھٹک کر بات جاری رکھی۔ ”مزے کی بات یہ کہ قیمت۔ جانتی ہو۔ کس نے ادا کی۔؟ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے۔“

”مسٹر کینٹ ویل نے۔؟“

”مسٹر کینٹ ویل آئی۔ سی۔ ایس نے۔؟“ سر تیدر نے جواب دیا۔
 ”او۔ ماں۔!“ خاندانی باد گاروں کے کہنے کا وقتی غم بھول کر دیپاتی کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”روپیہ ریحان دا کو وقت پر پہنچ گیا۔ کام شروع ہو چکا ہے۔“ سر تیدر مگر جی نے بات ختم کی۔
 وہ پانچ گاڑیوں کے اڈے پر چوراپے کے مدھم لمپ کے نیچے بیٹھ چکے تھے۔ سر تیدر مگر جی ایک تخت چھلاوے کی مانند رات کے کمرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیپاتی سرکار جو اس کی طرح چھلاؤں کی عادی ہو چکی تھی۔ سکون سے ایک گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوئی پیچھے نوجوان مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مسلمان کو جوان نے نیچے و نزار گھوڑے پر چابک ہارایا۔ گاڑی جرتے جرتے کئی سڑک کے گڑھوں پر سے گزرتی دیپاتی کے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

کھاری آومارائے

دور ڈاب کے سبک پیڑوں کی لائقنا ہی قطار سے مزین نارنجی افق پر سید سرخ سورج بہت آہستہ آہستہ اس طرح ڈوب رہا تھا۔ گویا شاہ باغ کی سستان، سایہ دار سڑک پر سے گزرتی بند گاڑی میں بیٹھی دیپاتی سرکار کے مسرور چہرے کا ابھی طرح نظارہ کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ شاید ایسا بے فکر چہرہ اسے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

سال، شیشم اور نیم کے پتے رمتا کی چوڑی سڑکوں پر نرم روی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ فضائیں خنکی لگی تھی پکڑ پکڑیوں پر ٹکریاں دوڑ رہی تھیں۔ پھاٹکوں کی سفید بلیوں پر بیٹھے اکاؤنٹ ملازم بیڑیاں پینے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں پر مدھم مدھم لمپ جھللا اٹھیں گے۔ مکاں، گھاس اور درختوں اور ہواؤں اور چاندنی رات کی سمفنی سنتے سنتے آرام سے سو جائیں گے۔ گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کی کنکریاں سطح پر بڑا پرسکون سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ عبد القادر کو چوان سر جھکائے نہ جانے ان بہت ساری دنیاؤں میں سے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اُس کی دنیا کون سی تھی؟ (ایک بانٹا کاجو نیڑا یا شہر کی غلیظ گلی میں ایک تنگ و تاریک مکان، یا ایک شکستہ شاگرد پتھر۔ دس آدمیوں کا کتبہ اور مسلسل فکرِ محاش اور مسلسل غم زلیبت) عبد القادر کو چوان جو محکمہ مردم شماری کے لئے ایک عدد اور اہل سیاست کے لئے ایک ووٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن دیکھے طوفانوں میں گھرا دیپاتی سرکار کو ووٹ لینڈز لئے جا رہا تھا۔

موڈ پرینچ کر چھیلیوں والی بند گاڑی دوسری سڑک پر اس طرح نمودار ہوئی جیسے کہانی کا نیاباب کھٹنا ہو۔ (دیاروں طرف زندگی کی کہانیوں کے باب کھلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور کردار صفحات میں سے نکل کر قبروں میں جا بیٹھے ہیں جتاؤں میں پھونک دیئے جاتے ہیں۔ نیا صغیر بلٹ کر قاری آگے بڑھتا ہے)

سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنے اُجاڑے رخسار کا تصور کیا جس کے خالی مطب میں بابا اُن مریضوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھ رہوں گے، جو کبھی کبھار اس طرف اُٹھتے تھے۔ دُھاکہ شہر کے ہزاروں ہلاکوں نیم تاریک مجلسِ مکان اور جھونپڑے، جن میں لالٹین اور مٹی کے دیئے ٹٹمار رہے تھے۔ دورِ غمار گاؤں میں اس کا آبائی مکان جو تقریباً دُھسے چکا تھا۔ ایسا افلاس، ایسی ویرانی اس ملک پر اس ہندوستان پر طاری ہے۔

گردہ دفعتاً ایک نئے جوش اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انقلاب آنے والا ہے۔ اس انقلاب کے لانے والے ہم خود ہیں اور ہم کامران ہوں گے۔ اس انقلاب ہی کی عظمت ہے جس کی وجہ سے ووڈ لینڈز کے مالک کی بیٹی دھارے میں شامل ہو چکی ہے۔ جو اہر لال نہر دبی تو اُسند بھون میں پروان چڑھے تھے۔

میرے تے باہر اگر پہلی بار اس سے بات کی۔ ”مس صاحب پبلنگ میں نہیں اب اندر جائیے“
”کس طرف۔؟“ اس نے دریافت کیا۔

”مس صاحب مارٹنگ روم میں ہیں۔ ادھر۔“
دیپا کی کی سمجھ میں نہ آیا۔ شام کے وقت اگر مارٹنگ روم میں ہیں تو اسے ایوننگ روم کیوں نہ کہنا چاہئے خیر ہر حال۔

میرے نے بھاری عتابی پردہ اٹھایا۔ وہ اندر گئی۔ پردہ اس کے پیچھے برابر ہو گیا۔ اب وہ اس بڑے کمرے میں کھڑی تھی، جس کے فرانسیسی دریچے کے نزدیک ایک کوچ پر کماری اُتار آ شال اوڑھے آنکھیں بند کئے کشنوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔

اُسے تو یہ ہیں اُمادیدی۔ اُسے ذرا سی مایوسی ہوئی۔ مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو گھمایا۔ یہ میری بو ذرا روایت ہے۔ میں کسی ناول کی ہیروئن کی متوقع کیوں تھی۔ اُمادیدی ایک فالتو، رومانی ہیروئن کی بجائے نئے ہندوستان کی نئی عورت ہیں۔ یہیں اپنے نیتاؤں کو خواہ مخواہ کلیمراٹرز نہیں کرنا چاہیے۔

آہٹ سن کر اُمادیدی نے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔
بڑے بڑے دریچوں والے کمرے میں شفق کی سہانی روشنی پھیل گئی تھی۔ کمرہ ایسا لگتا تھا،

اب دیپالی نے کھڑکی کی جھلی چڑھا کر باہر جھانکا۔ اسی راستے پر آگے جا کر ارجبند منزل تھی جس میں چٹان اُڑ رہی تھی۔ چٹان اُڑا سیکم، جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر لے آباد کیا تھا۔ اسی راستے پر، اونچے اونچے معزور درختوں کے پیچھے ڈی ایم کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ڈیم کینٹ ویل اس داستان کا ایک اہم کردار تھا جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر اجاڑا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر ”ووڈ لینڈز“ تھا۔ نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فائنل کے تعاون سے اپنے لٹے کیسے کیسے ”ووڈ لینڈز“ تعمیر کئے تھے۔

دیپالی شادان و فرحان بھی کہ ایک نئے ڈرامے میں حصہ لے رہی تھی جس کے لیکھک ارجبند منزل اور ڈی ایمز ہاؤس اور ووڈ لینڈز کی بنیادیں ہلانے والے تھے۔ دیپالی کی آدرش وادی زندگی اس وقت بڑی مکمل تھی جس زندگی میں نہریان، سمجھ دار، دردمند رفیق اور ساقی موجود تھے۔ سب مل کر خطروں کا جیلنج قبول کر رہے تھے۔ آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ ادا دہی سے ملنے کی خوشی میں دہات بھر سو نہیں سکی تھی۔ ان دیکھ ریکان دانے ایک اہم پیغام رسانی اُس کے سپرد کی تھی۔ ریکان داجیسے بڑے تیتا سے اب گویا اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر چکے تھے۔ خوشی کے مارے اس کا بس نہ چلا کہ پر لگا کر اوٹارائے کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن ووڈ لینڈز کے پھاٹک پر کانسٹیبل کھڑا دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ بیگ مغبوطی سے تھام کر وہ جلدی سے نیچے اتری اور کانسٹیبل سے کہا کہ اوٹارائے کی پرانی شاگرد ہے۔ کانسٹیبل نے پُروائی سے سر ہلایا۔ غالباً دیپالی کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالقادر کو کوکرایہ ادا کرنے کے مدد وہ چند لمحوں کے لئے پھاٹک پر ٹھٹھکی اور گاڑی کو واپس جانے دیکھتی رہی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس اجنبی جگہ پر غیر محفوظ اور تنہا رہ گئی ہے۔ عبدالقادر کو چوان، حکام ادا دہی کی اس بانی دنیا میں اسے اکیلا چھوڑ کر سر جھکائے جھٹ پٹے کی نیم ناریکی میں ٹخ ٹخ کرتا دور چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹک کر باغ کی سرخ سڑک پر آئی تو سامنے گھاس پر پولس کا وردی پوش اعلیٰ افسر دہند و ستانی پر ایک اور چھ پوش اعلیٰ افسر (انگریز) باتوں میں مہتمک گھاس پر ٹپٹے نظر آئے۔ تین تیز چلتی برساتی میں نچی تو میریز اس پر بھونکا۔ اس نے سر اسیکلی سے ”ادمان“ کا ہلکا سا تودہ لگایا تو ایک عالی شان بڑا ہی اس کی سمت بڑھا۔ اس نے لیے الفاظ دہرائے: اوٹا دیہی کی پرانی شاگرد دیپالی سرکار ملے۔

وٹھا کہ کا پرانا مغل نام

کے لئے آئی ہے۔

چیرا اسکا اندر گیا۔ اور چند منٹ بعد سفید چپکن اور سبز مٹی والا بیرو باہر آیا اور منہ سے کچھ بولے بغیر سر کی جنبش سے اس نے دیپا کی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ذرا جھکتے ہوئے طویل گیلری میں داخل ہوئی جس کی دیواروں پر دو رو بہ بارہ سنگھوں کے سر اسی کا پتہ کی آنکھوں سے ہر آنے جانے والے کو گھور رہے تھے۔ سیاہ اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سے گزرتے ہوئے دیپا کی کو یاد آیا۔ پیرسٹر آٹے کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے موکل اشرافیوں سے بھری قبیلیاں لالاکران کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور ان کی سیوی سزا اچھا رائے اپنی سینڈلز میں میرے جڑواں ہیں۔ دیپا کی سوچنے لگی۔ اتنی دولت مند اور مادیی تحریک کی مالی مدد کو نہیں کرتیں۔ جب عزت پڑتا ہے تو ہم جیسے زیب کارکنوں کو اپنے گھر میں سیندھ لگانا پڑتی ہے۔ اکتے ڈائوشن کرتے ہیں۔ سینڈرز مزدور ہے۔ محمود الحق پریس میں پر روت ریڈ ہے اور دن رات اپنی کمزور آنکھیں بھڑکتے ہیں۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لاکر تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور رائے ایک محل میں رانیوں کی طرح رہتی ہیں اور ریکان داکسی پراسرار دیوتا کی طرح کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور "ادب" سے ریکان داکسی طرف سے جو حکم ملتا ہے ہم سب اسے بجالانے کے لئے مستعد ہیں۔

اب وہ بیرے کے پیچھے پیچھے ایک ہال میں داخل ہوئی۔ جس کے وسط میں سنگ مرمر کی گول بیڑ پر کسی یونانی دیوی کا مرمیں مجسمہ اسنادہ تھا۔ فرش پر شیر کی کھالیں اور بنار کے قالین بچھے تھے۔ دیواروں کے برابر برابر لمبے تنقیم صونے رکھے ہوئے تھے۔ دیپا کی نے ایسی شان و شوکت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آئینہ منزل میں بھی نہیں۔ آئینہ منزل بھی بڑی عالیشان کوکھی تھی۔ مگر وہاں کی ہر چیز بوسیدہ اور مضمحل سی معلوم ہوتی تھی۔ اور مادی سے ملاقات کی خوشی نے اسے راتے میں جس قدر مضطرب کیا تھا اس پر کیف اور حلاکتانے ماحول کو دیکھ کر وہ یک لخت اتنی ہی دل گرفتہ ہو گئی۔

کریم خان بیرے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے (بیرا ملا تائیوں کی اوقات پہچان کر بات کرتا تھا۔ اور ہاتھ کو اشاروں ہی پر بڑھاتا تھا) وہ ایک دروازے کا عنبانی پر وہاں ٹھہر اندر چلا گیا۔ دیپا کی ایک کرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔ اور ہال کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی۔ انسانوں کی زندگیوں میں اتنا شدید تضاد بھی ممکن ہے۔ اسے عبد القادر کو چوان کا شکستہ قبر ایسا مکان یاد آیا، جو چند رکن کے کھنڈر ایسے شان گرد پینے میں ٹاٹ اور مٹین کے ٹکڑوں اور باشا کی بوسیدہ چٹائیوں کی مدد

جیسے باہر باغ میں شامل ہو گیا ہے۔ برشتے ساکت اور متحیر اور منتظر تھی۔

”نوشکار۔ اوما دیدی۔“

”نوشکار۔ آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو۔“

دیپاتی کوچ کے مقابل ایک کرسی پر ٹپک گئی۔

تب اومارائے نے نپائی پر سے اٹھا کر عینک لگاٹی اور نووارد اجنبی لڑکی کو تنکھی، گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اوما دیدی؟“

”کیا نام بتایا تھا تم نے۔ دیپاتی سرکار۔؟“

”جی۔“

”تم۔ اسکول میں کون سی کلاس میں تھیں؟“ اومارائے نے عینک اُتار کر ساری کے پتوں

سے صاف کرنے کے بعد دوبارہ تاک پر جمائی۔ ”سوری۔ میں تم کو پہچان نہیں سکی۔“

”جی۔ میں۔ اوما دیدی۔ مجھے سرنیدر دانے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سرنیدر مگر جی نے“

اُس نے اپنے میگ پر ہاتھ رکھ کر کڑبی آواز میں کہا۔

”اوہ۔“ اوما دیدی چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کیو پڑ اور سائیکس کے سروں پر پھیلے سبز

جھاردار شبنم والا بڑا الیمپ روشن کیا۔ شفق کا اُجا لائیز برقی روشنی میں ڈوب گیا۔ اب باغ میں پرندے

سیرالینے کے لئے چھپتا رہے تھے۔

”بڑی سردی ہے۔“ اوما دیدی نے شمال لپیٹے ہوئے کہا۔ ”یہ کھڑکی بند کر دو۔“

دیپاتی نے اٹھ کر فرانسسی دریچے کے سلسلے وار پٹ بند کر دیئے اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ

گئی۔ اوما دیدی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔

”تم کون ہو۔“

”دیپاتی سرکار۔“

”صرف نام دہرانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس نام کے میرے لئے ابھی تک کوئی معنی نہیں

ہیں۔ تفصیل سے بتاؤ۔“ اومارائے نے جھنجھلا کر کہا اور انگلیوں سے کپٹیاں دبائیں۔ دیپاتی جو کانٹ

میں اودمانے کی سخت گیری کی حکایتیں سن چکی تھی۔ اس انداز گفتگو سے زیادہ نہیں گھرائی اور اطمینان سے دوبارہ مزاج پُرسی شروع کی۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے اودماندیدی؟“

وہ خاموش رہیں۔ پھر کہا۔ ”کوئی پیغام لائی ہو۔؟“

”جی۔ سرسید ردایر اکوٹھیکٹ ہیں۔ میں کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میرے بابا بڑے چند سرکار پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔“ اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

”کیا پیغام ہے۔؟“ اودمانے نے پوچھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”ریحان دانے آپ کو خط بھیجا ہے۔“

”ریحان۔“ وہ اب چونک کر پھر سیدھی ہو بیٹھیں۔ ”ریحان کا خط ہے تو اتنی دیر سے فغول

باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ لاؤ۔“

دیسپائی نے بڑے اطمینان سے بیگ کھولا۔

عین اسی وقت عثمائی پردے کو جنبشی ہوئی۔ سفید ساری میں ملبوس ایک باوقار معمر خانہ نے

اندراجھانکا۔ اور آواز دی۔ ”ہاؤ آریو اودمانے۔“

”آئی۔ ایم فائن۔“ اودمانے خاموشی سے جواب دیا۔ ”میری ایک پرانی شاگرد آئی ہوئی

ہے ذرا چائے بھجوا دیجئے۔“

”اچھا۔“ لیکن واپس جانے کے بجائے مسز آئے اندراجھانکس۔ ”دیسپائی نے تعظیماً کھڑے ہو کر ان

کو فکس کیا۔“

”جیتی رہو۔“ دیسپائی پر سرسری سی نظر ڈال کر انہوں نے اودمانے کو نظر مندی سے دیکھا۔ ”روا پی

لی۔؟ ڈاکٹر چڑچڑا رہے تھے، جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی۔“

”کمبختی بابر کموں گی ماں۔“ اودمانے چہرہ مسز آئے کی بات کاٹی۔ ”مجھے کوئی مرض و مرض نہیں۔“

خالی سفر کی تکان پر۔ آپ سب جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

مسز آئے نے اس تلخ لہجے کی پرواہ کئے بغیر پھر کہا۔ ”ہم لوگ کلب جا رہے ہیں۔ وقت پرکھانا

کھا لینا۔“ اودمانے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسز آئے چند سیکنڈ تک اسی طرح کھڑی رہیں اور پھر کمرے سے باہر چلا گئیں۔

”اوہ۔۔ والہین۔!“ اوتا نے پہلی بار مسکرا کر دیپالی کو دیکھا۔ ”تمہارے والدین بھی اتنے

صبر آزمایں۔؟“

دیپالی اوتا دیہی کے مزاج کی اس تبدیلی سے خوش ہوئی اور سنس پڑی۔

”اچھا۔ اٹھو اور دروازہ بند کر کے اندر سے جھنجھٹ لگا دو۔“

”لیکن ابھی تو اوتا دی آپ نے جائے منگوائی ہے۔“

”ارے ہاں۔ بہت سمجھ دلہنچی ہو واقعی!“

”ہجی۔ اوتا دی، میں اس اپریل میں انیس برس کی ہو جاؤں گی۔“

”صرف انیس برس!“

”ذرا میری بستی ماں سے بڑھ چھٹے۔ اُن کو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میری سیاہ کی عمر سی مکمل لگی۔!“

دیپالی اپنی رد میں کہنے لگی۔ اوتا دفعتاً پھر تیوری پر بل ڈال کر سنجیدہ ہو گئیں اور مہرمت سے نفاذ چاک کیا۔

سائے کی طرح بیرے نے اندر آکر چپاؤ کی کشتی میں پیر رکھی اور واپس چلا گیا۔ دیپالی نے چار

بنائی اور دروازہ اندر سے بند کیا۔ اوتا سیانی سے ایک گھونٹ بھر کر طول طویل خط پڑھنے میں مگن ہو گئیں۔

اپنی پیالی ختم کر کے دیپالی کرسی سے اٹھی اور ٹبل ٹبل کر دیواروں پر لگی تصویریں دیکھنے لگی۔ لارڈ

بائرن، جی کے عقب میں طوفانی سمندر تھا۔ اور طراح ان کی کشتی کنا لے سے باندھ رہا تھا اور وہ فاحش تلو

اپنی مخدور اور توانا مسکراہٹ کے ساتھ گویا اپنے قدموں پر چھکی ہوئی دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔

وینس اور ایڈونس۔ مسٹر پک وک۔ اور سیاہ پوشاک میں ملبوس ایک لرزہ خیز عورت، جو ایک

باریش مرد کا بریدہ سر ہاتھوں میں لئے چچنیں مار رہی تھی۔ یہ بڑی ہیپانک تصویر تھی۔

دیپالی چند لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتے نہ سنے کے بعد ذرا خوفزدہ سی ہو کر اپنی کرسی پر واپس

آ بیٹھی۔ اوتا دیہی خط ختم کر کے گہری نگر اور پریشانی میں مبتلا آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا اٹھ گیا

تھا اور دریچے کے نزدیک الماس کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ دودھ سے سیر کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اوتا

دیہی نے آنکھیں کھولیں اور دیپالی کو بڑی سوختی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے اوتا دی۔؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”کون سی؟“

”یہ والی۔“ اُس نے اشارہ کیا۔

”ہتیس جانتیں؟ انٹر میڈیٹ میں انگریزی پڑھتی ہو یا گھاس کھودتی ہو؟“

اس ڈانٹ سے واقعی وہ سہم گئی۔

”یہ آسکر وائلڈ کی سٹوری ہے۔“ اومادی نے تڑشی سے کہا۔

”یہ کہ کیا رہی ہے اومادی؟“

”تم مجھے بہت بے وقوف معلوم ہوتی ہو۔“ اومادی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”با بیوقوف ہو یا بن رہی ہو؟“

اتر آنے والی جیسٹی ہو گیاں بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے دل میں اضافہ کیا اور کہا ”کیا تم کو نظر

میں آیا کہ یہ کیا کر رہی ہے؟“

”مگر اس کی کہانی کیا تھی اومادی۔“

”مجھے یاد نہیں۔ مجھے مذہبی اساطیر سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تم مجھ سے ٹیکسٹ بک تصاویر پر گفتگو کرنے آئی ہو یا کچھ کام کرتا ہے؟“

”جی اومادی!“ دیپالی پھر ہنس دی۔

یہ لڑکی خوبصورت ہے اور بیوقوف ہے۔ اس نے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اومادی نے

لکچر جوہر کر کے مسٹی میں بھینچا۔ مگر حصول مقصد کے لئے رُسک لینے ناگزیر ہیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس

اور رنڈ ویسٹ پر جا بیٹھیں۔

”ادھر آؤ۔ اور غور سے جو کچھ میں کہنے والی ہوں سنو۔“ انہوں نے درستی سے کہا۔

یکایک دیپالی کو اسی کیفیت نے اُن دلچا، جو اس پر ہال میں طاری ہوئی تھی۔ یہ میری مستانی

ہی نہیں رہیں۔ غریبیت بڑی اہمیتیں۔ مگر مجھ پر اس طرح حکم کیوں چلا رہی ہیں۔؟ اسی لئے کہ

ن ترادی ہیں؟ اُس نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ اومادی، مگر پہلے میں آپ سے ایک بات

پہنچا چاہتی ہوں۔“

”کہو۔“

”آپ اتنی بے تمنا دولتمند ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں؟“

بیوقوف ہے۔ اسی لئے نڈر اور منہ پھٹ بھی ہے۔ اومانے دل میں سوچا پھر ایک گہرے سانس لے کر اُسے جواب دیا۔ ”دیپاتی یہاں آن کر مچھو۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔“ ابھی تک میرے جی پس منظر کو معاف نہیں کر سکے۔ انہوں نے دل میں کہا (کتباے سوال کا سید سا جواب دیپاتی یہ ہے کہ میں تین برس سے لندن میں تھی اور چند روز قبل ڈھاکے واپس پہنچو ہوں۔ اور آئے ہی میار پڑ گئی۔ ساتھیوں سے میرا پہلا رابطہ اس وقت تمہارے ذریعے قائم ہوا ہے اور ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں۔ چنانچہ غور سے سنو۔“

”اوہ۔“ دیپاتی نے بے حد نادام ہو کر کہا۔ ”آئی ایم سوری اومانے دیدی۔“ وہ شرم سے پانی پانی ہوتی دھڑ دھڑ سیٹ پر جا بیٹھی۔

”اب میں چند سوال تم سے کرتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ ایک بڑی خطرناک مہم ہمارے سامنے ہے جس میں برسوں کی جیل کے علاوہ جانیں بھی جاسکتی ہیں۔“ پھر وہ چند لمحوں کی چُپ ہو کر شنائی پر انگلیاں پھیرتی رہیں۔

”بتائیے اومانادی۔“

”بہت جلد اس علاقے میں کیونستوں کی عام گرفتاری شروع ہونے والی ہے۔ گرفتاریوں کے متعلق اور دوسرے خفیہ احکام کی خبر لگانے کے لئے ریحان الدین احمد نے لکھا ہے کہ۔ کہ دیپاتی ہر کام کی مدد لی جائے۔“

”میری۔ میری مدد۔؟“ دیپاتی ہکا بکا رہ گئی۔ ”مگر ریحان داتو مجھے جانتے بھی نہیں شاید میرے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے وہ۔ اور۔ میں کیا کر سکتی ہوں بھلا۔ اومان۔“

”تم یہ سارا کام کس طرح کرو گی۔ اس کی تفصیل ریحان نے مجھے کچھ بھیجی ہے۔“ اومانے لٹائے پڑا رکھ دیا۔ ”پہلے بتاؤ انگریزی بولنی آتی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”انگریزی جب آپ میں تیز تیز لو لیں تو سمجھ لو گی۔؟“

”جی ہاں میں جگہ اور مس ہسٹلے ہم کو انگریزی پڑھاتی ہیں۔ اس لئے عادت ہو گئی ہے۔“

”گڈ۔ بہت ہے۔؟“

”جی ہاں۔ کافی ہمت ہے۔“
 ”ابھی تم یہاں آئی تھیں تو تم کو کس کس نے دیکھا تھا۔ پیرے اور سیری والدہ کے علاوہ۔“
 ”ایک کانٹبل اور ایک چیراسی نے۔“
 ”میرے ماما کو پہچان سکتی ہو؟“

”شاید وہی بائیر ٹبل رہے تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ۔“
 ”ہاں۔ اسپیشل آرڈر کانٹبلری والا کرسٹوفر ہیگ بھی ان سے ملنے آیا ہوا ہے۔ بویہ خط
 نو۔ بہت غور سے پڑھنا۔“

دیپاتی نے ادا کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ ادا دیپاتی کے درپے سے بائیر دیکھنے
 ،۔ بدن پر جائیوں کی دھند چھا چکی تھی۔ دیپاتی نے خط دھڑوسیٹ پر رکھ دیا۔ اور چپکی بیٹھی رہی۔
 نے مگر اس پر نظر ڈالی۔

”مجھے خود تعجب ہے کہ ایک ناخبرہ کار اور کمسن لڑکی پر اتنی بڑی ذمہ داری ریمان نے کس طرح
 ادا کی۔ ریمان کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف
 بائیر کام باکسانی کر سکتی ہو۔“

”مگر ادا دی۔ ریمان دا مجھے بالکل نہیں جانتے۔ میں نے تو آج تک ان کی شکل کیا تصویر
 نہیں دیکھی۔“

”تم کو مجھ سے تھوٹ بولنے کی تلخ ضرورت نہیں ہے۔“
 ”ادا دی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ریمان دا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ادا پھر جھلا گئیں۔ ”تم مجھے سکھلاؤ گی کہ انڈر گراؤنڈ کا کام کس طرح کیا جائے۔ یہ ریمان
 طرح کی ہدایات کس کو دے؟ میں ریمان کو بہت قریب سے جانتی ہوں یہ بھی مت سوچ بیٹھنا
 ، کوئی دو مینٹک ہیر وہے۔ گو میں جانتی ہوں کہ سارے بنگال میں کالج کی لڑکیاں بہت دنوں سے
 پر زہر کھا رہی ہیں۔ خیر۔۔۔ تو یاد رکھو کہ وہ دو مینٹک نہیں ہے۔ بویہ پیکٹیکل اور انتہائی سمجھ دار
 ہے۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیل رہا ہے۔ دومرتبہ اس کے عزیز دوست اس کو خنید دھوکا دے چکے
 اس لئے وہ بے انتہا غمناک ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ سارے بنگال کی

فوجان لڑکیاں۔“ انھوں نے سپاٹ، مضبوط آواز میں دہرایا۔“ ریجان الدین احمد پر عافیت ہی ہو۔ مگر اس کو جانتی صرف میں ہوں۔ صرف میں اس کی رفیق اور دوست ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جانتا وہ دھاکرہ نیورسٹی میں مجھ سے جو نیر تھا مگر لندن میں بھی ہم دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ اکٹھے ہم نے وہاں کی ٹرک میں کام کیا ہے۔ وہ پورٹری کی حیثیت سے اسپین بھی گیا۔ مجھے یہی افسوس مرتے دم تک رہے گا کہ میں محاذ نہ جاسکی۔ خیر۔ تو اس نے کھلبلیے کہ تم سیدھی اور قابل اعتماد ہو۔ ریجان انسان کو خوب پسندتا ہے۔ نظر میں آدمی کو پسندتا ہے۔ امید ہے کہ اس نے تم کو پسندنے پر بھی غلطی نہ کی ہوگی۔“

”مگر وہ تو مجھ سے کبھی۔“ دیپالی نے کرنا شروع کیا اور پھر ڈر کر چپ ہو گئی۔

”وہ تم کو پسند سکتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ تمہارا اسے پسندنا قطعی ضروری نہیں۔“ اودادی نے بات ختم کر کے کئی رشتہ پر دے آبشاروں کی طرح سرسراہٹے لگے۔ دفعتاً دیپالی کو بڑا بے تکا خیال اس وقت آیا۔ اودادی کے پاس بھی بات چیر بولے دار ساریاں ہوں گی۔ ایک سے ایک نیا باب۔ خیر کیا کیا جھکا۔ ہے۔ اور میں ایک پر خطر ہم پر جا رہی ہوں۔

”مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ اودا کی آواز دور سے اس کے کان میں آئی۔

”کلاس کی بیک گراؤنڈ۔“

”ہاں۔“

”مڈل کلاس۔“

”اودادی نے خود سے سننا شروع کیا۔ گویا ہسپتال میں کیسی بڑی سڑی ہو رہی ہوں۔

”تم نے کیا سہہ بتائی تھی۔؟“

”انیس سال اور اب تک سکندریہ میں ہوں۔“ دیپالی نے تاسف سے کہا۔

”وجہ۔۔۔؟“

”میں بارہ سال کی تھی جب ماں مر گئیں۔ ان کو۔۔۔ کینسر ہو گیا تھا۔ بابا پٹنہ لے کر گئے۔

ہسپتال میں مر گئیں۔ میں سب سے بڑی تھی۔ تینوں بھائی چھوٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے میں اسکول چھوڑ دیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ کہے جاؤ۔“ اودادی کشتوں پر کہنیاں رکھ کر غور سے سنتی رہیں۔

”بابا ماں پر عاشق تھے۔ ان کے مرنے کے بعد بچہ کر رہ گئے۔“
 ”پو پو مرنے۔“

ایک نحت دیپاتی نے اوتا پر نظر ڈالی۔ اور اسے خیال آیا۔ بابا کی بقیہ عمر بھی اسی طرح تنہا اور
 اواس گزر جائے گی۔ کاش انہیں اوتا دی جیسی سمجھ دار اور دردمند عورت کی رفاقت میسر ہو سکتی
 پھر اس نے بے ساختہ بڑے فخر اور پیار سے کہا۔ ”میرے بابا بہت خوبصورت ہیں۔ دکھوں نے
 انھیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر اب بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور میرے کا کا
 — میرے کا کا تو بابا سے بھی زیادہ —“ پھر اس کی آواز روندھ گئی۔

”انتی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ دیپاتی سرکار۔“ اوتا رٹنے لگی۔
 ”تمہارے کا کا کو کیا ہوا۔؟“

”پھانسی۔“ دیپاتی نے مضبوطی سے جواب دیا۔
 ”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ اوتا دیپاتی نے آہستہ سے کہا۔
 ”کیا نام تھا تمہارے چچا کا۔؟“
 ”دنیش چندر سرکار۔“

”گڑ گڑ۔“ اوتا دیپاتی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ ”تم۔ تم دنیش چندر سرکار کی بھتیجی ہو؟“
 ”جی ہاں۔ وہ بابا کے اکوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ جب اس کے عین ماں ریڈیم ہسپتال میں تھیں
 تب کا کا کو دہشت پسندوں کے اس مشہور کمپن میں پکڑ لیا گیا۔ بابا نے۔ بابا نے پٹنے سے فقار کاڑ
 باکر ساری آبائی کھیت باڑی بیج کھونچ پٹنے کا ایک بڑا بیرسٹر کھڑا کیا (اسے یاد آیا بابا کہتے تھے کہ وہ شری پری تو ش
 محسوس رائے کو کھڑا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی فیس زیادہ تھی) مقدمہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ مگر بیرسٹر کا کا کو پکڑ لیا۔
 اور ان کو پھانسی ہو گئی۔ جس سال ماں مری ہیں، اس کے چھ مہینے بعد ہی کا کا کو پھانسی ہو گئی۔“
 ”تم کو یاد ہیں۔؟“

”خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ چھ سال پہلے ہی کی قربات ہے۔“ دیپاتی کی آنکھوں میں آنسو اٹھ اٹھے۔
 ”میرے کا کا کا ایک ٹیک کزن تھا۔ چند لمحوں بعد دیپاتی نے کہا۔“ اوتا دیپاتی بعض دفعہ صبح منہ اندھیرے میں
 آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب ابھی پوری طرح اجلا نہیں پھیلتا۔ اور پلنگ پر پڑے پڑے کھرکی سے باہر اندھیرے

آسان کو دیکھ کر سوچتی رہتی ہوں، بالکل ایسے ہی وقت میں، پوچھنے کے وقت میں، کا کا انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگاتے تھے پر بیڑا ہ گئے تھے۔ اور میں خوب روتی ہوں اور سوچتی ہوں کا کا اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کا خون رائیگاں نہ ہونے دوں گی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

سوئس کاٹچ کی شکل کا کلاک ٹیک کرتا رہا۔ اب رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ دیپائی نے وقت پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”کا کا کی شہادت کے بعد بابا کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کا بھڑانہ بنو تا تو وہ شاید سیاسی لے لینے۔ مگر وہ مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ کانگریس میں شامل تھے اور جیل بھی کاٹ چکے تھے، مگر لاڈ لے بھائی کی موت کے بعد سے ان کو ایک عجیب طرح کاری ایکشن ہو گیا۔“

”سیاست سے نفرت ہو گئی؟“

”تقریباً۔ اب وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے پھرتے ہیں۔ پریکٹس چلتی نہیں۔ بس اتنا کمالات ہے کہ گھر چل جائے۔“

”تم ابھی کھینٹی باڑی کی کیا بات کر رہی تھیں؟“

”غفار گاؤں کے نزدیک ہمارے یہاں مخلوں کی دی ہوئی زمینداری تھی۔ وہ بابا کے پڑپھوں نے ناچ گانے اور شراب پینے میں اڑادی۔ اس غصے میں کہ لودو لے بنیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔“

”نیوڈل ڈکیمینٹس جو انیسویں صدی کے برطانوی بوزروا نظام سے ٹکرا کر نکلا گیا۔“ اوما رائے نے سر ہلا کر کہا۔ دیپائی نے ذرا آنکھیں پھسلا کر اٹھیں دیکھا۔

”اب تمہارے کہنے میں کون کون باقی ہے؟“

”تھوڑے سے رشتہ دار ہیں، وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں۔ بابا کے ایک چچا زاد بھائی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ٹری ٹیڈاڈ ہجرت کر گئے۔ وہاں ہزاروں کمزور ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ ٹھاکرماں کا پچھلے سال انتقال ہو گیا میری ماں کا میکہ سراج کونج میں ہے۔ وہ بھی ملازمت پیشہ لوگ ہیں۔ اور کیا بتاؤں۔ ہاں۔ یہ ”چندر کونج“ ہماری کوٹھی کہنے کی خوشالی

کے زمانے میں ٹھا کر ڈانے بنوائی تھی۔ ٹھا کر ڈانے کی زندگی ہی میں بابا اور کا کا قومی تحریک میں شامل ہو کر جیل یا نرا کے لئے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا۔ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔

”ایسا مزدور ہو گا۔ دیپالی۔ ایسا مزدور ہو گا“ اومارائے نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بابو سی کا شکار کبھی نہ ہونا۔“

”میں بابو سی بالکل نہیں ہوں اومادی۔“ دیپالی نے دفعۃً ہنس کر کہا۔

”تم نے دوبارہ پڑھائی کیسے شروع کی؟“

”بابا کی ایک ہی سگی بہن ہیں۔ عمر میں ان سے بہت بڑی۔ چار سال ہوئے وہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر فرید پور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پتنی ماں ہمارے یہاں آ گئیں۔ ذوالا ولد ہیں۔ انہوں نے آن کر گھر سنبھال لیا تو میں نے ہائی اسکول پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ساتھ ہی عباس الدین احمد کے ہاں جا کر سنگیت بھی سیکھتی رہی۔ میں بابا کی مدد کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن بابا جانتے ہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیم میں میرا جی بالکل نہیں لگے گا، اس لئے انھوں نے سائنس نہیں لینے دیا۔ اب اس جولائی میں وہ مجھے شانتی نکیتن بھیج رہے ہیں۔ ان کے دوست پروفیسر مرتضیٰ حسین کا بھی سمت امرار ہے کہ میں شانتی نکیتن چلی جاؤں۔“ دیپالی نے پھر کلاک پر نظر ڈالی۔

”تحریک میں کس طرح شامل ہوئیں؟“ اومارائے کے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

”دیپالی پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔“

”پھر وہ اسکول گرل لیگز۔“ اومارائے نے غصے سے کہا۔

”دیپالی نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔“ اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اومادی۔ ایک روز۔ ایک روز شام کے وقت۔“

دفعۃً اومارائے نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے کا کا اگر زندہ رہ جاتے

تو ہندوستان کے بہت بڑے مورخ بنتے؟“

”جی ہاں۔ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کہتے ہیں ابھی میرے سمجھنے کے لئے وہ موضوع ہی بہت ٹھوس ہے۔۔۔ بنگال کی اقتصادی تاریخ“

”تم تحریک میں کس طرح شامل ہو گئیں؟“ ادا بی بی نے سوال دہرایا۔

”پچھلے سال میں ایک روز شام کو برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی اپنے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی، جورات کے کھانے سے ذرا قبل فٹ بال کھیل کر لوٹتے ہیں۔ بستی ماں رسوئی میں بھینس اور بابا طبیب بند کر کے ہانے کے برابر مثل خانے میں جا چکے تھے۔ اتنے میں برآمدے میں سے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مسلمان فقیر بھگد پر کھڑا ہے۔ ایک تارہ لئے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے جھن سے ایک تارہ پھیرا اور بڑی دلدوز آواز میں باؤل گانا شروع کر دیا۔ لہنتی ماں فقیروں اور سنیاسیوں کو بڑی عقیدت سے دیتی دلاتی رہتی ہیں، اس لئے میں نے اُسے آواز دی کہ کھچو اڑے آنکھ کی ڈیوڑھی پر چلا جائے۔ مگر میری بات سن کر وہ جھپاک سے برآمدے میں آگیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اس کی نظر اندر سیٹھک خانے میں لگی کاکا کی بڑی تصویر پر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے کہا کہ اسے اس تصویر کی مددوں سے تلاش تھی۔ اور میری گھبراہٹ اور احتجاج کی مطلق پروا کئے بغیر جھپٹ سے مکرے میں گھس گیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر بڑی محویت سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔ میں بڑبڑا کر اندر گئی تو اس نے پوچھا ”اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟“ اور پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے جھولے میں سے کچھ کاغذ نکالے اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

”تم کون ہو؟ دیش بابو کی لڑکی ہو؟“

”میں ان کی بھینسی ہوں، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔ نو کہنے لگا۔ ”اچھا اپنے بابا کو بلاؤ۔“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دم بہت ڈر گئی۔ اور پچھلے برآمدے میں جا کر بابا کو آواز دی۔ بابا جلدی آئے، ایک عیب سا فقیر آکر سیٹھک خانے میں بیٹھ گیا ہے۔ بلدی آئی ہے۔ بابا تو لیدکنڈ سے پرڈائے جلدی سے باہر نکلے اور مکرے میں گئے تو وہ فقیر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرنے لگا۔ بابا اسے دیکھتے رہے پھر اداسی سے مسکرا ڈئے۔ میں دروازے میں سے اندر جھانک رہی تھی۔ انہوں نے مجھے آواز دی کہ چائے بناؤں۔ میں چائے بنا کر لے گئی۔ اب وہ اور بابا پرانے دوستوں

کی طرح صوفے پر بیٹھے یا توں میں ہتھک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اپنا نام نور الرحمن میاں بتلایا۔ اور کہنے لگا کہ بارہ سال میں اس کا تکیہ ہے۔ جب میں اس کا مطلب نہ سمجھی تو ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ وہ ایک بنگالی دیہاتی کا ایڈیٹر ہے۔ اور کالہ کے متعلق ایک خاص منبر نکال رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہے۔ کالہ کے نجی حالات، ان کے پرانے مسودے حیل سے لکھے ہوئے خط۔ پرانی تصویریں، یہی سب۔ مجھے اس کی جھڑ جھنکار ڈاڑھی پر بڑی ہنسی آئی کہ ایڈیٹر لوگ تو بالوں فقروں کا حلیہ بنا کر ایک تارہ نہیں بناتے پھرتے۔

”پھر کیا ہوا۔“ اُٹمانے جواب بڑے غور سے یہ داستان سن رہی تھیں، سوال کیا۔

”تو بابا نے اس سے کہا کہ وہ ساری چیزیں بکسوں میں سے تلاش کر کے اس کے لئے نکال رکھیں گے اور اسے دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ اتنے میں میرے تینوں بھائی آگئے اور ایک عجیب سے جہان کو اندر بیٹھا دیکھ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگے۔ توفیق نے یعنی نور الرحمن میاں نے مجھ سے کہا کہ یہ دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور بچوں کو بھگانے کے لئے باہر گئی۔ اتنی دیر میں نور الرحمن میاں۔ یعنی باؤل فقیر بھی ایک تارہ یا نا باہر آکر جھپاک سے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ ہمارے بزرگ اور پھاٹک کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دو دن بعد وہ کاغذات اور تصویریں لینے کیلئے اسی وقت اندر بھر پڑے آیا۔ بابا کو کسی برہنہ کو دیکھنے کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں میرے حوالے کر گئے تھے۔ فقیر بھر بڑی بے تکلفی سے سیٹھک خانے میں آگیا۔ اور میں نے جلدی سے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ مجھے اس طرح دیکھتا رہا گویا بہت محظوظ ہو رہا ہو۔“ اتفاقاً سنا کر دیپا کی پھر کھلکھلا کر ہنسن پڑی۔

”اس قدر ہنسنی کیوں ہو؟“ اُٹمانے ناگواری سے کہا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ اس عمر میں بات بے بات ہنسی کے قوارے چھوٹتے ہیں۔

”سوری اُٹمانی۔“

”تم نے اتنے ذکھ اٹھائے ہیں پھر بھی اتنی مسرور اور ہنستا ہوا ہو۔“ اوما کر کے لہجے میں رشک کی تلخی کے علاوہ بڑی عجیب سی آرزو کی بھی جو دیپا نے محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی ہنشت پر نام نہاد نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔ اومانے سمجھتی سے پوچھا۔

”بس پھر میں نے بابا کا دیا ہوا بڑا فائل اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا کہ مجھے جو کچھ کا کا کے بارے میں یاد ہو اسے بتاؤں۔ میں نے کا کا کا ذکر کیا تو ایک دم رونے لگی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ خیر پھر اس نے جلدی جلدی نوٹ لئے۔ اور اپنے رسالے میں میری دل چسپی دیکھ کر اس نے کہا کہ اگلے مہینے سے پرانا پیش کے فلاں مکان میں ایک اسٹڈی سرکل قائم ہو رہا ہے میں اس میں ضرور جایا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک باؤل گیت سکھاؤ۔ کیونکہ میں نے عباس داسے بہت سے باؤل گیت سیکھے ہیں۔ مگر یہ والا باؤل جو وہ گا رہا تھا میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے کہا آج تو دیر ہو جائے گی۔ اگر میں اجازت دوں تو وہ کل شام کو اسی وقت آ سکتا ہے۔ میں بے حد خوش ہوئی۔“

”چنانچہ وہ تیسرے روز بھی آیا۔“ اقا دینی نے آنکھیں بند کر کے سپاٹ آواز میں کہا۔

”جی ہاں امدادی۔ اور میں نے حسب معمول جلدی جلدی دروازے بند کئے اور پردے گرا دیئے۔ مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی اس نے مجھ باؤل گیت سکھایا۔ اور مجھ سے بھی دو تین گانے سنے۔ اور کہنے لگا کہ وہ ریڈیو پر ہمیشہ جب موقع ملتا ہے تو میرے گانے ضرور سنتا ہے۔ بہت ہی سٹوڈنٹ فقیر تھا امدادی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ فقیر نہیں۔۔۔ نور الرحمن میاں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”بابا اتفاق سے اس روز بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے مریض کی حالت خطرناک ہو چکی تھی خیر جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ اچانک ایک دم اداس ہو گئے اور کہنے لگے۔ دیپالی۔۔۔ اپنے عزیز ارجان بھائی کا بلیدان دے چکا ہوں۔ اب تم تو اس خطرناک راستے پر نہیں چلو گی؟ میں نے دل میں کہا۔ ماں مجھے معاف کر دینا۔ میں بابا سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اور میں نے بڑی صفائی سے جواب دیا کہ میں اس راستے پر ہم گز نہیں چلوں گی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔“

”اس کے بعد نور الرحمن میاں ایک مرتبہ ادا آئے تھے۔ رات کے وقت۔ یہ بتانے کے لئے وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ انہوں نے جاتے جاتے مجھے ایک مرشدی گان لور ایک دریا پتی کائنیت بھی سکھا دیا۔ جو مستحلی میں ہے۔“

”دیدنی میں اگلے مہینے بابا کے ساتھ کلکتے جاؤں گی اپنے گانے ریکارڈ کرنے۔ وہاں وہ مرشدی

گن اور دیا پتہ کاکیت بھی ریکارڈ کرواؤں گی۔ آپ کو سناتی مگر اب بہت دیر ہو جائے گی۔
 او۔ ماں۔ دس بج گئے۔“

”بہت خوب۔“ اوما دیسی نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا۔
 ”مگر وہ رسالہ تو شائع ہوا نہیں اور نور الرحمن میاں بھی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں پرانا
 پلٹن اسٹڈی سرکل میں جانے لگی۔ وہاں نور الرحمن میاں کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں سے
 ملاقات ہوئی۔ میں بابا سے کہہ کر جاتی تھی کہ روڈ می کے گھر جا رہی ہوں اور میں اور روڈ می سیدھے پہنچے
 تھے پارٹی آفس۔ جب سے میں ہمدرد کی حیثیت سے تحریک میں ہوں اور تھوڑا بہت کام ہو کچھ سے بن پڑنا
 ہے۔ کرتی رہتی ہوں۔“

”پچھلے مہینے عمرنید دالے تشویشناک خبر دی کہ اس غیر فانی رسالے اور اس کے پریس پرچھاپہ مارکر
 پولس نے سارے اشاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ریکان دا ادران کے ساتھی راتوں رات اپنے خفیہ مستقر
 سے فرار ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انھیں فوری دو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ فوراً فراہم کیا
 گیا۔ اس میں پانچ سو کی کمی پڑی تھی۔ تو میں نے۔۔۔ میں نے اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی بالوچر بولٹ اور
 ساڑیاں بکوا دیں۔ اب ریکان دالے جانے کون سے گاؤں میں جا کر نیا پرنڈ پریس لگا لیا ہے اور کسانوں
 کی تنظیم کے لئے پرچے اور پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ اب جا کر وہ کا کا والا نمبر بھی شائع ہو جائے گا۔
 مکفیدی۔۔۔ مجھے تعجب تو یہ ہی ہے کہ ریکان دا امجھ سے آج تک نہیں ملے۔ انھوں نے آپ کو یہ کیسے کھا
 ہے کہ مجھ سے ابھی طرح واقف ہیں۔ اور اتنا ذمہ داری کا کام آج میرے اوپر ڈال دیا۔ کمال ہے۔
 اومانے بیدار اکتاہٹ کے ساتھ ونڈ و سیٹ پر نیم دراز ہو کر کروٹ بلی۔ اور چند لمحوں تک
 خاموش رہنے کے بعد سیزاری سے کہا۔

”دیپالی سرکار۔ تم ایک برس سے انڈر گراؤنڈ کے لئے کام کر رہی ہو اور تم کو یہ تک پتہ نہیں کہ
 انڈر گراؤنڈ کے بیزر طرح طرح کے بھیس بدلنے رہتے ہیں۔۔۔ وہ مسلمان بزرگ جنہوں نے تم سے
 خلوص بڑھایا۔“ اوما کی آواز پر ماب مغربیہ مکان غالب تھی۔۔۔ ”ریحان الدین احمد تھے۔“

”او۔ ماں۔۔۔“ دیپالی گم سم رہ گئی۔ چند لمحوں تک بالکل حواس باختہ رہنے کے بعد
 اس نے آہستہ سے کہا ”لیکن انہوں نے تو اپنا نام نور الرحمن بتلایا تھا۔“

”اکثر کلرڈ، موقع پڑنے پر باری باری ایک فرضی نور الرحمن میاں بنتے رہتے ہیں۔“

”ادماں — ”دیپالی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے لگا، جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ آما نے کروٹ بدلی۔ بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی اور خشکی سے انگریزی لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور دفعتاً کاروباری اور کرخت آواز میں پوچھا ”تم نے اپنی اس ہمارا سہیلی کا کیا نام بتایا جو تمہارے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئی ہے۔؟“

”روزی بزرگی۔“

”قابل اعتماد ہے؟“

”بہتر قابل اعتماد۔ ریحان دا — اس کے متعلق جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے یہ اسکیم بنا کر آپ کو بھیجی ہے۔“

”ہوں — اچھا آئیے کے سامنے جاؤ۔“

دیپالی نے تعمیل حکم کی۔

ادماں نے سر نیہوڑا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

”اب اپنے مین سنگھ کے دیہاتی لیجے میں بولو تو — میں شام کو تمہیں سب سمجھا چکی ہوں۔ ریحان نے لکھا ہے تم بہت بڑھیا ایکٹریس ہو۔ یہ ہم کامیابی سے سر کر لو گی۔“

وہ چپ رہی۔ کوئی تعجب نہیں کہ باؤل فقیر نے کسی اور بھیس میں جا کر اس کے کالج کے ڈرائے بھی دیکھ لئے ہوں۔ آئیے میں اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوا ہے۔

”کیا نام ہے —؟“ ادماں نے اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح ڈپٹ کر دریافت کیا۔

”جی — جی — ہم —؟ ہم کلثوم بی بی۔“

”کہاں سے آئی ہو۔؟“

”جی — مین سنگھ ضلع سے —“

”سر تعینات ہیں؟“

”جی نہیں۔ ہمارے خالو نواب صاحب بوگرہ کے خانا ماں ہیں۔ انہوں نے بھیجا ہے۔“

”شاباش۔! مگر نواب صاحب بوگرہ نہ کہہ دینا۔ آفت آجائے گی۔“ ادماں نے

دفعاً ہنس کر کہا۔

”سوری — کچھ اند سوچ لوں گی۔ آگے پوچھئے۔“

”بس جھجک ہے۔ ریجان — نے غلط نہیں کہا۔ ہاں۔ اور ہرقہ —؟“

”کل حاصل کروں گی۔۔۔ عبدالقادر کی بی بی سے۔“

”عبدالقادر کون ہے؟“

”گاڑی والا — ہمارا کوچاں نہیں۔ ہماری گاڑی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہوئی۔

بابا نے اسے ہمارا شاگرد پیشہ دے رکھا ہے۔ مجھے کہیں جانا ہو تو بڑے خیال سے لاتا لے جاتا ہے۔“

”جولی گڈ۔ فائن۔ اوہو۔ بہت رات ہو گئی۔ بابا سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟“

”بیابا دعویٰ اور جہاں آئے گھر سے میرے دیر سے لوٹنے پر کچھ نہیں کہتے۔ اور ہمیشہ وہاں کا کام

مجھے گھر پہنچاتا ہے۔ ڈھاکے میں میری ہی دعوے پر سہیلیاں ہیں۔ اُواد کی۔ میں ان کے علاوہ اور

کسی کے گھر نہیں جاتی۔“

”رائیٹ —“ اُودا نے برقی گھنٹی کا سوچ دیا۔ ”یہ بھی اچھا ہوا کہ یہاں سب لوگ اس

بقت کلب گئے ہوئے ہیں۔“ سیزر نے بند دروازے پر دستک دی۔ اُودا بی بی نے آگے بڑھ کر جھنجھی

کھولی اور جھک کر سیزر سے باتیں کرنے لگیں۔ ”بیرہ آیا۔“ ڈرائیور سے کہو۔ ٹہر دو۔ کون سی موٹر ہے؟“

”میم صاحب کی۔“

”اچھا۔ گویاں سے کہو برساتی میں لگا دے جلدی۔ ایک دم۔“ سٹوے کی تصویر پر بغیر رادیو

لودر سے ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر دیپالی، اُودا کے ساتھ مارننگ روم سے باہر نکلی۔ محل کے دروازے

پر پہنچ کر اُودا رائے نے کہا۔ ”موٹر اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوانا۔“ پھر انہوں نے دیپالی کی پیٹھ جھٹک

رکامیابی کی امید ظاہر کی اور سر جھکائے گیسٹری میں چلی گئیں۔

دیپالی برآمدے میں نکلی۔ اور برساتی میں اتر کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر ایک جھونک کے ساتھ طویل

رائٹو کا چکر کاٹ کر پھاٹک پر پہنچی۔ اب اس لمحے سے میں اپنی ہی ذمے داری کی معیت میں بالکل تنہا

ہوں۔ اس نے سوچا۔ موٹر تیزی سے رستائی چوڑی ہرسانا، شرک پر آئی۔ روشن دوڑ لینڈ راجا نک

ندھیرے میں ڈوب گیا۔

دیپالی نے آگے جھک کر ڈرائیور سے کہا: ”ڈرامشن کیا ڈنڈ کی طرف سے ہوتے چلی“

۶

ریورنڈ پال متھیو بنرجی

مشن کیا ڈنڈ کے ویسی گرجا گھر کے اندر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں تیز و دشتی ہو رہی تھی۔ بڑے دن میں صوف چار و ذرہ گئے تھے۔ کیا ڈنڈ میں سخت گہا لگی اور رونق تھی کرسمس دیک کے دوران میں ویسی مشینوں کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونے والی تھی جس میں شرکت کے لئے الہ آباد، میتا پور، لاگرہ، شاہجہانپور، لدھیانہ، انبالہ، لاہور اور دوسرے بڑے بڑے مشنری مراکز سے نمائندہ مبلغین ڈھاکے آن پہنچے تھے اور کیا ڈنڈ میں لگے خیوں میں پھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت گرجا گھر میں نمائندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کرسمس گیر رتی مشن میں جٹی تھیں۔ ڈھاکہ مشن کیا ڈنڈ کے انچارج ریورنڈ پال متھیو بنرجی نے اپنے دفتر میں بیٹھے دوات میں نیب ڈوڈو کرسمس کا وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ گرجا کے عقب میں ان کا مکان جو ”بلی کالج“ کہلاتا تھا۔ عبادوں کاغذی بوتلوں اور مصنوعی ستاروں سے سجایا جاسا تھا۔ مسز بنرجی کچن میں فرش پر بیٹھی کرسمس کیک اے کرسمس پڈنگ کے لئے خشک میوہ صاف کرنے میں مہمک تھیں۔ باہر باغ میں باشا کے سائبان کے نیچے کیا ڈنڈ کی عورتیں اور لڑکے بالے سب مل کر مٹا سا مہل تیار کرنے میں لگے تھے۔ ولادستو کے ٹیبلو کے لئے حضرت مریم، سینٹ جوزف، چرواہوں اور سیل گاڈیوں کی مٹی مٹی صورتیاں منواری جاری تھیں۔ ریڈ کا بوا یعنی یسوع مسیح بڑی احتیاط سے بھوسے کے نیچے سے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔ اچانک گرجا کے دل میں بدھیاد مشن کی ٹولی نے اونچی باویک آواز میں ایک پنجابی حمد شروع کر دی۔ رب حذو نہ بادشاہ ہے۔ — اوجلال دایادشاہ ہے۔ — خداوند — اپنی راہ اپنے بندے کو دکھا۔ آ۔ آ۔

پادری بنرجی نے اپنے دفتر میں وعظ لکھتے لکھتے قلم ایک طرف رکھ دیا اور عینک ہاتھ پر

چڑھا کر جیت کو دیکھنے لگے۔ لمارپوں میں مشن کے رجسٹرار موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی سیاہ صلیب آویزاں تھی۔ میز پر بھولوں سے بھرا لکڑی کا رکھا تھا۔ باہر سے کانوں اور ہار مونیم اذیتوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بڑا پرسکون اور سہانا وقت تھا۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ڈرنے والے، نیک دل پادری بنرجی نے آنکھیں بند کیں اور زندگی کی نعمتوں کے لئے خدا باپ کا شکر ادا کیا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا اور وعظ کے کاغذات ایک طرف رکھ کر مشنری کالفرنس میں پیش کرنے کے لئے رپورٹ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں پستہ لینے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی تھی بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا۔ اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ الگ ادھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان تو خیر لوں بھی شاذ و نادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہتیلی اور غولہ پسند قوم تھی۔

پچھلی صدی میں سیرام پور مشن نے کلکتہ میں بڑا عہد آفریں کام کیا تھا۔ وہ جغادری، دھن کے پکے عظیم مشنریوں کا دور تھا۔ بشپ ریجنالڈ مہمبر۔ ولیم شیس۔ کیری اور مارش یمن۔ ان لوگوں نے اس دیس کی کثرت خدمت کی۔ پریس کھولے۔ کتابیں چھاپیں۔ تعلیم پھیلائی۔

جواں مرگ بشپ مہمبر پادری بنرجی کا محبوب کردار تھا۔ وہ انگلستان سے آیا ہوا روحوں کا جیالا رکھوالا، جو اسی سنہرے جنگل کی دھرتی پر گھوما تھا۔ رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے پادری بنرجی کو دفعتاً خیال آیا کہ وہ کرسس کے وعظ میں بشپ مہمبر کی مختصر لیکن درخشندہ زندگی کی مثال پیش کریں۔ انھوں نے جنگل میں تحریر شدہ اپنے وعظ کے کاغذات اپنی طرف سرکا کر دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ”وہ مبارک زمانہ جب آج سے سو اسی سال قبل، مادر کلیسا کا ڈھلا سپوت پرنس نفیس ڈھا کے آیا تھا۔ وہ جواں سال، خوبصورت، پادری شاعر و پدما کے کنارے کنارے ٹہل کر، میرے کچھ ہماری روحانی نجات کی دعا میں مانگتا تھا۔ اور ہمارے غم میں گھلتا تھا۔“

پادری بنرجی نے اٹھ کر ایک اونچی الماری میں سے ”میر و ذآف اور انڈین ایمپائر“ نکالی۔ بشپ مہمبر کا باب کھولا۔ اور اس شاعر پادری کی تحریر کا ایک اقتباس پڑھنے لگے۔ ”دریا کے کنارے سے بندھا میری نا۔۔۔ رات میں مہکنے والے بھول۔۔۔ تار کے پتوں کی مدھم مہر سہرا ہٹ۔ کوئل کی پکار بانس کے تاریک جنگلوں میں بگمگماتے جگنو۔۔۔ عظیم دریا کی سطح پر منعکس استوائی چاند۔۔۔“

اور میں نے محسوس کیا کہ اس دلیس میں موجود ہونا بہت خوب ہے ۔

پادری بنرجی نے ورق اٹھا — اور ان کی نظر لٹپ لٹپ میری ایک نظم پر پڑی ۔ ”اپنی بیوی سے ۔“

اگر تم میرے ساتھ ہو

تو سرسبز بنگال کے آندکان میں

شام کا اندھیرا چڑی تیزی سے چھا جائے

پادری بنرجی نے کتاب ایک طرف سرکادی اور بھودوں پر انگلیاں رکھ کر انھیں بند کر لیں ۔

لٹپ لٹپ ہیر کو بھول کر وہ یکایک دور شمال کے رنگ پور ضلع میں اپنے دور افتادہ گاؤں پہنچ گئے تھے ۔ جہاں
بانس کے جھنڈ میں چھپے کالی کے مندر کے پیچھے کوئلیں چلا رہی تھیں ۔ امدان کی پڑوسن اور محبوبہ شونا اُن
کی ماں کے ساتھ پوچا کے لئے مندر آتی تھی اور وہ سامنے دیا پر اپنے نوکے میں چھپے اس کے منتظر رہتے تھے ۔

وہ وقت اور یہ آج کی رات — یہ مطمئن برصغیر — یہ محفوظ خانہ خدا — سکونِ قلب ۔

انہوں نے پرانے خواب جھٹک کر اپنی ماں کو یاد کیا ۔ نجات جس کی قسمت میں نہ تھی ۔ ماں ۔ تو تو بت پرستی
کی گمراہی میں مبتلا ہی دوسری دنیا کو چلی گئی ۔ اب تیری روح اس اندھیرے میں ۔ اس اندھیرے میں

جانے کہاں ہوئی ؟ سب کیا ہے ؟

اسرار الہی ۔

پادری بنرجی پھر کام کی طرف متوجہ ہوئے ۔ مگر سرمن کے الفاظ اور سالانہ رپورٹ کے اعداد و

شمار میں ان کا دل نہ لگا ۔ روحوں کے اعداد و شمار ۔ نجات یافتہ روحوں ۔ گمشدہ روحوں ۔ انہوں نے رجب مرزا

سے بند کیا اور قریب کی الماری میں سے ایک اور پرانی کتاب اپنی طرف کھینچی ۔ ”انگلستان میں راجہ رام موہن رائے

کے آخری ایام ۔ از میری کارپنٹر“ انہوں نے بے دھیانی سے ورق گردانی کرتے ہوئے غصے کے آخری صفحات کھولے

”چار قابلِ قدر نشو و نما کر سہیں ۔

۱۔ سر جوکار چکر برتی ۔ اونچی ذات کا برہمن ۔ خود اپنی درخواست پر لندن میں پستہ حاصل کیا ۔

یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میڈیکل کالج سے وابستہ ہوا ۔ ۱۸۵۹ء میں لندن واپس گیا ۔ وہ پہلا نیشو

تھا جو کہنہ کی نئی کوڈینڈ میڈیکل سروس میں شامل کیا گیا ۔ ۲۔ بھولونا تھا داس ۔ مورکھ ستیج کے مواعظ پر کہنہ کی افواج

کا اسٹنٹ سرجن تھا ۔ بعد میں ڈھاکہ کا سول سرجن بنا ۔ ۳۔ دوکرنا تھا پوس ۔ کہنہ کا ایک کسٹریٹھا

۱۔ گوپال چندر سیل۔

آخری نام پر بیچ کر پادری بنی مٹھک گئے۔ اور گزشتہ صدی میں مس کار پنڈی لکھی ہوئی کتتاب میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رام موہن بابو دراصل عیسائی ہو گئے تھے، آہستہ سے بند کڑی یہ محض اتفاق تھا یا اسی کو ہندو کریم اور سنسکار کہتے ہیں! اور سلمان نوشہ تقدیر بر مسکن ہمہم بسائی اُس حسن اتفاق کو گر لیں آف گا ڈکھیں گے۔

لیکن — زندگی کا دھارا چانک، ایک دم کس طرح اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ ایک انسان کے یہ ایک مخصوص سمت قدم اٹھانے سے اُس کی ساری آنے والی نسلوں کا مستقبل مختلف ہو جاتا ہے۔ مستقبل کیا ہے؟

اس غیر لام، بھولے ہوئے نام ”گوپال چندر سیل“ کو دیکھو۔ یہ آج سے سو برس قبل میرے گاؤں پیدا ہوا تھا۔ وہ عیسائی ہو کر ڈاکٹری پڑھنے ولایت گیا۔ اور وطن واپس آکر بیچارہ نوجوان رہا، ڈوب کر مر گیا۔

اور ایک روز میں، منموہن بنرجی۔ ایک مفلس سولہ سالہ طالب علم لال منیر ماٹ سے اپنے گاؤں اہل تھا۔ جب اسٹیمبر ایک بوڑھا انگریز مشنری مجھے ملا۔ اور اس نے مجھ سے میرے گاؤں کا نام پوچھا اور بڑی سرت سے بتایا کہ اسی گاؤں کے ایک قابل فرزند نوجوان گوپال چندر سیل کو اس کے باپ نے بقتسمہ دیا تھا۔ فی میں نے اس نوجوان کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ (پادری بنرجی عادتاً دل میں اس انداز میں سوچنے لگے، جس رج وہ منبر پر وعظ کہتے تھے) برہمپتر کے طویل سفر کے دوران اس بہریان مشنری نے پہلے صفحہ پر اپنا پتہ لکھ کر بل مقدس مجھے دی اور جب میں گاؤں پہنچا، میری ماں بستر مرگ پر پڑی تھی — اور دیکھو اس کے بت لے د اسکے۔ اور میں، جو انجیل مقدس سے بیدار شاعر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو بنگلہ انجیل پڑھنے کو دی۔ اور سال بعد میں، میرا باپ، چچا، بہن بھائی، سارا کنبہ رنگ بورا اس انگریز مشنری کے ہاں بیچ کر اس کے ہاتھ پر انسان لے۔ چنانچہ (پادری بنرجی نے کرسی پر پہلو بٹا! اور اپنے غیر مرمی سامعین سے مخاطب رہے) ایک سچا بیٹو میں، جو آج سے مدتوں قبل موالیسے اُن دیکھے اور بالواسطہ طریقہ سے میرے خاندان کے یسوع تک پہنچنے وسیلہ بنا۔

اگر میں اس روز اس اسٹیمبر پر اس مشنری سے نہ ملتا۔ یہ کرم تھا۔ یا محض اندھا اتفاق —

یورڈنبرجی نے سر ملہا اودھ متیر سے بیٹھے دروازے سے باہر مشن کیاؤڈ کا نظارہ کرنے لگے۔

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک مشن کیاؤڈ موجود ہے۔ بلکہ مختلف کلیساؤں کے مختلف مشن کیاؤڈ موجود ہیں۔ جس میں ڈیڑھ دو سو سال سے سفید نام مشنری خواتین سفید سائے اود سفید سولہا بیٹ پیسے پانچ میں بائبل لے کر نیکو لوگوں کی مدد میں کو بچانے کے لئے کنکرات کو شل رہیں۔ اور کالا پادری ہندوستانی معا کے ایک کنارے پر اپنی انجیل لے کھڑا ہے۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیو سنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بیٹش مشن کی طرف سے شالے ہونے والا انتہائی دلاؤ دار لٹریچر پہلے خودت دیم میں سنس کیا جاتا تھا۔ کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹون نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے لئے بیدار اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر ارش میں نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بعد سے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیر سایہ زندگی میں اس کے لئے برکت الہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمد بن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہو گا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔

سیرام پور والوں کو راجہ رام موہن رائے کی طرف سے بڑی امیدیں تھیں۔ مگر انھوں نے عیسائی ہونے کے بجائے اٹلے ان سے مناظرے شروع کر دیئے کہ آخر گوڈ کو برہما ہی کیوں نہ کہا جائے؟ مشنری مار کی روح کو بالآخر نہ بچا سکے۔

یہ اگرچہ مشنری۔ واقعی بہت بھولے تھے۔ بشپ ہمبر ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کے دورے کے بعد نکلا گئے اور کنیڈی کے شاہی محل کے دربار میں ڈیوائن سروس منعقد کی۔ اور ان کے ساتھی مسٹر روبنسن نے اس موقع کے متعلق بعد میں لکھا۔ ”سروس کے بعد میں اور بشپ ہمبر گھر لوٹے اور میں نے بشپ سے کہا۔ عبادت کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ صرف چند سال قبل اسی ہال میں ایک جابر الیشیائی بادشاہ اپنی مظلوم رعایا کو درشن دیتا تھا۔ اور آج اس میں ایک عیسائی بشپ بیٹھے دین کا پیغام سناتے ہیں۔“

ب میں نے یہ کہا تو بلیٹپ سیر نے سر جھکالیا اور دھڑے ۔

ان مشنریوں نے کالے بلیٹ اور پارڈی سیر کئے ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کو حکومت کا مکمل تعاون ہو چکا تھا۔ (انگریزوں کا عبادت خانہ ۔ گر ۔ جا ۔ بے چارے مسلمان جل کر کہتے تھے کالا پارڈی راہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا پھوہا تھا۔ اور مولویوں سے مناظرے کر رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان، دیسی عیسائی بالائیں، چریشیں اور پہلی صاحب کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ لیکن تبدیلی مذہب کے بعد مظلوم اچھوتوں رافلاس زندہ تعلیم یافتہ افراد کی زندگی بدل جاتی تھی۔ سری رام کرشن کے چیلے اور سوانح نگار ہندو رانا تھہ نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے اینکل مدھو سودن دت سے دریافت کیا کہ وہ عیسائی دل ہو گئے۔ تو انھوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ۔ اس کی خاطر۔

جھوک کے علاوہ ذہنی پچھتی بھی بنگال میں عیسائیت کے فروغ کی ایک وجہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں نال کا اور سامے ہندوستان کا ہندو سماج تنزل کی آخری حدود تک پہنچ چکا تھا۔ رام موہن رائے نے ۱۸۲۰ء ہندو کلیج قائم کیا۔ اس کے طلباء اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم نہ برہمن خاندان عیسائی ہو گئے۔ عیسائیت ایک نافع، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا قول مذہب تھا۔ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے میں نئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ صرف بنگالی مسلمان جن کو انگریز نے کچل دیا تھا، اور جو اس کے باوجود اہلین کی صفوں میں شامل ہو کر اُس سے لڑے جا رہے تھے۔ انگریزی دور اور انگریزی تعلیم کے فن تھے اور بنگال کا پس ماندہ طبقہ بن چکے تھے۔

مکتہ میں، جھدرا لوگ، کرانی اور بالو لوگ کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ اور انگریز بنگالی بالو کالیے رح مذاق اڑاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز طنز نگار نے انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی ایک باب ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں لکھا تھا۔ ”ہم بالو ازم کو ایمپائر میں کتنا ہی فروغ دیں۔ بابو کے وجود ہیں آنسو بہانا چاہئیں کہ بابو ایک سخت قابلِ رحم شے ہے۔ یہ بابو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ، رسائیس سے خوب پیٹ بھر جب موٹا ہو جائے گا تو ایسی دو تہی جھاڑے گا کہ ہم اس کا مذاق اڑانا بھول ایں گے۔ اس کے پیٹ لیڈر جوتے، اس کی ریشمی چھتری۔ اس کے دس ہزار دس پادر کے انگریزی الفاظ۔ جسے ۔ اس کی مغربی خیالات کی جگالی ۔ یہ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں

سائنس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے۔“

”سر علی بابا کے سفر نامے“ کا یہ مضمون پادری بنرجی کو ایک مرتبہ ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری نے اپنے کتب خانے کی ایک الماری میں سے نکال کر دکھلایا تھا۔

”یہ دیکھئے بنرجی بابو۔ ہمارا صاحب بیادری ہم ہندو ستانیوں کا کس بے پناہ حقارت سے ذکر کرتا ہے۔“ نواب صاحب نے کہا تھا۔

ارجمند منزل —

پادری بنرجی ارجمند منزل میں سیاسی بحث مباحثے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے لیکن جب کبھی دہاں جاتے ڈرائنگ روم میں مسلم لیگ اور صوبائی سیاست کا تذکرہ چھڑا لیتا، اور دیورنڈ بنرجی جیسے بیٹھے سنا کرتے۔ ارجمند منزل ڈھاکے کی پرانی مسلم تہذیب، لادو شاعری، تھپتھپ، راگ رنگ کے جلسوں، قدامت پرستی اور مسلم سیاست کا مرکز تھی۔ اور پادری بنرجی کو مسلم سیاست یا ہندو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صدق دل سے انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔

ارجمند منزل — یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ ان کی قابل قدر لائق احترام اور نیک بخت بیوی ایشور آن کو ارجمند منزل کے وسیط سے ملی۔ خداوند خدا کے وسیلوں کے اسرار کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نواب قمر الزماں چودھری ضلع فرید پور کے زمیندار تھے۔ اور گری بالاجیو یادھیائے ان کے علاقے کے ایک غریب برہمن کی لڑکی بچی لہجہ پنج برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر تک اس نے سسرال میں ہر طرح کے ظلم سہم، ادب ایک رات چپکے سے نگوں میں بیٹھ کر ڈھاکے بھاگ آئی اور ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کی والدہ بیگم نور الزماں سے فریادی ہوئی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اسے فوراً اپنی پناہ میں لے لیا اور کچھ عرصے تک اسے ارجمند منزل کے نانا خانے میں رکھا۔ جب نوجوان نواب زادوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تو بیگم صاحبہ نے سوچا کہ کلمہ پڑھا کر زمینداری کے کسی اہلکار کے ساتھ اس کا نکاح کروادیں۔ مگر تقسیم بنگالہ کے بعد ہندو مسلم تعلقات بید کشیدہ ہو چکے تھے اور گری بالاکے تبدیلی مذہب سے فوراً فرقہ وارانہ فساد کا خدشہ تھا۔ اگر یہ بات بید دلچسپ تھی کہ عیسائی ہو جانے پر ہندو عیسائی فساد نہیں ہوتے تھے اس موقع پر ڈھاکے کے انگریز بڑے پادری رائٹ دیورنڈ ولفرڈ براؤن کی میم آؤٹ

ابن۔ مہم صاحب بیعت میں دو مرتبہ نواب زادلوں کو انگریزی چڑھانے ارجمند منزل آیا کرتی تھیں۔ جڑی بیگم نے گری بہا
 نو مہم صاحب کے ذریعہ ان کے مشن اسکول میں داخل کروادیا۔ بڑے پادری والفرڈ براؤن صاحب نے اسے
 پستہ دے کر اپنی بیوی کے نام پر اس کا نام ایسٹھرمیرین رکھا اور جب اس نے میٹرک کر لیا تو اس کی شادی پل
 یسٹھو بن موہن بنرجی سے کر دی۔ پل بنرجی ایسٹھرمیرین بنرجی سے بڑے تھے۔ مگر ایسٹھرمیرین خود خوش تھی کیونکہ
 اسے عمر میں پہلی بار عزت اور آرام ملا تھا لہذا ایسا شریف شوہر۔

رنگ پور میں پستہ لینے کے بعد من موہن بنرجی ایک چھوٹا سا مبلغ ثابت ہوئے تھے اور انھیں
 شن کی طرف سے برٹش اینڈ فنان بائیل سوسائٹی میں ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ اور واپس آکر
 وہ صوبے کے مختلف دیسی پروڈسٹنٹ گرجاؤں میں کیوریٹ رہے تھے اور اب ڈھاکہ میں اس دیسی گرجا
 کے پادری تھے۔

ریورنڈ بنرجی نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ شمالی بنگال کے ایک گاؤں کا وہ سولہ سالہ
 برہمن لڑکا۔ گھسا ہوا سیاہ کوٹ چٹلون پہنے، بغیر فریم کی عینک لگائے، سنجیدہ، نوجوان مبلغ۔ جو کبھی اپنی
 سائیکل پر مسلمان بستیوں کی طرف نکل جاتا تو نوٹڈے اس کے پیچھے دوڑ کر تائیاں بجاتے اور وہ یسوع
 کہ خاطر یہ سب ذلتیں سہتا۔ اور آج، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات، ڈھاکہ چرچ کا یہ بزرگ پادری
 ۔ خداوند خدا کی برکتوں کا مشکور پال میٹھو بنرجی۔ راستہ طے کرتے کرتے ایک وقت
 ہیا آتا ہے، جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے! دراپنے ماضی کو سکھ اور دکھ کے ترازو
 تو لٹا ہے اور کتنے لوگ ہیں، جن کے ہاں سکھ کا پلٹا بھاری ہو؟

ریورنڈ بنرجی نے عینک اتار کر ہلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خداوند خدا نے مجھے کیا کچھ نعمتیں
 نہیں دیں۔ ایک سعادت مند گھلہ۔ ایک محبت شعار بیوی۔ ایک پیاری اور فرماں بردار بیٹی۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ قلم اٹھایا اور رب دوات میں ڈبو کر کرسمس کا وعظ
 لکھنا شروع کر دیا۔

پادری بنرجی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی روزی بی بی کاٹج کے سٹنگ روم میں بیٹھی مریم کی مورتی کیسے
 نئی سی نیلی ساہی پر سجا لپکا ٹائیک رہی تھی۔ جو وہ کالج سے لوٹتے میں جہاں آرا کے گھسے لیتی آتی تھی کہ

ارجنہ منزل کے زنا خانے کی الماریوں میں سچے گوٹے لچکے کی افراط تھی۔ یوں وہ ارجنہ منزل بہت کم جاتی تھی۔ وہ جہاں آرا کی بڑی پکٹی سہیلی تھی۔ مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی اور اس کی ایک پھوپھی نے اُسے اس کی ماں کی زندگی کی داستان سنائی تھی اُسے ارجنہ منزل جاتے ہوئے عجیب سی آتی تھی۔ جہاں آرا نے کبھی اس سے اس داستان کا ذکر نہیں کیا تھا اور وصنداری کی وجہ سے کالج میں بھی اس نے رذری کی ماں کا وہ المناک پس منظر کس کو نہیں بتایا۔ اس کے باوجود رذری کو لا شعوری طور پر نڈھولوں اور زمینداروں کے مسلمان معاشرے اور قدیم وحشیانہ رسوم سے جکڑے تنگ نظر ہندو سماج سے نفرت تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے دیسی عیسائی طبقے کی مضحکہ خیز حیثیت کا بھی خاصا احساس تھا۔ ہندو سماج نے اُس کی بھولی ماں کو تین سال کی عمر میں بیاہ کر اور پانچ سال کی عمر میں بل و دھوا بنا کر اس پر ظلم توڑے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے لونہالوں نے یعنی خود جہاں آرا کے باپ اور چچاؤں نے اس کی بے سہارا ماں کو اپنا کھلونا بنانا چاہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس عیسائی سوسائٹی نے اُس کی ماں کو عزت، تعلیم و تربیت اور گھر عطا کیا تھا۔ ان سارے آپس میں اُلجھے ہوئے حقائق کے باوجود بیس سلاہ حساس اور ذہین معذی بنرجی خدابی اور ذہنی طور پر خود کو ایک دورا ہے پر موجود پارہی تھی۔ وہ خود کو خالص ہندوستانی کلیچہ اور قومی سیاسی علمائے مثال کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا عیسائی سماج انگریز کا تخلیق کردہ تھا اور انگریز کا نمک حلال تھا۔ اور یہ باتیں وہ اپنے شفیق اور نیک طینت باپ سے کسی طرح نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی سے نہ کہہ سکتی تھی! اور اس کی ماں ایتھری بلانرجی عیسائی ہونے کے باوجود ایک خالص بنگالی تھی جتنا گھریلو عودت تھی۔ جسے ان مسائل سے کوئی پوچھی نہ تھی۔

تبدیلی مذہب کے باوجود جنوبی ہند کے عیسائیوں کی مانند بنگالی عیسائیوں پر بھی اپنے صوبے کی کلیچہ کا گہرا اثر باقی تھا۔ منرا ایتھری بنرجی کی سسرالی عورتیں بنگال کی بیشتر برہمن اور دوسری اونچی ذات کی عیسائی خواتین کی طرح مانگ میں سینہ در لگاتی تھیں اور مذہبی رسوم کے علاوہ ساری پرانی ریت و رسوم کی پابند تھیں۔ رذری اسکول کی انٹھویں کلاس سے دیپالی سرکار کی ہم جماعت تھی۔ بڑی ہوئے پر تھپی کے گھنٹوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ سینئر لڑکیوں سے سیاسی گفتگو سنتی۔ تحریک آزادی کا ہر طرف چرچا تھا۔ بہت سی باتیں ابھی پتے نہیں پڑتی تھیں لیکن بنگال انقلابی تحریک کا پرانا گڑھ تھا۔ اور ان نوعمر لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ انگریز کو مارا کر بھوسہ بھر کے دیس سے نکال دو۔

برانی دہشت پسند پارٹی انوشیلین کے ہیڈ کوارٹر زبردوان ضلع سے آئی ہوئی ابانی اپنے ماں باپ سے
سنے ہوئے اور بند و گھوش اور سوامی و دیکانند کے انقلابی بھائی بھوہند ردت کے قہقہے چھیڑتی۔ اس صدمہ
کے شروع میں ہندوستانی انقلابی آرگنیزنگ کے SIN FEIN روس کے سوشل ڈیموکریٹس اور ریننی
کے ٹینگ اٹلی سے متاثر ہوئے تھے۔ جنہوں نے اسی زمانے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ وہ ڈیموکریٹک ایٹس آرگنیزنگ
— ایٹس جو اپنے ملک کی آزادی کا نقیب تھا اور ساتھ ہی عارفانہ نظمیں لکھتا تھا — اور جو ہندوستانی
روحانیت کا مداح تھا۔ وریکانند - میگور - ایٹس — وہ بھی کیا نہ تھے۔ رومینسک اور ولولہ
غیر اور دلکش۔ روزی ان سب باتوں کو سن کر سوچا کرتی — اور ۱۹۰۵ء کے ان انقلابیوں نے
لیفٹسٹ گورنر کو مارنے کے ارادے سے ریلوے لائن پر ایک جھوڑے تین بار بار دو بچائی تھی۔ اور علی پور
سازش شروع ہوئی تھی۔ اور سی۔ کرسٹس نے اور بند و گھوش کا مقدمہ لڑا تھا۔ اور اسی وقت برین گھوش
نے کہا تھا۔ ہم انگریزوں کو مار کر آزادی حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھ رہے۔ ہم صرف یثابت کرنا چاہتے
ہیں کہ ہم میں مارنے اور مرنے کی ہمت ہے — یورپ میں ہندوستانی طلباء نے انقلابی گروہ بنائے
تھے۔ سکھ کسانوں نے امریکہ اور کینیڈا میں ہند پارٹی قائم کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سرکرزن ولی کو جو ہندوستان
کے خلاف قانون بنا رہا تھا۔ لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم ملال نے گولی کا نشانہ بن لایا تھا
اور پھانسی پر چڑھا تھا۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا اور چار نو جوان دار پر بھاگے تھے۔
آج سے پچیس سال پہلے مغربی سامراجیوں نے آپس میں اسی طرح کی ایک بھیانک جنگ مڑی تھی۔ اور
اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برین کیٹی بنائی تھی۔ جس میں سر فحشی دیوی کے بھائی ویریندر
چٹوپادھیائے، اور راجہ ہند ر پر تاپ اور بھوہند ر ناھ دت اور سمن سنگھ اور برکت اللہ اور چمپکے من
پلے اور ایم۔ ایچ۔ ڈے شامل تھے۔ بنگالی۔ پنجابی۔ مدراسی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ کون کتا ہے کہ ہندوستانی
قوم متحد نہیں ہو سکتی۔ ؟ اور غنہ پارٹی کے اراکین لہر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ اور ۲۴ فروری ۱۹۱۵ء
غنہ کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ اور فوجی پچاسی یو۔ پی اور پنجاب میں غنہ شروع کرنے والے تھے جب کسی
میر جعفر نے پھر حکومت سے خبری کر دی۔ پھر سینکڑوں کو پھانسی لگئی۔ سینکڑوں کا لے پانی گئے۔
عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۲ء میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔
اور پچاسی کی کوٹھڑیاں آباد ہوئیں۔ یو۔ پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشفاق اللہ

اور اس کے ساتھی پچاسی پر چڑھے۔ آندھڑ میں اوری سیتارام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے پھرتے اور مارے گئے۔ مراد بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قائم کرنا ہے اور پچاسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر راہ آباد میں پولیس سے لڑے اور مارے گئے۔ چانگام میں ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کو آر لینڈ کے ایسٹر سنڈے کی طرح کی موکر آزادی ہوئی اور انقلاب کی نئی "نوجوان ترک پارٹی" جگانتھر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جگانتھر کے لیڈر سوریہ سین اور ان کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہو گئے۔ نوجوان کلینڈر کو قید کر لیا گیا اور کالج گریجویٹ پرتی تا چانگام کے یورپین کلب پر مسلح حملے کی قیادت کرتی ہوئی پکڑی گئی اور پولیس نے قبضہ میں آنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان شانتی دیوی اور ممتی دیوی کو کومیل کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کاٹ نہ مانے کی سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا۔ کمار مینا داس نے بنگال کے گورنر پر گولی چلا دی۔ چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے اسپیکٹر جنرل پولیس، اسپیکٹر جنرل آف پرنسز اور سیشن جج علی پور سب کو موٹ کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ضلع مدنا پور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے۔ یورپین ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ، اسٹیشن کے ایڈیٹر اور سر چارلس ہنگارٹ پر قاتلانہ حملے افسوس کہ ناکام رہے تھے۔

جگانتھر کا بیٹا وارنر چانگام کے نزدیک دھول گھاٹ میں آج بھی موجود تھا۔ سوریہ سین، یعنی ماسٹرو آج بھی بنگال کے ہیرو تھے۔ خودی رام باسو سے لے کر دیپالی کے چچا دیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پچاسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیانک جنگل کھڑا تھا۔ جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے۔ اور یہ سارے انقلابی نوجوان بنگال کے ہیرو تھے۔ بھدرالوگ۔! متوسط ہندو بنگالی طبقے نے ایسے ایسے بہادر نوجوان پیدا کئے تھے! بھدرالوگ۔!! اور روزی سوچا کرتی کیا میں کلینڈر دت۔ پرتی تا شانتی۔ سمتی اور مینا داس جیسی ہیروئن نہیں بن سکتی؟ کچھلے چند برسوں میں سارے دہشت پسند انقلابی کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور اب کالج میں لڑکیاں ان نئے انقلابیوں کا تذکرہ کرتیں۔ ریحان الدین احمد اور اکٹھے مکر جی اور اودامارائے۔ لڑکیوں کے دل دماغ میں ماسٹرو کی جگہ اب ریحان الدین احمد لے چکے تھے۔

سال بھر قبل دیپالی نے بڑے مضطرب لہجے میں روزی سے کہا تھا۔ "روزی۔ سنو تو۔۔۔
 کل میں ایک خفیہ اسٹڈی سرکل میں گئی تھی۔ اب کے سے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں بہت اچھی اچھی باتیں

معلوم ہوتی ہیں۔ ” روزی چپ رہی تو دیپالی نے کہا تھا۔ سلفے پایا سے کہہ دینا میرے گھر جا رہی ہو۔ کالج کی پڑھائی کرنے۔“

آئندہ اتوار کو روزی دیپالی کے ہمراہ پرانا پلٹن کے اس پڑا سرسکان میں گئی۔ اور چند ہفتوں بعد یہی الا تو ای اخترا کی تحریک کی جڑی سخت حامی ہو گئی تھی۔ خود اپنے وجود کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالوں کا جواب اُسے مل گیا تھا۔ سیدھی سی بات یہ تھی کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے جب ملک میں قحط پڑتا تھا اور کساد بازاری چھاتی تھی اور بے روزگاری پھیلتی تھی تو مشنری لوگ بھوکے منہ کے ہندوستانیوں کو عیسائی بناتے تھے۔ پھر اس ستمبر میں جنگ چھڑی تو اسٹڈی سرکل میں اکتے دانے روزی کو سمجھایا کہ مغربی سامراجیوں کی اس جنگ کو ہندوستان میں خاد جگلی میں تبدیل کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ سُرخ انقلاب فی الغور آسکے۔ اب ہم اس مقصد کے حصول کے لئے کام کریں گے اور اس جنگ کے خلاف اور خاد جگلی کے پرچار کی خاطر خفیہ طور پر پریچر چھاپ کر مفت میں تقسیم کریں گے۔ روزی اس مجوزی خاد جگلی کے لئے بھی بخوشی تیار ہو گئی تھی۔

ہادی منہجی کے فرشتوں کو بھی خبر تھی کہ روزی اتوار کے بعد کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ کہہ دو بھائی روزی تم نے شہر کے ایک محلے میں سنڈے اسکول کھولا ہے۔ پچھلی مرتبہ اکتے نے ہنس کر اس سے کہا تھا۔

لیکن اب چند روز قبل وہ خفیہ اسٹڈی سرکل ٹوٹ گیا۔ ساتھیوں کے ہل میں انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ دیپالی بید خانوش رہنے لگی۔ اب وہ روزی کو کچھ بتاتی تھی۔ شاید یہ لوگ بھرپور دی طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ میرا سارا خاندان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ ڈھاکا کا موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیم کینٹ دیل پاپا کو بید مانتا ہے۔ منسٹر کینٹ دیل بھی کبھی کبھی لٹی کالج آتی رہتی ہیں۔ میں ساتھیوں پر کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں برٹش راج کی وفادار نہیں ہوں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ میں ان کی خبری کر دوں گی۔ روزی کو پچھلے روز سے اندازہ تھا کہ دیپالی کے پاس انڈر گراؤنڈ سے اہم پیغام آئے ہیں۔ مگر دیپالی نے اس سلسلے میں بالکل چپ سا دھ رکھی تھی۔

حضرت مریم کی ساری پرچکاٹانک کردار سلنی ستائے کا مٹا سا تاج بنا کر روزی ایک لمبا سانس لے کر کوچ پر سے اٹھی۔ اور شال لیٹ کر باہر معن میں آگئی۔ سائبان کے، اندھ ٹیلو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ رقدی در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کہاؤنڈ کی غریب بنگالی عیسائی عورتیں کتنی شرور حلے مورتیاں سجا نے میں مہنک تھیں اندر جا کر اس نے مریم کی مودی کو کپڑے پہنائے اور تاج سر پر رکھا۔ اور کلیکت اس نے سوچا۔ اس سائبان اور ڈرگا پوجا کے پنڈال میں کیا فرق ہے ہاں غریب عورتوں کے لئے کیا مریم بھی لاشعوری طور پر ڈرگا کی مانند ایک ادیبی

نہیں؟ اور کیا ہم عیسائی لوگ بُت پرستی نہیں کرتے؟ پھر ہندو کافر اور گمراہ کیوں ہیں؟ اگر خدا فاختہ کا روپ
دھار کر دنیا میں آسکتا ہے تو کچھوے اور مچھلی میں اوتار کیوں نہیں لے سکتا؟ میسے بے چارے پایا۔ مائے
یرے پیاسے پیچارے بوڑھے پایا۔ تم نے ساری زندگی ان بے معنی بحثوں میں کیوں مشغول کی؟ فاختہ اور
روح القدس۔!

وہ لیکایک بیدار دل گرفتہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی گرجا گھر کی طرف بڑھی اور ہال میں جھانکنے لگی۔
ہال کے ایک کونے میں پنجابی ٹولی زندہ زندہ سے گاری تھی۔

رب خداوند بادشاہ اے۔ اور جلال دابادشاہ اے
اُچھے کرو سر جان جلال دابادشاہ آوے۔

وہ دبے پاؤں اندر پہنچی۔ لڑھیانہ مشن کے پادری ریونڈ ہنری بسواس کا نوجوان بیٹا مسٹر لو تھر بسواس
بڈل دالے ہارونیم پر بیٹھا تندی سے حمد کی سنگت کر رہا تھا۔

”اے خداوند اپنی راہ اپنے بندے کو لے دکھا۔ آ۔ آ۔ روزی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر مسٹر لو تھر بسواس
برا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ منٹوں پہلے چپ ہو گئی۔ چند لڑکیاں سفید شلواریں، سرخ سوئیڈر اور سفید
پٹوں میں ملبوس شرما کر کبھی کبھی ہنس پڑیں۔

مسٹر لو تھر بسواس ذرا عجیب کر مسکراتے ہوئے روزی کو دیکھنے لگے۔

یہ لوگ سب کسی دوسری دنیا کے باشندے تھے۔ روزی اخلاقاً مسکراتی۔ سوری۔ میں نے آپ کو
کی پریکٹس کو ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیری آؤن۔“

”آپ۔ آپ۔ آپ بیٹھیں ناروزی سمسٹر۔“ ایک پنجابی لڑکی نے کہا۔
”نہیں بھئی۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔“

مسٹر لو تھر بسواس کے سامنے مسکرا کر سر ذرا سے خم کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دواڑے پر
پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ گو کچھ منٹوں نے دوبارہ کانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسٹر لو تھر بسواس کی زودیدہ
نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور وہ بے طرح شرما رہے ہیں۔

ادامائی گاڈ۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور عمارت کا چکر لگا کر پادری ہنری کے دفتر کی کھڑکی
کے نیچے پہنچی اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پاپا عینک ناک کی لوک پر رکھے میز پر جھکے ٹیپ کی روشنی میں تندی سے

دعنا لکھے میں معدن تھے۔ اے اپنے بوڑھے باپ پر بے اختیار پیارا گیا۔ خدایا ان کو زندہ رکھ۔ خدایا ان کو میرے سر پر زندہ سلامت رکھ۔ اس نے دعا مانگی! دروازے کی طرف جا کر چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

قلم سرعت سے چل رہا تھا۔ سر۔ سر۔ سر۔

روزی کمرے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور جھانک کر پڑھنا چاہا۔ اور دل میں مسکرائی۔ گڈ اولڈ پاپا۔ پاپا اور اُن کے سالانہ کرسمس سرمن۔

”کفارے کی نسبت جو ہمارے خداوند یسوع نے اے لوگوں! تمہارے لئے کیا۔ اُس نے جان

کھوئی کہ تم اس کو دوبارہ حاصل کرو۔ گیہوں کا دانا جو مرنے کے بعد۔“ قلم کی رفتار تیز ہو گئی۔ ”وہ جو

یسوع پر ایمان لائے۔ خداوند تیری برکت تیرے بندوں پر ہے۔ دے روح القدس میں غوطہ دلائے جاویں گے

کہ وہ جو ہماری لئے مٹوا اور بدخون ہوا۔ اور جی اسنا اور وہ خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا۔ جو ہماری تمہاری ہر خاطر

صلیب پر لٹک گیا۔ اس کا مبارک یوم ولادت منانے ہم آج جمع ہوتے ہیں اور اس خداوند خدا کا لاکھ لاکھ

شکر ہے کہ ہم اس ملک میں امن و امان کی حکومت کے زیر سایہ۔“

”دیدنی۔“ کھڑکی کے نیچے سے کپاؤنڈ کے ایک بچے نے اُسے آہستہ سے پکارا۔ وہ سرعت سے

باہر نکلی۔ بچے نے اس سے کہا۔ ”بھانک پر یہ بڑی کالی موٹر کھڑی ہے۔ اس میں دیپالی دیدنی بیٹھی ہیں۔

آپ کو جگہ رہی ہیں۔ ایک دم جلدی۔“

”دیپالی موٹر میں بیٹھی ہے؟“ روزنی نے حیرت سے دُہرایا اور چاروں طرف نظر ڈال کر تیزی

سے بھاگی۔

اومارائے کی موٹر اندھیرے رنگ کے نیچے کھڑی تھی۔

”روزنی۔ تمہارے ہاں تو بڑا ہنگامہ ہے۔“ دیپالی سرکار نے کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر گھبراتے

ہوئے کہا۔

”ہاں۔ فکر مت کرو۔ کیا بات ہے؟“

”بے حد میریس۔ تم کئی عرصے میرے گھر بیچ جاؤ۔ وقت بالکل نہیں ہے اور بالکل خاموش

رہو۔ ٹوپ سیکرٹ۔ گڈ ٹائٹ۔“ دیپالی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ کارزن سے آگے چلی گئی۔

روزنی چپ چاپ اور متفکر بھانک کے اندر دھپیں آئی اور کھنکریلیں کو پیروں سے ٹکراتے ٹکراتے

ہی کاٹج کی سمیت روانہ ہو گئی۔ سائے گر جا گھر میں سے پنجابی ٹولی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اے خداوند میرا دل اک پاسے کر۔ تال میں رکھاں تیرا ڈر۔

اور اب تو تھر بسواس کی بھاری آواز حمد میں شامل ہوئی۔ ہارنیم زور زور سے بجنے لگا۔
 تھی گاؤ تھنا۔ گاؤ۔ تھنا تھی رب دی۔ سچیاں دی ٹولی وچ دل نال گاواں۔ تھنا سناواں
 رب دی۔ رب خداوند بادشاہ لے۔ او جلالی رابا دشاہ لے۔ اے خداوند اپنی راہ اپنے بندوں نول
 دیکھا۔ آ۔ آ۔ آ۔

۷

نیا عہد نامہ

چندر کج کے کوٹھے والے سائبان میں کھڑی دیپالی سہارا صبح کے ناشتہ کے بعد سے روزی کا انتظار کر رہی تھی۔ دھڑسٹک کے موڑ پر روزی کی سائیکل آتے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتری اور میٹھا خانے کا اندازہ لگھوٹا۔ جوں ہی روزی لہڑائی دیپالی نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر جھٹ پٹ دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگادی۔ اور بڑے ڈرامائی انداز سے الماری پر سے بائبل ناکر کر (جو ایک مرتبہ پارڈی ہینر جی نے اسے دی تھی) روزی کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔

”آنکھیں بند کرو روزی۔“

حیران و پریشان روزی نے آنکھیں بند کیں۔

”کہو۔ ملک و قوم کی خاطر حلف اٹھاتی ہوں۔ گوڈی فار۔ گوڈی سن اور گوڈی

ہولی گھوسٹ کے نام پر۔“

روزی نے ایک آنکھ کھولی۔ ”مس ہیڈ لے نے پرسوں ہی بتلایا ہے کہ صبح تلفظ گھوسٹ

نہیں گوسٹ ہے۔“

”اچھا۔ اچھا۔ ہولی گوسٹ کے نام پر۔ چلو۔ بو تو۔“

روزی نے دونوں آنکھیں کھولی لیں اور ٹھٹھک کر کہا۔ ”دیپالی۔ میرے پاپا پر تو کوئی آفت نہیں

آئے گی؟ وہ بہت بوڑھے ہیں۔“

دیپالی چپ ہو گئی۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ ”میں۔ میں مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ روزی۔ مگر۔ مگر تم سبھی ہندوستانی ہو کہ نہیں۔“ اس نے لمحہ بھر کے بعد کہا

”ہاں۔“ (میں کالمین نیٹر کر سچین سچی ہندوستانی ہوں۔ اس نے دل میں تلخی سے کہا۔ پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اس خود رجمی کی کیا ضرورت ہے۔ تحریک آزادی میں ان گنت عیسائی شامل ہیں۔ ایک سے ایک بڑے محبت وطن۔ حب وطن کیا کسی ایک ہی فرقے کی میراث ہے؟ اس واقعے میں دیپالی سانس روکے توقع نظروں سے روزی کو دیکھ جا رہی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔؟ تو کیا ہوگا۔؟ دیپالی کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا سارا مستقبل اس وقت محض روزی بنرجی کے ہاں یاد کرنے پر منحصر ہے۔ دیپالی کو کپکپی سی محسوس ہوئی۔ اتنے میں روزی نے فرش پر دوڑنا دیکھ کر زیرب حلف مہرایا اور بائیل سر اور آنکھوں سے لاکر کہا۔ ”سو ہیپ می گوڈ۔“

دیپالی اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے بلیک پر جا بیٹھی۔

”روزی۔ ادھر آؤ۔“ اب گویا وہ گرو یا لیڈر تھی۔ روزی اس کی جیسی تھی۔ ”غور سے سنو روزی۔ دیپالی کی آواز میں حکم آگیا تھا۔ اومارائے کی طرح اقتدار اور احساس ذمہ داری انسان کو پل کی پل میں بدل جاتی ہے۔

”روزی۔ ڈی ایم کے بنگلے پر تمہارے کپاؤنڈ کا کوئی آدمی ملازم ہے۔ تم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا؟“

”سنرکنٹ ویل کی آیا ہمارے ہاں کی عورت ہے۔ لیٹا۔۔۔ ممی نے ہی اسے وہاں رکھوایا تھا۔“

”کہاں کی رہنے والی ہے؟“

”پالا تو ممی نے اسے کپاؤنڈ میں ہے۔ مگر اس کی نانی نرسنگھ دی میں رہتی ہے۔“

دیپالی چند لمحوں تک سوچا کی۔ پھر پوسٹ کارڈ اور قلم نکال کر روزی سے کہا۔

”میں اس کی نانی کی طرف سے تمہاری ممی کو خط لکھ رہی ہوں۔ نانی بہت سخت بیمار ہے۔ لہذا

دیپالی ایک ہفتے کے لئے فوراً نرسنگھ دی پہنچے۔ ان کو کہہ کر۔۔۔ سگھڑن۔۔۔ لائے گا ادویہ کارڈ وہاں ڈاک میں

لے دے گا۔ اچھا ٹھہرو۔ جونت جید قابل اخبار ہے۔“

”تم دیپالی جونت کو برسوں سے دیکھ رہی ہو۔“

”اچھا۔ جوزف ایک لغائفہ لے کر لیلا کے نام ڈی۔ ایمرڈاؤس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ گاؤں سے آدمی یہ چھٹی لایا ہے۔“ وہی نانی کی بیماری والی۔ اور کہے گا کہ ہفتے بھر کی عیوضی کا انتظام بھی کرتا آیا ہے۔ یہ لیلا جو ہے تمہاری۔ یہ میم صاحب سے چھٹی مانگے گی۔ میم صاحب کیسی آدمی ہیں؟“

”اچھی خاصی ہیں۔ مشرین عورت ہیں۔“ روزی نے جواب دیا۔ مگر انھیں سی محسوس ہوئی۔ میں سرکلنٹیل سے واقف ہوں۔ ان سے ملتی رحتی ہوں۔ اور اب ان کو دھوکا دینے جا رہی ہوں۔“ اچھی خاصی ہیں۔“

س نے دہرایا۔

”اُس کے بعد شام کو ایک برقعہ والی ملازمہ کلثوم بی بی ڈی ایمرڈاؤس پہنچ جائے گی۔ لیلا کی عیوضی۔“

پہلے میں نے سوچا تھا کہ خط لے کر تم جاؤ اور لیلا کو چھٹی دلادو اور بعد میں کلثوم بی بی کو سنا دو۔ تو منٹوں میں کام بن جائے گا۔ مگر پھر خیال آیا کہ تم کو مصیبت میں نہ ڈالوں۔“

”کیوں۔؟ روزی نے غصے سے پوچھا۔“ پھر حلف کس لئے اٹھوایا ہے؟“

”تم خود چلی جاؤ گی؟“

”اٹ کدس۔“

”ادہ۔“ ڈیڈرفل۔ روزی۔“ دیپالی خوشی سے اچھل پڑی۔

”مگر دیپالی۔ یہ سب کس لئے۔؟ تم سرکلنٹیل دین پریم تو نہیں پھینکو گی؟“

”روزی۔ تم کو پتہ ہے، ہم لوگ ہم نہیں پھینکتے۔“

”ہم لوگ۔“ دیپالی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اور روزی مرعوب ہوئی۔ مگر اچانک اس نے کہا۔

”ایک بڑا سخت ٹوپہ ہول ہے تمہاری اسکیم میں۔ پوچھو کیا۔؟ لیلا ایک ہفتے کے لئے کہاں جائے گی؟ خط تو فرمائی ہے۔“

”اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اچھا۔ روزی۔ آج ہے۔“

”ہاں۔“ روزی نے دیکھ کر پہلے کلثوم بی بی کا ڈی۔ ایمرڈاؤس میں پہنچ جانا لازمی ہے۔“

”مگر کیوں آخر۔؟“

”یہ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔“

”کیوں؟“

”روزی بھرجی۔ تم نے انڈر گراؤنڈ میں کام کرنے کے لئے حلف اٹھایا ہے نا۔ اب زبان بند رکھنے اور وال نہ کرنے کی عادت ڈالو۔“

”تم تو واقعی ڈکٹیٹر بن گئیں۔“ روزی نے منہ ہلکا کر کہا۔

دیپالی بچوں کی سی کھائی میں ییلا بتی آیا کی نانی کی طرف سے سبز ایسٹھر بھرجی کو پوسٹ کارڈ لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

۲۴ دسمبر کی صبح روزی ملی کالج کے برآمدے میں بیٹھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور لاٹ پادری کے ہاں سے نئے ہوئے کھلونوں اور گرم کپڑوں کے پارسل بنانے میں مصروف تھی۔ چوکپاؤنڈ کے یتیم بچوں میں تقسیم کئے جانے والے اسی وقت ڈاکٹ نے ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا۔ پڑھ کر روزی نے اپنی والدہ کو آواز دی، جو کانفرنس کے مندوبوں کی صبح کی چائے کے انتظام میں سرگراں پھر رہی تھیں۔

”ممتی — بے چاری ییلا بتی کی نانی کا خط آیا ہے۔ بڑی سخت بیمار ہے۔“

”ارے کیا ہوا؟“ سبز ایسٹھر بھرجی نے پوچھا۔

”یہ نہیں لکھا۔ یہ دیہاتی لوگ تو صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ پران بکھنے والے میں فوراً پہنچو۔“

”خدا باب رحم کرے۔“ ایسٹھر بھرجی نے کہا۔ ”روزی تم خود جا کر مسز کینٹ ویل کو خط دکھا دو۔“

شاید جیجی نہ دیں۔ ییلا مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ گاؤں جانا چاہتی ہے۔ مگر میم صاحب ابھی جیجی نہیں دے رہی ہیں۔“

”کیوں؟ ان کے ہاں آیا کا کام ہی کیلئے ہے؟“

”نہیں، مگر ان کے ہاں بھان آنے والے ہیں۔ پرسوں چیرٹی بازر کے لئے آئی نہیں تھیں تو مجھے

رہی تھیں۔“

”کون بھان آنے والے ہیں۔ مانا؟“

”مجھے کیا معلوم۔ مسز کینٹ ویل سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ مجھے تفصیلات بتائیں۔ ہوں

لے کوئی۔“

روزی نے پارسل کٹے کر کے اندر سنگ روم میں کرسمس ٹری کے پاس رکھ دیے۔ چند لمحوں کے لئے چپ کھڑی رہی۔ پھر غیر ارادی طور سے سیٹی کی تصویر پر نظر ڈالی، جو آئینہ کے اوپر لگی تھی (کرسمس کی ایک دیوار پر شپ بمبر کی تصویر بھی آویزاں تھی) باہر آکر اس نے سائیکل بھالی اور رمانا کی سمت روانہ ہو گئی۔

۸

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پُر فضا بنگلے کا وسیع باغ موسم سرما کے روشن پھولوں سے جگمگا رہا تھا۔ بنگلے کے اندر چھوٹا حاضری کے بعد ملازمین بڑے دن کی تیاریوں میں سرگرمی سے مصروف ہو چکے تھے۔ روزی بنجی نے سائیکل ایک گلی آہر کے نیچے کھڑی کی اور برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کے درپے سے اندر بھاگ نکلا۔ بیرو گول میز کی جھاڑ پونچھ کرنا نظر آیا۔ روزی نے ذرا ڈرتے ڈرتے درپے پر دستک دی۔ غصہ بیرو روزی مس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اُس نے باہر آکر کہیں ٹکال دیں۔ مگر جھک کر سلام نہیں کیا کہ بڑے صاحب کا بیرو تھا۔

”میم صاحب ہیں؟“ روزی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔

”اندر ہیں۔“

”اور صاحب۔؟“

”صاحب کچھ ہی جانے والا ہے۔“

اندر سے بوٹوں کی چاب اور ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی اور کسی نے پکارا۔ ”ڈرائنگ۔“

”یس ڈیر۔“ یہ مسز کینٹ ویل کی آواز تھی۔

بجلی کے کوندے کی طرح روزی کو خیال آیا کہ واپس چلی جائے۔ وہ کس زبردست حماقت میں پھنس گئی ہے۔ قوم پرستی وغیرہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ خطرناک سازشیں — وہ ایک دم سمجھے ہٹی۔

کراتے میں فریڈا کینٹ ویل کتے کو آواز دیتی خود ہی باہر نکل آئیں۔

”گڈ مارننگ مسز کینٹ ویل۔“

”گڈ مارنگ۔ گڈ مارنگ۔ ہاؤ آر یو روزی۔؟“
 ”فائن۔ تھینک یو۔ مسز کینٹ ویل۔ ہاؤ آر ڈسکی۔؟“
 ڈسکی کتا تھا۔ جو بھاگت ہوا برآمدے میں آیا۔

”یس روزی۔؟“ مسز کینٹ ویل نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ اُسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گئیں۔ وہ اس سے اس طرح مخاطب تھیں۔ جس طرح ڈاکٹر پھیری والے یا اخبار فروش سے کھڑے کھڑے بات کی جاتی ہے۔
 ”ہاؤ از دی اولڈ پارڈے۔؟“ فریڈ اکیٹ ویل نے جھک کر ڈسکی کو گود میں اٹھاتے ہوئے دیکھا
 کیا۔ ”تم کسی خاص کام سے آئی ہو۔؟“

میں۔ روزی شریلا بنرجی۔ ریورنڈ پال پتھو۔ بنرجی کی بیٹی۔ انسان۔ محض ایک حقیر ہندوستانی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیر ہندوستانی جہاں آ رہی ہے۔ مگر خواب قمر الزماں چودہری اور پیرسٹری پری تو شہر کے اعلیٰ طبقہ کے افراد ہیں اور ڈی۔ ایم سے برابری سے ملتے ہیں۔ جہاں آ رہی ہیں اور امارائے کو فریڈ اکیٹ ویل اپنے ہاں ڈنر پر بلاتی ہیں اور ان کے گھر جا کر ڈنر کھاتی ہیں۔ اور میں محض ان کے پروردہ بیٹے باری کی لڑکی ہوں۔

چند سیکنڈ قبل روزی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ انھیں ”میری کرمس“ دینے کے لئے آئی تھی۔ واپس بھاگ جائے گی۔ جہنم میں جائے اندر گر اوڈر۔ مگر اب اس نے بیکھت سر اٹھا کر بڑے دھڑکنے سے آہن بواب دیا۔ ”جی ہاں ایک ضروری کام ہے۔ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس نے پوسٹ کارڈ سوئیٹ کی جیب سے نکالا اور بولی۔ ”لیلا بتی کی نانی کا کارڈ مال کے پاس آیا ہے۔ وہ بوڑھی عورت بہت سخت بیمار ہے۔“
 ”اوہ۔ ڈیم۔ عبدالغفور۔ آیا کو بلاؤ۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے کہا اور شعلتی شعلتی جا لڑکھوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

آیا باہر آئی۔ روزی نے اُسے بنگالی میں نانی کی خبر سنائی۔ اور پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں دے کر چادری عورت کانگ فٹ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”گھبرانے کا باٹ نہیں آیا۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے مڑ کر کہا۔ ”جیستی بیار ہوتا تو بیٹی گرام باراگریٹ مدر۔ ڈونٹ یو تھنک سوروزی؟“

”ہم کو چھٹی دے گا میم صاحب۔“ لیلانے کہا۔

”جاؤ۔ مگر عیوضی کا انتظام پہلے کرنا انگٹا۔“ کمر پر ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے عبدالغفور نے سر دیا۔ ظاہر تھا کہ عبدالغفور میم صاحب کے منہ چڑھے ملازم ہیں۔

”عیوضی۔“ اداں۔ مس صاحب۔ ادھر کیا پڑیں ڈیری یا موٹیل ا بھی ہیں گی؟“

لیلانے گھبرا کر پوچھا۔

”ادھر بیٹلے پر ٹرینڈ آیا انگٹا مس صاحب۔ عیوضی میں۔“ عبدالغفور نے رخصت سے کہا۔ منر
کینٹ ویل معاملہ عبدالغفور پر چھوڑ کر مالی کو ہدایات دینے کے لئے برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔
ادریں گملے کے نیچے کھڑی لئے کھڑا کچھ سڑک پر گر رہا تھا۔

رضی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ ”منر کینٹ ویل۔“ لیلانے کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے
اس لئے ان کو اس کی بڑی نگر ہے۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو ما کو بھی عیوضی کا خیال آیا تھا ہمارے درز
کی بھانجی آیا کا کام جاتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں۔“

فریڈ کینٹ ویل روزی کی طرف مڑیں۔ یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

”درزی کی بھانجی۔“ کون سا درزی۔ ہمارا حسن علی؟“ انہوں نے پوچھا ظاہر تھا
کہ فریڈ کینٹ ویل ایک خالص گھریلو بی بی یعنی ماؤس وائف تھیں اور درزیوں اور نوکروں کے
سلسلے سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔

اب روزی بڑبڑاتی۔ ”جی نہیں۔“ منن کا ایک پرانا درزی تھا۔ کریم اللہ۔ وہ اب چلا
گیا ہے۔ اس کی بھانجی کلثوم کچھ روز ہوئے ما کے پاس کام کی تلاش میں آئی تھی۔ انگریزی نہیں
جانتی، مگر بڑی ایماندار لڑکی ہے۔ بیوہ ہے۔“ لاشعوری طور پر روزی نے اپنی ماں کی کہانی دہرا
”اگر تم اُس کی ذمہ داری لیتی ہو تو بھیج دو۔ میرے کمروں میں سارا سامان کھلا پڑا رہتا ہے۔ یہاں کے
بکس تک کھلے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے نوکروں پر اتنا بھروسہ ہے۔“

”اچھا۔ لیلانے میں جوزف کے ساتھ کلثوم کو بھیج دوں گی۔ تم اسے سارا کام سمجھا دینا۔“ روزی
نے آیا کو مخاطب کیا۔

”اچھا۔ روزی بابا۔ گاڈ بلیس یو روزی بابا۔“ لیلانے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

فریڈا کینٹ ویل اب بیڑھیاں اتر کر کرستھم کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہی تھیں۔ روزی
 ان کو "بائی" کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر فرارے سے باہر نکلی۔
 جب وہ سڑک پر پہنچی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی
 اُس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔

چندر کنج جا کر دیپالی کو تفصیل بتانے کے بعد روزی کپاؤنڈ واپس آگئی اور اس کے جانے کے
 ایک گھنٹے بعد اومارائے کی کار چندر کنج کے پھانگ پر آ کر رکی۔ اومارائے شال پیٹے نیچے اتریں۔ وہ
 سب معمول بہت مضحل نظر آرہی تھیں۔

ڈاکٹر سرکار برآمدے میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اجنبی ہمان خاتون کو دیکھ کر ذرا
 ہراسے گئے اور نمسکار کیا۔ اومارائے نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا۔
 ڈاکٹر سرکار ان کو بیٹھک خانے میں لے آئے۔ دیپالی کو اڑکے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔
 مانے آواز دی۔

"دیپالی۔"

"جی اومادی۔"

"وہ جو مضمون میں نے تم کو لکھنے کو دیا تھا۔ کچھ کامیابی ہوئی؟"

"جی اومادی۔ پوری کامیابی۔"

"گڈ۔" اومارائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سرکار سے مخاطب ہو گئیں اور کچھ
 بیک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ "بنوئے بابو۔ میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر
 آئی تھی۔ دراصل۔"

"کہئے۔"

"میں ہفتہ بھر کے لئے کو میلا میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو دیپالی کو اپنے
 محلے جاؤں۔ اس کا کالج بند ہوا ہے۔ ذرا یہ بھی سیر تفریح کر لے بے چاری۔"

ڈاکٹر سرکار چپ ہو گئے۔ مگر اپنی قدامت پسندی کے باوجود وہ ایسی اعلیٰ خاندان اور بلند سیرت

خاتون سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ تنگدستی کی وجہ سے وہ دیپالی کو کسی قسم کی ہیر نفیر نہیں کرا پاتے۔

اب تینوں لڑکے اندر آچکے تھے۔ اور کان لگا کر مکالمہ سن رہے تھے۔
 ”ہم بھی چلیں گے۔“ چھوٹے دونوں نے شور مچایا۔

”تمہارا میچ ہے۔ کیسے جاؤ گے؟“ دیپالی نے اندر سے نکل کر ڈانٹا۔
 ”تو گویا پروگرام پہلے سے بن چکا ہے۔“ ڈاکٹر سرکار نے کہا۔

”پرسوں پرسوں اُمدادی نے ذکر کیا تھا۔“ دیپالی نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں چلی جاؤں بابا؟“
 ”جاؤ۔ ہواؤ۔ کیا آج ہی جارہی ہو؟“

”جی ہاں۔ رات کے اسٹیمر سے داؤد کندی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اچھا۔ دیپالی تم تھوڑا سا سامان باندھ لو۔ میں قیصر پہر کو کار بھیج دوں گی۔“ اُمدانی نے کہا اور ڈاکٹر سرکار سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

دیپالی نے اچانک اپنے باپ پر نظر ڈالی۔ بابا بدلتوں بعد، خلاف معمول ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنی آسانی سے اجازت دیدی! بابا۔! تم پر اُمدادی کا جادو چل گیا! کو میسلا کی رہنے والی ہیں۔ ضرور کوئی منتر جاتی ہوں ہوگی۔ سارے کامیڈ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اب دیکھو کس طرح بابا کو منٹوں کے اندر شیشے میں اتار لیا۔ بے چارے بابا۔ اس نے ناسف سے پوچھا۔ امدادی کی زندگی میں سیاست کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش بھی ہوگی؟ اُس نے سراٹھا کر اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا، جس کے نیچے امدارائے کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر سرکار سے مخاطب تھیں اور بار بار حسب عادت عینک اتار کر آنکھیں جھپک کر ڈاکٹر سرکار کو دیکھتی تھیں اور پھر عینک پٹو سے صاف کر کے لگا لیتی تھیں۔ امدادی کی آنکھیں بڑی بڑی اور سرگین تھیں۔ کاش بابا اُمدادی دی۔ لیکن کوئی ٹنگ نہیں ہے۔ امدادی بڑی سخت دل معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اتنی نرم دل بھی ہیں۔

امدارائے کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں لپچی کیس پیک کرتے ہوئے وہ دیر تک یہی سب سوچنے میں ایسی کھوئی رہی کہ آنے والے دنوں کے خطرے اور نزاکت کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے امدارائے کی کار آگئی۔ دیپالی دروازے کا چھوٹا سا بستر اور لپچی کیس اٹھائے چند رنگ سے نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔

کلتوم آیا

سارے چار بچے شام مشن کمپاؤنڈ کا بورڈ اور معتبر چوکیدار جو ذلت اپنے ہمراہ کلتوم آیا کو لے
 ڈی ایمز دوس پہنچا۔ میم صاحب ابھی سو رہی تھیں۔ صاحب کچہری سے نہیں آیا تھا۔ لیلا بتی سامان
 سے زلف گنج جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے کلتوم بی بی کو اندر بلایا۔ اور کام سمجھانے میں مصروف
 تھی۔ کوٹھی کے سامنے کمرے دکھائے اور اس کے فرائض سے روشناس کیا۔

”شام کے ٹیم۔“ لیلا بتی اپنا انگوٹھا اٹا کر منہ تک لے گئی۔ ”صاحب، میم صاحب دھت ہو
 تے ہیں۔ اس کے بعد چھٹی۔ میم صاحب رات کو کپڑا خود بدلی کرتا ہے۔ بچہ کوئی ہے نہیں۔ صاحب،
 صاحب دونوں بہت شریف آدمی ہیں۔ تم خوش رہے گا۔ ہفتہ دس روز کا تو بات ہے۔“ لیلا اسے
 بے برآمدے کے سرے پر اپنی کوٹھری میں لے گئی۔ کلتوم نے اپنا اچھی کیس چار پائی کے نیچے سرکا دیا۔ کوٹھری
 ، سر کے تیل کی عجیب سی بو لسی تھی۔ اُسے اُنکا ہی سی آئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

شام کی چائے کے وقت میم صاحب نے طلبی کی۔ لیلا اسے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ صاحب
 صاحب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کلتوم نے جھک کر سلام کیا۔

”پہلے کہیں کام کیا ہے؟“ میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

”کلکتے میں میم صاحب۔“

”کدھر کار بننے والا ہے؟“

”میں سگھ۔“ ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔ اس کے پاس رہتا ہے۔“

”ہل۔“ پادرے کی لڑکی نے یہ آیا بھی ہے۔ آئی تھنک شی دل ڈو۔“ منر کینٹ دیں۔“

بہر کو مخاطب کیا۔

ولیم کینٹ دیں نے بے پرواہی سے سرخم کیا اور اسٹیشن میں پڑھنے میں مصروف رہے۔

مٹوم بی بی نے اپنی مستعدی اور خدمت گزاری سے فریڈا لینٹ ویل کو مٹوموں میں رام کر لیا اور فریڈا لینٹ ویل کو خاصی سیدھی تھیں۔ فوراً اس کے آگے لیلابتی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ کاہل اور کام چور ہے۔ دن بھر سوتی ہے۔ یاد دے کی بیوی کی سفارش پر اتنے دنوں سے رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ گاؤں سے واپس نہ آئے تو تم نہیں رہنا کھل سکتے۔

کٹوم نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میم صاحب کے پاؤں دبا دی رہی۔

وہ پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔ بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مذہبی کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا نواب پورے میں سائیکلوں کی دوکان پر نوک تھا۔ مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھو اس چنانچہ کٹوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔

”کرسمس ایو“ کی وجہ سے وہ شام ہی مصروف اور ہنگامہ خیز گزری۔ کٹوم رات گئے تک کام میں لگی رہی۔ دوسری صبح بڑا دن تھا سویرے ہی سے سامنے کا برآمدہ ڈالینوں سے بھر گیا۔ اور سلام کے لئے آنے والے ہندوستانیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام کو صاحب لوگ آئے۔ وہ دن بھی مصروف گزرا۔ تیسرے روز کلکتے سے مہمان آنے والے تھے۔ عبدالغفور بڑے دن اور مہمانوں کی آمد کی وجہ سے کام کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے تو کٹوم نے ان سے کہا۔ ”چچا لاؤ جھاڑ پونچھ میں کئے دیتی ہوں۔ اتنے میں تم کٹلری صاف کروالو۔“ بنگلے پر ان گنت ملازم تھے۔ مگر گول کمرے صاحب اور میم صاحب کے کمرے اور کھانے کے کمرے کی صفائی عبدالغفور خود کرتے تھے جھاڑن کندھے پر ڈال کر عبدالغفور پیچھے پر ہاتھ رکھ جھکے جھکے سینٹری کی طرف چلے گئے۔ پچھ واپس آکر انہوں نے کٹوم سے کہا۔ ”سب چیز بہت اچھی طرح جھاڑنا۔ میم صاحب گرد کا ایک ذرہ بھی دیکھ لیں تو مار ڈالیں گی۔“

میم صاحب صبح کے ٹیم ملنے لانے باہر جا چکی تھیں۔ کٹوم ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے صاحب کے دفتر کے کمرے میں گئی۔ جس کے سب دروازے اندر سے بند تھے۔ اس نے صاحب کی میز کے کاغذات سنوارے، فائیل سلیپ سے رکھے۔ ایک آدھ دراز جو آدھ کھلی پڑی تھی اُسے

بھی بھٹیک کر دیا۔ اور آدھ پون گھنٹے تک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔
میم صاحب کی واپسی سے ذرا قبل وہ ان کے ڈرائیونگ روم میں آکر ان کے کپڑوں پر استری کرنے
میں مشغول ہو گئی۔

ہمان کلکتے سے رات کو پہنچے۔ اس وقت کلثوم اپنی کوٹھری میں جا کر سو چکی تھی۔
بریک فاسٹ کی میز پر اس نے سٹرگلرٹ پلوئر انسپکٹر جنرل پولس اور ان کی میم کی جھلک دیکھی۔ مگر
ڈرائیونگ روم میں اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ناشتے کے بعد میم صاحب نے اس سے کہا کہ مسٹر پلوئر کے پاس
جائے۔

چنانچہ وہ گیسٹ روم میں پہنچی اور جھک کر سلام کیا۔ مسٹر پلوئر ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون
تھیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ مسٹر پلوئر کا رڈی ابھی کمرے میں نہ آیا تھا۔ کلثوم نے
بھوبی کو بلایا۔ سفر کے کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے مسٹر پلوئر نے گنگنائے گنگنائے سارا سامان تپڑ
رہا۔ بہت سے سرکاری کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ کلثوم نے سلیقے سے ان سب کو سمیٹ کر ایک طرف
بکھ دیا۔

”گڈ گرل۔“ مسٹر پلوئر نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ کیل کٹا چلے گا؟“ (مسٹر کینیٹ ویل نے

ان کو بتا دیا تھا کہ یہ آیا عارضی ہے)

کلثوم نے شرمناک منہ میں پلوٹھوئیس لیا۔ ”میم صاحب ہمارا سادی ہونے والا ہے۔“
”سادی! دیر ہی گڈ۔“ کوٹھل ٹم۔ یہ صاحب کا بکسا ادھر رکھو۔ اس میں بڑا جردری کا گج
بکھا ہے۔ صاحب اس کی چابی مانگے گا تو ہم کو آکر لوٹنا۔ چابی ہمارے اس نیلے بیگ میں ہے۔ بھٹیک ہے؟
”بھٹیک ہے میم صاحب۔“ کلثوم نے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد مسٹر کینیٹ ویل اور مسٹر پلوئر مشرب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرائیونگ
روم کے دروازے اندر سے بند کئے آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے کلثوم برابر والے
نڈھیرے کمرے میں ہی موجود تھی جس کا دروازہ پہلے سے کھلا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پکارا۔ ”کوئی ہائے۔“

کلثوم دیے پاؤں پیڑی میں گئی۔ جہاں عبدالغفور عشاء کی نماز میں مصروف تھے (میم صاحب

اور مسز پٹو مر اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکی تھیں) صاحب نے دوبارہ آواز دی تو کلثوم بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم کے گیسٹری والے دروازے پر پہنچی اور دستک دی۔ صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ ذرا جھنجھپ گئی۔ مگر اس نے فوراً کہا۔ ”صاحب عدل نماز پڑھ رہا ہے۔ کیا کام ہے؟“

”تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو کھل سُم۔“ مسٹر کینٹ ویل نے پوچھا۔ ان کا چہرہ تیار تھا۔

”میں میم صاحب کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صاحب۔“

”اوہ اچھا۔“

کلثوم نے ایش بڑے خالی کی سیکرٹ کابینا میں کھول کر مہان کے قریب تپائی پر رکھا۔ اس دوران میں دونوں صاحب لوگ پھر گفتگو میں محو ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو دفعتاً مسٹر پٹو مر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور شگفتگی سے کہا۔ ”آئی سے آئی۔ دس اے پری گری۔“ کلثوم ہڑٹا کر گیسٹری میں پہنچی اور سر پٹ دوڑتے ہوئے اپنی کوٹھری میں جا کر کھاٹ پر لیٹ رہی۔

مسٹر پٹو مر صوبے کے اعلیٰ پولیس اور سول حکام کی ہنگامی کانفرنس کے لئے دھاکے آئے تھے۔ ایک روز ایک اہم میٹنگ ڈی۔ ایم کے بنگلے پر بھی ہوئی۔ جس میں بیرسٹرا کے سالے دھرم چندر موہن سین ڈی آئی جی بھی شامل تھے۔ بنگلے پر پولیس والوں اور سی آئی ڈی والوں کی ریل پل تھی۔ کلثوم مستعدی سے اس دوران میں مسز پٹو مر کی حاضری میں رہی اور بڑی تندہی سے مہانوں کی خدمت میں مصروف رہی۔

کلکتے واپس جاتے وقت مسز پٹو مر نے اس کو دس روپے بخشش دیئے۔

دسویں دن ییلابتی اپنے گاؤں سے واپس آگئی۔ آتے ہی اس نے کلثوم کے کان میں کہا۔ ”مافی یار نہیں تھی۔ مجھے بیانے سے بلوایا تھا۔ ورنہ میم صاحب جتنی دیتیں۔“

جس دن ییلابتی ڈی۔ ایم کے بنگلے پر اپنی ڈیوٹی بجانے واپس پہنچی۔ اسی روز شام کو امارائے کی موٹر دیا آئی سرکار کو پہنچا۔ ہنس بھڑکائی۔ دیپالی نے ڈاکٹر سرکار کو بتایا کہ اس نے گومیلا میں امارائے کے گھر بھی ہاؤس میں بید خوشگوار وقت گزارا۔

۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناگر بندی کر کے ریحان الدین احمد اور اس کے
 اہلیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پولیس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھی وہاں سے غائب
 چکے تھے۔ اور اب کی مرتبہ وہ ایسے غائب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس اُن کو تلاش کرتے کرتے عاجز
 رہی۔ مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑنا لگیا۔ ہندوستان
 پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ بنگال میں ریحان الدین احمد اور ان کے ساتھیوں کی تلاش بھی تیزی
 سے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔
 لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا طریقہ اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا
 تقسیم ہوتا رہا۔

۱۰

ویشنو بیراگی

کلب ترودو دیا لاکا وہ درخت ہے جو سمندر منتھن سے نکلا تھا اور اس کے پھولوں میں اپنی
 مٹی کے مطابق کوئی سی بھی خوشبو سونگھی جاسکتی تھی اور جو ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔
 شانتی نکیتن میں برہمچندر کے پاس ایک پرانا برگد کھڑا ہے۔ دیپالی سرکار سے اپنا کلب ترودو سمجھتی
 ہے۔ کیونکہ ایک روز اس درخت نے بڑے انوکھے اور غیر متوقع انداز میں اس کی ایک خواہش پوری کر دی۔

ایسٹرن ریوے کی صاحب گنج لوپ رائن پر کلکتے سے شومیل کے فاصلے پر سنھال پرگنہ کے
 نزدیک بولپور ایک جگہ کا نام ہے۔ بولپور آج سے سو برس پہلے اپنے ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ
 اس علاقے کی کنکریلی زمین میں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے ڈاکے ڈال کر پناہ
 لیتے تھے۔ وہ چھری، جس سے یہ ڈاکو مسافروں کا گلا کاٹتے تھے بول لکھاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس دیوانہ
 نام بولپور پر گیا تھا۔

ہمالیہ پر شانتی کی تلاش سے ناکام لوٹنے کے بعد ایک مرتبہ مہارشی دیویدر ناتھ ٹیگور زیندار سنھال

ملنے پانگی میں بیٹھے رائے پور جا رہے تھے۔ جب بولپور کا یہ سلسلہ پہنچا تو اس میں پڑا۔ اس میدان میں ہمارے
کو ایک بڑا سایہ دار درخت نظر آیا۔ انہوں نے پانگی وہیں رکوالی اور درخت کی چھاؤں میں تالین بچھا کر رات
میں صرف ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ”یو دیو دگر دیو پتو شوم بھون ما دیویشہ یہ او شہ صی شو یو پتو
شو تسمی دیو ابھونماہ“ والی ویدک حمد پرائی اور ہمارے کو اس درخت کے نیچے وہ شانتی مل گئی جس کی
کھوج میں وہ سارے ہندوستان میں گھومتے تھے۔

انہوں نے رائے پور جا کر زمیندار سنا سے یہ علاقہ خرید لیا۔ درخت اور باغ لگوائے۔ ڈاکوؤں
نے ڈاکہ ڈالنے سے تو یہ کی۔ اور ۱۸۶۳ء میں ہمارے نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن
آشرم قائم کیا۔ شانتی نکیتن ولا تعمیر کر والی اور یہاں رہنے لگے۔ برگو کے اس درخت کے نیچے انہوں نے ایک
مرمرین معبد بنوا کر اس کے پھاٹک پر لکھوایا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

اس درخت کے نیچے ہمارے کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہندو قدیم کی جھلک کی در سگا ہوں کی طرز پر بنے ہوئے دارالعلوم و شوا بھارتی
انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور وار دھا
آشرم، نہرو اور آئند بھون اور شیگورا و شانتی نکیتن والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی
نازک موڑ پر لاکھڑا کیا ہے اور گو شانتی نکیتن کی فضا میں ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور نغمہ بار ہیں۔ اور گرو
دیو ابھی زندہ ہیں۔ اور ڈاکٹر نند لال بوس اور اجندر ناتھ شیگورا اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے دوسرے
عظیم مقصور کلا بھون میں موجود ہیں۔ مگر بیرونی دنیا کے معاملات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام شانتی عیسن کی ایک نئی طالب علم تھرڈ ایئر کی دیپالی سرکار برگہ
بچے بیٹھی سر میں بھانگ پر منقش ان سمر انگیز الفاظ پر نظر ڈال کر سوچ رہی تھی۔ کمال ہے ہمارے
آسانی سے یہ کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ مگر مبارشی کبھی بیس برس کے بھی تو رہے ہوں گے۔
اپنی نوٹ بک بند کر کے وہ برگہ کے پتوں کی ناؤ بناتے بناتے سوچنے لگی۔ کھپ تر داز زندگی
پتے گرنے جا رہے ہیں۔

”اکھ زمن۔“ دور سے آواز آئی۔ اُس نے چونک کر جگل کی طرف دیکھا۔ دور ایک
ادی پر چند دیشویراگی لغو لگاتے تیز چلے جا رہے تھے۔
اور دیپالی کو یاد آیا کہ یہ ہیر جوم ہے۔ چنڈی داس کی سرزمین۔ اس نے جبک کر مرنے والی پر لٹھ
دیا۔ چنڈی داس کی سرزمین۔

وہ کتابیں سمیٹ کر ہوٹل واپس جانے کے ارادہ سے اٹھنے لگی۔ مگر اچانک سامنے پکڑ پکڑی ہیر
کھڑکھڑائے۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمبی سیاہ دارمھی اور سیاہ زرخوں والا دیشویرا
اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سنیا سی کو پر نام کیا۔ تب اُس فوجوان ہیراگی نے جڑی
تگی سے کہا۔ ”دیپالی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں، ہمیں گلتا ہے تمہیں روحانیا کے
ن کی اشد ضرورت ہے۔“

دیپالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ جوتے پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر اس نے
لے میں سے بیگٹ نکال کر بجایا مگر فوراً ہی بکھار دیا۔

”بچہ۔ ہم تجھ سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی ہے۔ اور ہم تیری پیادری کے
ت قائل ہو گئے ہیں۔ تو واقعی کمال کی لڑکی ہے۔“

دیپالی نے بھوس جوڑ کر کہا۔ ”آپ۔“

”ہاں بیا۔“

دیپالی سر اسیٹ ہو گئی۔ ”آپ کو اس قدر ریک لیس نہ ہونا چاہیے۔ اب میں کسی کی ایادیا بننے نہیں
سکتی۔“

”ریک لیس۔“ یہ شانتی نکلتی تو اپنا پرانا اٹھ ہے بچہ۔“

ہر گز کے نزدیک مر مر یہ عبادت گاہ میں کسی نے چراغ جلادیا۔ پھر قدموں کی چاپ دور ہو گئی۔
 ”تو پلو جا پارٹ نہیں کرتی بٹیا۔“

دیپالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنیا سی نے پھاٹک پر لکھے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالی اور انہیں
 آہستہ سے دہرایا۔ پھر وہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔
 ”آپ۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت یہاں مل جاؤں گی؟“ چند لمحوں بعد دیپالی
 سرائٹھا کر اس سے پوچھا۔

وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور دفعتاً ہنس پڑا۔ ”اپنے علم کے زور سے۔“ پھر کچھ توقف کے
 بعد اس نے کہا۔ ”میں تیرے متعلق سب معلوم رہتا ہے۔ بچہ ہم جانتے ہیں کہ تو روز شام کو یہاں بیٹھ کر ان
 ہوم درک کرتی ہے۔“

”تو بتلائیے اب میرے لئے کیا کام ہے۔“ دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔
 ”کیا ہم کسی کام کے بغیر تجھ سے نہیں مل سکتے۔“

سنیا سی نے اطمینان سے جواب دیا اور چپو ترے پر اکی پاتی ماسے بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں اُس
 کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔

ہوا کے ایک جھونکے نے سرائٹ میں لگے ایک درخت کے سرخ پھول چپو ترے پر کھیر دیئے بہت
 دور پر سال کے درختوں کے ابونہیں گرد دیو کسی سے باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔
 ”گرد دیو جا رہے ہیں۔“ سنیا سی نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دیپالی بھی چپو ترے پر
 سے اٹھی۔ گرد دیو اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا کہ یہ شام سفر دہے۔ پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔
 سنیا سی نے جھولے میں سے نکال کر گھڑی دیکھی اور پہلی دفعہ بخند لگی سے کہا۔ ”شوکتی، تو تمہیں
 ایک کام بتا ہی دیں۔“

دیپالی نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ ”میرا نام دیپالی ہے۔“
 ”ہاں، لیکن تم میری شوکتی ہو۔ دیپالی میں تمہیں شکتی ہی پکاروں گا۔ چلو جلدی سے ایک اور کا“

رد و تھوڑا سا۔

دیپالی گم سم کھڑی رہ گئی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”کہئے۔“ اُس نے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں کہیں سے میگریٹ لادو۔ ہمارے پاس ہی ایک میگریٹ بچا ہے اور بہت دور جانا ہے۔“

”بہت اچھا۔ لیکن آپ محض میگریٹ لینے۔“

”ہم نے کہا تو ہم تمہیں درشن دینے آئے تھے بچہ۔“

”میگریٹ کے علاوہ اور کچھ تو نہیں چاہئے؟“ دیپالی نے فکر مندی سے دریافت کیا۔ اور سنبھلی کے سنجیدہ لہجے سے بید گھرائی۔

”فی الحال نہیں۔“ وہ پھر چوتھے کے کنارے پر ٹپک گیا اور بڑی گنجبھراؤ میں کہنے لگا۔

”دیپالی۔ میں اس لئے آیا تھا کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تک تم میرے لئے تحفے ایک اور رابطہ“

محض ایک اور نام رہی ہو۔ یاد دہند کے میں سُنی ہوئی ایک اور آواز۔ تمہارے گھر پر بھی۔“

”میں آپ کا میگریٹ لے آؤں؟“ دیپالی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

”ہم سے ڈرو مت بچہ۔ ہم ایک بہت شریف سادھو ہیں۔“

دیپالی ہنس پڑی اور ایک لمحت اسے اُمارائے کی ڈانٹ یاد آئی۔ اسکول گرل گنگلز۔ اور

اُمارائے کے خیال نے اسے اچانک بیدار دل گرفتہ اور پریشان کر دیا۔

”تمہارے صاحب اور میم صاحب کیسے ہیں؟“

”اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ چارلس بار نو آئے ہیں۔ ریلوے نمبر جی کے ان سے بھی بہت اچھے

تعلقات ہیں۔ کیونکہ مسٹر بار نو کی بڑی مہین بار سیال میں مشنری ہیں۔ چانگام سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔“

”روز کی خیریت سے ہے؟“

”جی۔“

”کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”اسے خط لکھ کر پوچھو کہ چارلس بار نو کھلنا کس روز پہنچ رہا ہے۔ چارلس بار نو کے نام کا کوڈ یاد

ہے۔؟ ” وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی ہاں۔“

”بتاؤ تو۔“

دیپالی نے بتلایا۔

”وڈرفل۔“ سنیا سی نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گھر اگر چل دی سے

بٹایا۔

”اُوما سے کب سے نہیں ملیں؟“ سنیا سی نے دیپالی کا رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اُوما

کا نام جس انداز سے لیا تھا۔

”آپ لوگوں کے غائب ہونے کے دوسرے ہفتے ہی تو وہ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ابھی تک وہیں ہیں

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کے ساتھ کلکتہ گئی تھی۔ گانے دیکھا کر دانے۔ مگر اُوما دی سے ملاقات نہ ہو

سکی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور انہوں نے مجھے کوئی خط پتہ بھیج بھیجا نہیں۔ وہ کلکتہ میں کسی کالج

میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ بالی گنج میں رہتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چونکر پارٹی کی باقاعدہ نمبر

اس لئے۔ انڈر گراؤڈ میں گئیں نہ حیل۔ بھیک ہے نا؟ اور سنا ہے کہ ان کے ڈکا آئی جی ماموں نے گورنمنٹ

کونسلٹنٹ دی ہے کہ وہ گڑ بڑ نہیں کریں گی۔ آپ کو تو یہ سب معلوم ہی ہوگا۔“

”ہاں۔ معلوم ہے۔“ پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ اچھا جاؤ۔ بھاگو۔ سگریٹ لے کر آؤ۔ جو

بھی ملیں۔“

”آپ اس راستے پر جائے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”اچھا۔“ سنیا سی چلنے لگا۔ پھر ہٹھک گیا۔ ”ایک بات اور۔ کینیٹ ویل تازہ وارد اور

تاجر بہ کار نو جوان تھا۔ بارہ لوہا ناگھاگ ہے۔ اس کے باپ دادا تک جنگل سولین تھے۔ اس چیز کا تم لوگ

خیال رکھنا۔ بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ٹریسٹ تحریک کے زمانے میں کئی نو جوانوں کو پھانسی کے تختے پر بھجوا

چکا ہے۔“

دیپالی کو پکیپی سی آئی۔ سنیا سی کہتا رہا۔ ”روزی سے کہنا بچا احتیاط سے کام لے کر میں اطلاعات

پہنچوائے اور اپنے باپ کو کسی طرح ناراض یا ناخوش نہ کرے۔ یہ سید مزدوری ہے۔“

”بہت اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ سیاسی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔ دیپالی بھاگتی ہوئی
اس کی طرف چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور برگد کے سسنان چبوترے پر ایک نظر ڈال کر سال کے ایوارڈ
نا شروع کر دیا۔ سیاسی سر جھکائے آہستہ آہستہ کلا تھون کے سامنے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔
نے پھولی ہوئی سانس سے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”لیجئے۔“
سیاسی نے ہلٹ کر دیکھا۔ ”ادہ تعینکس۔“ اس نے بڑی خوشی سے سیکرٹوں کے سپیکٹ
جھولے میں گواہ دیتے اور مسکرایا۔

اب چاند طلوع ہو رہا تھا۔
بہت دور سے ”الکھ نرنجن“ کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے سمندر کے سریلے شور کی مانند
بیاد ولایتی جھاؤ کی نازک ڈالیاں ہوا میں سرسراہی تھیں شیشم کے جھنڈ کے پرے طلباء کے جھینڈوں
شنایاں جھلکائیں۔

دیپالی سر جھکا کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ مٹی میں کانچ کی سرخ چوڑیوں کے چند ٹکڑے چمک رہے
اس نے انگلی سے کی نوک سے ایک ٹکڑے کو چھوا اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ باڑ پھیل سیل پر سے ایک
اچھل کر پتوں کے اندر چلا گیا۔ دور سری سدا میں چند لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا تھا سرتائی ڈانکے
نی گود ڈانکے آئی آئی۔

”یہاں اوٹل کمارد اس تہ سے رابطہ رکھے گا۔“ سیاسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”بہت اچھا۔“

”سنتھال پر گنہ سیاسی لینے کے لئے آئیڈیل جگہ ہے۔ مگر ہم یہاں سے بھی ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر
کر گئے ہیں۔ اگر ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تیار رہنا۔ شوکتی۔“

”بہت اچھا۔“

قریب سے چند سنتھالی عورتیں سر پر ٹوکڑے اٹھائے گزر گئیں۔ ان کے پیچھے طلباء کی ایک ٹولی ٹپلتی
ا رہی تھی۔

”اچھا۔ جیتی رہو۔ خوش رہو۔ ہم جاتے ہیں۔“ سیاسی نے منانت سے اسے آخیر وادی اور تیزی

سے آگے بڑھ گیا۔

دیپالی اُسے چاغنی کے خشک دھندلکے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔
برگد کا چبوترہ اب بھی سفنان پڑا تھا۔ آج شام۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ کاش۔۔۔ اُس نے
ایک پتہ اٹھا کر ناک سے چھووا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔ کلب ترد!۔
پھر اس نے درختوں کے اس جھنڈ کا چکر لگایا۔ برہمہ معبد میں چراغ سکون سے جل رہا تھا۔

آمار پرانیر آرام

مومیر آئند

آتما رشتا

اس نے چپکے سے دل میں دہرایا۔ اور دل ہی دل میں مسکراتی مسرور روئی بنرجی کو خط لکھنے
کے لالہ سے سے اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۱

لیلی کاٹج

لیلی کاٹج میں سہ پہر کی چائے کے انتظامات بڑے زور و دل پر کئے جا رہے تھے۔ ایستھر بنرجی کیکر
پر سفید اور گلابی آئینگ کر رہی تھیں۔ ڈیزی آیا سینڈوچ بنانے میں مشغول تھی۔ گلڈانوں میں تازہ بھول لگے
تھے۔ سنگ روم میں کلاس اسٹیمپ کی نفیس کڑھت کے دھلے ہوئے ٹیبل کا تھمیزوں پر پڑے تھے۔ چائے کا نیا
سیٹ سلہٹ کی سید کی کشتی میں سجا دسلی میز پر رکھا تھا اور اس پر ہری کانچ کے مٹوں کی جھار والی بڑی
جالی ڈھانپ دی گئی تھی۔ مٹی کوڑی اور کشتیوں کی کشیدہ کاری قابل دید تھی۔

پادری بنرجی سیاہ سوٹ پہنے ذرا متفکر سے برآمد ہوئے ہیں رہے تھے۔ مادر بار بار واسکٹ کی
جیب سے زنجیر والی گھڑی نکال کر دیکھ لیتے تھے۔

روزی اپنے کمرے میں دروازے بند کئے پتختیاں لگائے قلعہ بند بیٹھی تھی۔

ٹھیک چار بجے گھوڑا گاڑی سامنے آن کر لی اور پادری ہنری لبواس، مسز لبوی لبواس، اُن کا فریڈ

مسٹر لوتھر بسواس اور چھوٹی لڑکی ایڈتھ بسواس نیچے اترے۔ ایڈتھ بسواس نے ایک اٹھی کیس اٹھا دکھا تھا۔

ایستھر بنرجی لپکی ہوئی باہر آئیں۔ اور دونوں میاں بیوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سنگ دروم میں لے کر آئے۔ بسواس خاندان ذرا سیلف کانشس سا ہو کر کرسیوں پر گکا۔ پادری اور مسٹر بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس صوفے پر ایک قطار میں اس طرح سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھینچوانے کے لئے فوٹو گرافر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایڈتھ البتہ اطمینان سے گراموفون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مسٹر بسواس نے ناقدانہ نظروں سے گھر پر نظر ڈالی جو گھر کی عزت، مگر سیلف کائنات وار تھا۔ دونوں کالے پادریوں نے آپس میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔

”یکشن میری روزی نے کاٹھے ہیں۔“ ایستھر بنرجی نے مسٹر بسواس کو صوفے کے کشوں کا ذریعہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً کہیا

مسٹر بسواس اخلاقاً سکرائیں۔ انہوں نے یہ بھی نوٹس لیا کہ ایستھر بنرجی گلے میں ایک سید تیلی سنہری زنجیر کے علاوہ سونے کا ایک بھی زیور نہیں پہنتے ہیں۔ اور سرخ کنارے والی سفید رنگالی ساڑھی میں ایک جگہ پر باریک کھونپ بھی بھری گئی ہے۔ خود مسٹر بسواس کردشیا کی چوڑی لیس والے سفید پٹی کوٹ کے اوپر تیز گلابی جاسٹ کی ساری باندھ کر اور سیاہ ساٹن کا بلاؤن پہن کر آئی تھیں اور سونے کی چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں چھاپ رہی تھیں صبح سارا مال ایک آستین میں گھس رکھا تھا۔ کانوں میں ایک ایک بوقی والے بوندے پہنے تھیں ہندو سالہ ایڈتھ اودے ریشمی فراک میں ملبوس تھی۔ سفید موزے، کالے جوتے بن بیا ہی دیسی عیسائی شریف زاد یوں کی مانند فراک پر ڈوپٹہ بھی اڈھ رکھا تھا۔ پادری بسواس سیدھے سادے آدمی معلوم ہونے لگے اور ظاہر تھا کہ بیوی ان پر حاوی ہیں۔ لوتھر بسواس ایک منحنی مسکین صورت اور شرمیلانوجوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے پورے سوٹ میں ملبوس تھے۔ پچھلے کرسمس دیک میں آل انڈیا مشنری کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب لوتھر بسواس پنجاب واپس گئے تو روزی بنرجی پر عاشق ہو کر واپس گئے تھے۔ وہ لدھیانہ میں مشن اکول میں سائنس ماسٹر تھے۔

ایک دو سال بعد سینٹ جانز کالج آگرہ میں لیکچرر ہو کر جانے کا ”چانس“ بھی تھا۔ انہوں نے لدھیانہ واپس جا کر کچھ عرصے بعد اپنے باپا یورنڈ بنری بسواس کے ذریعے پادری بنرجی کو شادی کا پیغام بھیجایا تھا۔

ایسی عیسائی فرقہ میں اچھے لڑکوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ عیسائی لڑکیاں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اساتذہ ہو جاتی ہیں۔ بیشتر عیسائی لڑکے ایٹنو گرافیا سیمین سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس وجہ سے عیسائی لڑکیاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں سے شادی کر لیتی ہیں۔

چنانچہ جب لوتھر بسواس کا پیغام آیا تو پادری بنرجی خوش ہوئے۔ جب سے روزی بڑی ہوئی تھی انہیں اس کے بیاہ کی فکر نے آگھیرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی جیسو میٹلپنے گھر ملی جائے۔ انھوں نے روزی سے تذکرہ کئے بغیر اپنے بیوی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد خالص ہندوستانی ناں باب کی طرح پیغام منظور کر لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی خواہاں بردار اور سعادت مند بیٹی کو ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ پادری بنرجی کی خواہش تھی روزی کا رشتہ کسی ہم پلہ برہمن کرسمین خاندان میں ہوتا۔ روزی ماں اور باپ دونوں ہی طوط سے نجیب الطرفین کھین برہمن زادی تھی۔ مگر آج کل خاندانی لڑکے طے کہاں ہیں۔ اور پادری بسواس بھی ابھی ذات کے آدمی تھے (حالانکہ بسواس عموماً خٹہ ولڈ کاسٹ والوں کا نام بھی ہوتا تھا) ان کے مشنری باپ دادا بنگال سے جا کر لہیانے میں سیٹل ہو گئے تھے۔ پادری بسواس کو نکالی زبان بھی نہیں آتی تھی کیونکہ ان کی ماں پنجابی تھیں۔ خود تیری بسواس بھی پنجابی تھیں اور واقعی اپنے انداز اور وضع قطع سے کچھ چمکشین معلوم ہوتی تھیں۔ مگر بہر حال بہت معقول خاندان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشنری کانفرنس کے نانے میں پادری بنرجی، لڑکے کی مادات و خصائل سے خود واقف ہو چکے تھے۔ لڑکا انہیں پسند آیا تھا۔ شریف، حلیم الطبع اور سید مذہبی نوجوان تھا۔ روزی کو بڑے آرام سے رکھے گا۔ پچھلے ہفتے پادری بسواس کا خط آیا تھا کہ وہ اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھنے اور بات چتی کرنے کے لئے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ اور روزی کو جب البتھر بنرجی نے یہ اطلاع دی تھی تو ایسا لگا تھا، جیسے اس کے اوپر ہم کا گولہ آن گرا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس لمحے سے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ (دیپالی اتنی دد رشتہ اتنی نکیتن بھی تھی جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ سکتی۔ جہاں آرا کے پاس وہ اپنا دکھڑائے کر جانا نہ جاتی تھی) اس کی اس خاموشی کو اس کے والدین نے بچپن کی شرم و حیا پر محمول کیا تھا۔ کس لڑکی کو میکے سے اتنی دیر کا لے کو سوں بیلہ جانے کا غم نہ ہوگا۔

لیکن آج جبکہ بسواس میلی واقعی آن پہنچی تھی۔ روزی نے بڑا ہی عجیب اور غیر متوقع رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک تودہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اور پھر صبح سے اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔ پادری بسواس نے اپنے

قاندان خنجر میں اپنے کسی دور کے رشتے دار کے یہاں اترے تھے۔ اور ٹھیک چار بجے لٹی کاٹچ پہنچ گئے تھے۔ اور بابا داری اور سرسبز جی کو روزی کے متعلق پہلی بار گھبراہٹ شروع ہوئی۔

ڈیزری چائے دانی لے کر کمرے میں آئی اور الیٹھر بنرجی نے رس گئے اور چم چم ملائی جواہروں نے وود بنا۔ تیرے تھے ہمالوں کو پیش کئے۔ وہ بے چاری ہونے والے دامادی بے انتہا خاطر کر رہی تھیں اور ابھی سے اُن واس کے بھونے پن اور شرافت پر ماتا بھرا پیار آنے لگا تھا۔ مگر مسز لبواس بڑی خوفناک ساس ثابت دل گئی۔ اس کی انھیں پریشانی تھی۔

روزی کا کمرہ ڈائینگ روم کے دوسری طرف تھا اور سنگ روم میں سے اس کا بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔ درمی بنرجی ہمالوں سے باتیں کرنے کرتے بچپن سے اس دروازے پر نظر ڈال لیتے۔ دروازے پر پڑا نیلا پردہ ہوا میں رائے جا رہا تھا۔

”روزی سسر کیا ہیں؟“ ایڈتھ لبواس نے نزاکت سے سینڈوچ اٹھا کر تھینک یو آئی کہنے کے سرسبز جی سے دریافت کیا۔

”ابھی آتی ہے۔ ذرا اس کی طبیعت —“ الیٹھر بنرجی نے یک بخت ذرا ہکا کر بے بسی سے اپنے ہر کو دیکھا۔

”کیا ہوائے؟“ مسز لبواس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں ہیں۔ دن رات پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ آج صبح سے سر میں درد ہے۔“

پادری بنرجی نے فوراً پادری لبواس کو میا طب کیا۔

”لدھیانے میں جہنگائی کا کیا حال ہے؟ یہاں تو وار کی وجہ سے۔“

لوٹھر لبواس نے مائی ٹھیک کرتے ہوئے سرگھا کر دزدیدہ نظروں سے نیلے پردے والے دروازے

دیکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ روزی کا کمرہ ہے۔ اور مشنری کا نفرنس کے دونوں میں روزی نے اسی سنگ میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کیرم بھی کھلا تھا۔ اور کیرم کے پاؤڈر کا ڈبہ لانے کے لئے وہ اس کمرے میں بھی ہو تھے۔

”او۔ آنٹی — میں یہ ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں؟“ ایڈتھ نے چائے کی پیالی ختم کر کے گرامو فون کی طرف مڑتے

تھے کہا۔

”مزدور ضرور۔“ مسز بنجی نے کہا۔ وہ بے ساختہ یہ بھی اضافہ کرنا چاہتی تھیں کہ روزی کو میوزک کا بہت شوق ہے۔ مگر وہ چپ ہو گئیں۔ ایڈیٹر فرس ہارڈوں بیٹھ کر میز کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ریکارڈ ملٹے پلٹے لگی۔ زیادہ تر وہ گھیسے پٹے پرانے ریکارڈ تھے۔ جو ایک مرتبہ ڈھاکہ کے ایک انگریز افسر نے ولایت جاتے وقت مشن کپاؤنڈ بھجوا دیے تھے۔

ڈیزی نے جا کر روزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہیں ملا۔

اب چھ بجنے والے تھے۔ مسز بنجی اٹھیں۔ ڈانگنگ روم اور سنگ روم کا دروازہ دروازہ کھٹکھٹا کر روزی کے دروازے پر نوک سے دستک دی۔ ”روزی۔ روزی بیٹے۔ بات تو سنو۔ وہ اب روم لٹی ہو رہی تھیں۔“

مسز بنجی چند منٹ تک دروازے پر کھڑی رہیں۔ پھر سر جھکائے سنگ روم میں واپس آئیں اور شوہر کا مٹیخانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پادری بنجی آہستہ سے اٹھے اور اپنے پیچھے سنگ روم کے کواؤ بند کرتے ہوئے دفن کے دروازے پر پہنچے اور دھیرے سے دستک دی۔

”روزی۔ روزی بیٹا۔ دروازہ کھولو۔ میں تہارا پایا ہوں۔ بات تو سنو۔“ انہوں نے سیدھا جاتے۔
 ہا۔ روزی نے دروازہ کھولا۔ پادری بنجی اندر آ گئے۔

روزی کندھوں پر بال بکھرائے سفید ساری پہنے تصویر کی مانند سامنے چپ کھڑی تھی۔ اچانک اُ کی آنکھوں کے سامنے ایک اور تصویر آگئی۔ بالکل اسی طرح انہوں نے پہلی بار نو جوان ایسٹھری بالاکو دیکھا تھا۔ کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے سفید ساری پہنے رائٹ رپورٹرز ڈرافٹن کی کونٹھی کے برآمدے میں خاموش کھڑی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ اُس ایسٹھرا داس روزی میں اتنا فرق کیوں؟ کیا زمانہ اتنا بدل گیا تھا؟ اُس ایسٹھری آنکھوں میں محض لاج تھی اور سپردگی۔ اس روزی کی آنکھوں سے ہمد اور اس اور خود سری کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اس خود سری کو آج کل کے زمانے میں خود اعتمادی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ تو اپنی ملاؤٹی جی کی بھلائی ہی تو چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے باپ سے اس قدر خفا کیوں ہو گئی؟۔
 ایک سیک روزی آگے بڑھی اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔ ”پاپا۔ پاپا۔ مجھے! کر دیا میں ڈبو دیجئے۔ مجھے مار ڈالے جان سے۔ مگر میں اس چنڈ سے۔ اس۔ اس کاٹھن سے ہر گز نہ نہیں کر دوں گی۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے پاپا۔“ اب وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

کالین۔ پادری بنرجی ہکا بکارہ گئے۔ ”روزی بیٹا۔“ انھوں نے ہڑا کر کہا۔ ”میری
کا تو خیال کرو۔ میری بیٹی۔ لوتھر بڑا اچھا لڑ۔“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“ روزی نے بچوں کی طرح بچل کر دیتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔
”پھر گیا کرے گی۔“ احمق۔ ”پادری بنرجی کو ایک دم غصہ آگیا۔ ”کسی ہندو سے شادی کرے
یہ ارادہ ہے تیرا۔؟ مسلمان سے بیاہ رہ جائے گی؟ اپنی ماں کا حشر بھول گئی۔ بد بخت۔؟“ انہوں نے
رج کر کہا اور ان کو بالکل خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور سنگ روم تک آواز جا رہی ہے۔ انہیں
پر سکون زندگی میں ایسا قیامت خیز وقت بھی دیکھنا پڑا۔ اور اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ خداوند۔ میں نے
ایک گناہ کیا تھا۔ خداوند۔؟

پادری بنرجی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مسز میری بسواس پیچھے آن کھڑی ہو گئی ہیں اور باپ بیٹی کا سارا مکالمہ
سجی ہیں۔ ایستھر بنرجی سہمی ہوئی ان کے عقب میں کھڑی تھیں۔ مسز بسواس کو دیکھ کر روزی فرخندہ سے اٹھی اور
کی طرح غنائی نے میں گھس کر دروازہ زود سے بند کر لیا۔ پادری بنرجی نے مڑ کر مسز بسواس کو دیکھا اور سکتے
عالم میں کھڑے رہ گئے۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد مسز بسواس نے زہریں بھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا
ہم کالین ہیں۔ ہنری۔“ انہوں نے سنگ روم کی طرف مارچ کرتے ہوئے لٹکا رہا۔ ”ہم اپنی انسلٹ
لے لے لے دھیانے سے آئے تھے۔ چلو اٹھو۔“

ایستھر بنرجی روتی ہوئی ان کے پیچھے لپکیں۔ سنگ روم میں آکر انھوں نے کہا۔ ”میں خدا باپ کے
بہیں معاف کر دیجئے۔ روزی بڑی ضدی لڑکی ہے۔ آج کل کی اولاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
بے کیا کہوں۔“

اس دوران میں پادری ہنری بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس ”مٹم“ کھڑے باقی لوگوں کو تنگ رہے
۔ مسز بسواس بلاؤز کی آستین میں سے رمال نکال کر ناک سنکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور شعلہ بار
ہوں سے میزبان خاتون کو گھورا۔ پادری بنرجی اس اتنا رہیں سنگ روم سے گزرتے ہوئے جا کر بائیں
ایک دریں کھڑے ہو گئے تھے اور مڑھکا کر فرخندہ کو دیکھ رہے تھے۔

اب مسز بسواس نے رمال آنکھوں پر رکھ لیا اور آفسو بہانے پر آمادہ ہوئیں۔

”چلو ڈیر۔ واپس چلیں۔“ پادری بسواس نے آگے بڑھ کر نرمی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسز بسواس نے غصہ سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور چلاتے ہوئے بولیں۔ ”ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ لدھیانے سے چل کر راجکمار کی کوئی دیکھنے آئے۔ آپ نے خود بلا یا تھا۔ چار آدمیوں کا انٹرکلاس کرایہ۔“

”اوہ شٹ اپ مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کوفت کے ساتھ کہا۔ لوٹھر بسواس چھٹا کو تک رہا تھا۔

”چار آدمیوں کا انٹرکلاس کرایہ۔ لدھیانے سے ڈھاکے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ آپ کی طرح چرچ فٹ کارڈ پر یہ نہیں کھاتے“

”اوہ کیپ کو اٹ ماما۔“ لوٹھر بسواس نے انتہائی خفت اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ والا کو خاموش کرنا چاہا۔

”تم چپ رہو جی۔ میں ان سے مسز بنرجی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ نے میں خط لکھا۔ آر نے مسز برکت مسج کے ذریعے میں پہلویا کہ اگر لڑکی دیکھ جاؤ۔“

”او شٹ اپ۔ ماما۔ پلیز۔“ لوٹھر بسواس نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوبارہ استد کی۔

”یوشٹ اپ ایڈیٹ۔ ڈیم فول۔“ مسز بسواس اب ہٹریکل ہونے والی تھیں۔ او ایڈ تھ نے۔ ”اٹ واژان دی آیل آن کیپری ریٹ آئی فاؤنڈ ہیر۔“ کا دقیا نو سی ریکارڈر ڈگر او نو پر لگا رکھا تھا۔ جو ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ لوٹھر بسواس نے اٹھ کر غصے کے ساتھ ریکارڈ پر سے سوئی ہٹادی اور بہن کو گھور کر دیکھتا ہوا کرسی پر آن بیٹھا۔

”ہم نے انکو اڑی کی۔“ مسز بسواس کہے گئیں۔ ”میں نے ڈھاکے اپنی سسٹرن لا کو۔ ہنری کے کزن برادر کی دانت کو خط لکھا کہ لڑکی کے حالات معلوم کرو۔ انہوں نے ہم کو لیٹر لکھا۔ میں ہنری کو بولا۔ میں نے بولا۔ ادجری سسٹرن نے لکھا ہے لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ لڑکی کے ہندو تہ زینڈ ہیں۔ لڑکی کانگریسی اور کمیونسٹ ہو گئی ہے۔“

”اوہ ماما۔ پلیز۔“

”مگر یہ گدھے کا بچہ۔ مس صاحب پر لٹو ہو چکا تھا۔ کیا اگر مر گیا مینا کوٹ۔ کیا لاہور۔
 بڑے اس کے لئے رشتے آدھے ہیں۔ مسز ایڈورڈ منور خاں تو ڈپٹی کلکٹر ہیں میرٹھ میں۔ اُن کی لڑکی آئی۔
 فی میں پڑھ رہی ہے۔ اس تک کی بات آئی تھی۔ ایسا میل ایرایشا ہے۔ آپ کی لڑکی میں ہے کیا۔ ذرا
 شنوں تو۔“

پادری بنجی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایک دم اُن کی کمر تھک سی
 گئی تھی۔

مسز بسواس کی تقریر جاری رہی۔ ”ہم تو اس گدھے کے بچے کی ضد پوری کرنے اتنی دور چلے
 آئے۔ ہے کیا آپ کے پاس۔ یہ فیفا گھر۔ میرا بیٹا تو سینٹ جانز کالج میں لیکچرر ہونے والا ہے۔ اے
 ایس۔ سی پاس ہے۔ کسی نچر پادری مشن اسکول میں نہیں پڑھاتا۔“ حالانکہ وہ نچر پادری مشن اسکول ہی میں
 پڑھا رہا تھا۔

”مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کہنا چاہا۔

”اما۔“ ایڈتھ نے آواز نکالی۔

”دیکھوں تو کون سا آئی سی۔ ایس مل جائے گا آپ کی لڑکی کو، جو ان کے لپٹے ہیں ڈھاکے آکر
 سن لئے۔“

”میری۔ کیوں اپنی جیب خراب کرتی ہو۔“ پادری بسواس نے پھر احتجاج کیا۔

”بڑا الٹی کالج کا شہرہ مٹا تھا۔ دیکھنی آکر ملی کالج۔ میں تو اپنے گھر میں ایک دن بھی ایسا سڑا

لاؤ فریجنرہ رکھوں اور بھی ہم کوئی دسی پادری کی تنخواہ پر گزر نہ پڑے ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری تو گھر کی زمینداری بھی
 ہے۔ خدا باپ کا ہر طرف سے فضل ہے۔ مس صاحبہ اگر آتیں ہمارے ہاں۔ نصیب کھل جاتا۔ رانی بن کر رہیں۔“
 مسز بسواس یہ بالکل بھول گئیں کہ صرف چند منٹ قبل انہوں نے اپنی عزت کا شکوہ کیا تھا۔ مگر اب پھر انہیں
 پناہ ملی نقصان یاد آگیا۔ اور انھوں نے چلا کر کہا۔ ”پانچ سو روپیہ خیر ہو گیا ہمارا۔ اتنے میں تو تھوڑا سا
 جلدی سے باہر جا کر گھوڑا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اندر آکر کھلی بار غصے سے بات کی۔“

”اما۔ کم آن۔ ڈونٹ کری ایٹ لے سین۔ بی۔ میو یور سیلف پلیز۔ ایہ بس کرو۔“

اپنی اما کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تقریباً کھینچتا ہوا وہ باہر لے گیا اور گاڑی میں اٹھا لیا۔ یاد سی ہنری بسواس

مرجھکائے ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے۔ ایڈتھ بسواس نے میز پرست اٹیچی کیس اٹھایا، جس میں سنہری بیل لگی
 ریشمی ساری اور سنگنی کی انگوٹھی مقفل تھی۔ باہر اکروہ اچک کے گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پادری
 بسواس واپس بیٹھے اور برآمدے کے درمیں کھڑے پادری بنرجی سے ہاتھ ملایا۔ ”سوری ریونڈ۔ آئی ایم
 دیری سوری۔ ناٹ یور فالٹ۔“ انہوں نے رمان سے کہا۔ پادری بنرجی ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکا
 خاموش کھڑے رہے۔ البتھر بنرجی سنگ روم کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے
 آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ لو تھر بھی جچے تلے قدم رکھتا برآمدے کی سیڑھی پر آیا اور سرخم کر کے کہا۔
 ”آئی ایم سوری اٹل۔ پلزز ڈونٹ مائیڈ مائی مدر۔ گڈ بائی۔“

”گوڈ بلیس یو مائی سن۔“ پادری بنرجی نے آہستہ سے جواب دیا۔

لو تھر جلدی سے واپس لوٹا اور گاڑی میں ایڈتھ کے برابر بیٹھ گیا۔ مشن کیا ڈنڈ کے سارے بچے
 اور عورتیں گاڑی سے ذرا فاصلے پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈرنزی کے ذریعہ خبر سارے کیا ڈنڈ میں پھیل چکی
 تھی۔ کل تک ڈھاکے کی ساری نینٹو کر سچین سوماسٹی میں نشر ہو جائے گی۔
 گھوڑا گاڑی لپی کاٹج کا چکر کاٹ کر پھلک کی طرف بڑھی۔ لو تھر بسواس کھڑکی میں سے سر
 نکال کر تازہ ہوا تنھوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گاڑی کیا ڈنڈ سے باہر جانے لگی تو
 اس نے دیکھا کہ روزی بنرجی لپی کاٹج کے پچھواڑے اپنے غسٹوانے کی سیڑھیوں پر سنگی مورت کی
 مانند ساکت بیٹھی ہے۔ لو تھر بسواس نے احمقوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اُسے دیو کرنا چاہا۔ مگر ہاتھ
 مفلوج سا ہو گیا تھا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک پر آگئی۔

لپی کاٹج کے اندر پادری بنرجی اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں بیٹھے چھوٹ چھوٹ کر
 رو رہے تھے۔ انہیں روزی کے انکار سے زیادہ اس انکشاف سے دھکا لگا تھا کہ انھیں معلوم بھی
 نہیں ہوا مگر دنیا بدل چکی ہے۔ ہمیشہ کی طرح صابر و شاکر گری بالا بنرجی آنسو خشک کر کے جا رہا
 سامان سگوانے میں مصروف ہو گئیں۔

شانتی نکیتن

اپریل ۱۹۴۷ء۔ دیپالی سرکار دوسری سدن کے سامنے گھاس پر بیٹھی تھرڈ ایر کے آخری پرچے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب ایک لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے چند لفافے اس کے سامنے گرا دیئے۔ روزانہ جب ڈاک آتی تھی اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اس شام کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا۔ اس کی طرف سے نہ کوئی خط آیا۔ نہ کوئی مندیش۔ نہ کوئی بادل۔ نہ کوئی راج ہنس اور جب اہل مکہ داس نے چار اس بار لو کے متعلق دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ کیونکہ روزی بنرجی نے ڈھاکے سے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے لئے اتنا غم، اتنی فکر، اتنی پریشانی سب بیکار ہے نا۔ آج لتے سینے گزر گئے۔ ستمبر میں اس شام کو چھ مہینے گزر گئے۔

دیپالی نے پہلا لفافہ کھولا جہاں آرا کا خط تھا۔ دُرگا پوجا کی چھٹیوں میں جب وہ ڈھاکے گئی۔ جہاں آرا اپنے علاقے پر فرم پور گئی ہوئی تھی۔ روزی کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ پادری صاحب نے اسے چھٹیاں گزارنے اپنی بہن کے پاس لال مینر ہاٹ بھیج دیا ہے۔ اودا دی کلکتے میں تھیں۔ دیپالی نے ساری چھٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ لوڈ و کھیلنے میں گزار دی تھیں۔ اب امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوں گی۔ اور پھر وہ چند رکنج واپس جائے گی۔ جولائی میں کالج کھلے گا۔ پھر سہارا آجائے گی۔ اگلے سال بی اے کرے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ ؟

جہاں آرا نے لکھا تھا:

”روزی کا قصہ تو اب خاصا پرانا ہو گیا۔ جب ملوگی تو پوری داستان سناؤں گی۔ مسٹر بنرجی اتنی کے پاس آکر رونارہ رہی تھیں۔ روزی تو اس بات کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتی۔ لال مینر ہاٹ سے واپس آکر پڑھائی میں مصروف ہو چکی ہے۔ خیر تھرڈ ایر کی ایسی پڑھائی بھی کیا۔ تم لوگ مجھ پر خواہ مخواہ رعب جھارتے ہو۔ بڑی آئیں بے چاریاں بی اے اسٹوڈنٹس۔ اور بھئی ہم نے جو کہا تھا انٹر کے بعد گھر بیٹھے مزے کر رہے ہیں۔ مزے کیا کر رہے ہیں دیپالی، یہ تو بالکل غلط ہے۔ آبا کا حکم کیسے مالا جا سکتا ہے۔ آبا اعلیٰ تعلیم کے

حامی نہیں تو پھر ایف اے تک ہی کیوں پڑھایا تھا۔ پچھلے سال مارچ میں جب ابامسلم بیگ کے اجلاس کے لئے لاہور گئے تھے ناچب پاکستان ریزولوشن پاس ہوا تھا۔ تولاہور سے واپسی پر علیگڑھ بھٹے آئے تھے۔ اور اگر کہنے لگے کہ میں تم کو بی۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دوں گا۔ مگر اس کے بعد پھر ارادہ بدل دیا۔ جانے اب کے دل میں آئے کیا پروگرام ہے۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔

”مگر روزی نے کمال کر دیا۔ سرلوٹھر بسواس بے چارے کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ میں نے روزی سے کہا کہ تم میں دونوں اپنے اپنے ماحول کے پروردہ ہیں۔ تم بغاوت کر کے کہاں جاؤ گی۔ اور اونچی ذات کے بنگالی کرسچین اگر قدامت پرست ہونے پر آمیں تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگی۔ سولیدرنی مجھے سہارا دے گی۔ میں نے اپنے آپ کو سولیدرنی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور روزی کس قسم کی باتیں کرتی ہو اور کیا کرنے والی ہو۔ اللہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے پر رکھے۔

”باقی ڈھاکے کے حالات بدستور ہیں۔ تمہاری اومارائے کلکتہ میں ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ نیر بھائی کی منگنی ہو گئی۔ وہ شمسہ خاں نہیں ہیں۔ امی کی پرانی سہیلی۔ جو سنگس گیلچے میں رہتی ہیں ان کے جیٹھ کی روتی سے۔“

”ہاں اس پر یاد آیا کہ شمسہ خاں کے پردوس میں جل پائے گوری سے ایک مولوی صاحب آکر رہے ہیں۔ مولوی عبدالمجید خاں۔ ان کی روتی یا سمین میٹرک میں پڑھ رہی ہے تو بیگم عبدالمجید نے خاں سے کہا کہ یا سمین کی انگریزی کمزور ہے کوئی استانی اس کے لئے لگوا دیں۔ شمسہ خاں نے مجھ سے ذکر کیا تو مجھے ایک دم روزی کا خیال آیا۔ اور میں نے روزی سے ان کی بات حیت کرادی۔ یا سمین میرے ہاں آئی تھی۔ خاصی دلچسپ روتی ہے۔ مگر مجھے کچھ خبطی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی امی کمرے سے چلی گئیں تو مجھ سے چپکے سے بولی۔ آیا۔ یہ امی اور بابائے کار خجے آگے پڑھانے کی فکر میں ہیں۔ میں تو ڈانسرنوں کی۔ میں بنو چکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اور میں نے کہا۔ بی بی۔ اتنا قدامت پرست خاندان تو تمہارے باپ کا ہے تم کس طرح ڈانسرنو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ اور ڈھاکے میں جہاں ایک ہزار مسجدیں اور بیس ہزار مولوی ہیں یا سمین بی بی تمہارے ناچ سیکھ بھی لیا، تو ناچو گی کہاں جا کر۔ مگر وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ آیا۔ دیکھ لینا۔ ایک دن میں ڈانسرن کر ہی دکھا دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس کے بابا یہ بات سن لیں تو اس کا گلہ ہی گھونٹ دیں۔ واقعی۔ مگر یہ آج کل کی روتیاں ہیں بھائی۔ بہر حال خواب روزی بھتیجے میں چار دن سنگس گیلچے جا کر یا سمین کو انگریزی پڑھا رہی ہے۔ اچھا ہے اس کا حبیب خرچ نکل آیا۔ روزی کے لئے بڑا دل دکھتا ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے اور اکثر بہت پریشان نظر آتی ہے۔

اب تم امتحان دے کر آؤ۔ تو اطمینان سے گپ شپ رہے گی۔“

تمہاری ۔ جہاں آرا

اس خط سے دیپالی کو کچھ اندازہ ہوا کہ اب تک روزی نے اس کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔
دوسرا خط بابا کا تھا۔

”میں خیریت سے ہوں۔ کھو کھو۔ شو نو۔ تو تو بھی اچھی طرح ہیں۔ تمہاری گھر سے فیر حاضری کی وجہ سے
بگڑانی رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس لئے وہ بے حد شیطان ہوتا جا رہا ہے۔

”تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیا کرو۔ کبھی یہ نہ سوچو کہ میں تمہیں پیسے نہ بھیجوا سکوں گا۔
”کل ایک بڑی افسوسناک بات معلوم ہوئی۔ تم کو بھی معلوم ہو کر رنج ہو گا۔ دیدی نے گو دام
کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پرانے کپڑے باہر نکالے۔ ڈیڑھ دو سال سے بڑا صندوق نہیں کھولا تھا۔
حالا تو تمہاری ماں کی تین بالوچر ساڑھیاں غائب تھیں۔ چور کدھر سے آئے۔ اب چوری ہوئی۔ کچھ کچھ
ماتہ مجھے بھی بے حد صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ میری ماں کی ساریاں تھیں۔ جو انہوں نے تمہاری ماں کو دی تھیں
یاں تمہیں معلوم ہو گا۔ پرانے خاندانوں میں دلہنوں کو دی جاتی تھیں۔ اور تمہاری بے چاری ماں نے
وہ بہوؤں کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ انھیں بننے والے مرشد آباد کے سلمان کا ریگر کب کے مرکھپ گئے۔
ن بھی ان کے ساتھ گیا۔ اب یہ ساریاں ملتی نہیں ہیں۔ دیدی تو چوری کے علم اور دہشت سے تقریباً بیمار
ہے۔ تم جانتی ہو وہ پہلے ہی سے اعصاب زدہ ہیں۔ ان کو فکر ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا تو باقی سامان
بچائے گا۔ اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی شے چوری کے لائق ہے ہی نہیں۔“

بابا کا خط لگانے میں واپس رکھ کر دیپالی گم سم سر جھٹکائے بیٹھی رہی اور گھاس کی پتیاں توڑاکی۔
نے گھڑی دیکھی اور لائبریری جانے کے ارادے سے یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔

شام تک دیپالی لائبریری میں اپنی مخصوص چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھی پڑھنے میں مہمک رہی کھڑکی کی
باہر اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ کتابوں کی اماویوں میں پرانے کاغذوں کی مہمک رچی تھی۔ میٹر
ہال سے باہر جا چکے تھے۔ دیپالی کتاب بند کر کے سوچنے لگی۔ صبح ڈاک خانے جا کر ٹکٹ خریدے گی۔
لکھے گی۔ (جہاں آرا کا خط فوری طور پر جواب طلب نہیں تھا) ساریوں کے چوری کے متعلق اپنے
لہار کرے گی۔ مگر یہ دوسری زندگی جو وہ دودھانی برس سے گزار رہی ہے۔ اس کا انت کیا ہے؟

وقت جس و خروش گذر جانے کے بعد جب ضمیر ملامت کرتا ہے کہ بابا کو اس طرح دھوکے میں ڈرا تو اس ضمیر کا کیا علاج کیا جائے؟ ضمیر کیا ہے؟ میں کون ہوں۔؟ دشوا بھارتی کی کھڑکی میں بیٹھ ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟ ریمان دا کا کون ہیں؟ امارائے اور روزی ہنرجی کون ہیں؟ گردو دیو اور اکشے اور جہاں آزار۔ ڈاکٹر جوئے چند سرکار؟ آتامیں؟ پچھلے سنکاروں کے بنائے ہوئے ذہن؟ کیا ایک ایک قدم ایک ایک حرکت پہلے سے مقدّر ہے یا محض حادثے کا نتیجہ ہے۔ "اقتصادی، سماجیاتی تاثر" خواص۔۔۔؟

ایک مور نہایت غرور سے سر اٹھائے کھڑکی کے نیچے سے گذر گیا۔ عفا نیت اور رومان اور فلے کے اس گروہ میں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر اس سرخ آرنسٹک مکان کے اندر گردو دیو ابھی توجہ سوالات کا جواب دینے کے لئے موجود ہیں۔

لیکن راستہ کیسے معلوم ہے؟

سولیڈرٹی۔! سولیڈرٹی میں جواب۔ شاید۔ موجود ہے۔

اٹھو۔ دیپالی۔ وہ اکثر، چوبیس گھنٹے وقت کے اندر دنی سفر میں خود سے کہتی رہتی۔ اٹھو۔ اب یہ کام کرنا ہے۔ اب یہاں سے جانا ہے۔ اب یہ پڑھنا ہے۔ اب اس سے بات کرنی ہے۔ بھگومت۔

وہ کھڑکی میں سے اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر باہر نکلی۔

۱۳

مس روزی ہنرجی اور سولیڈرٹی

روزی ہنرجی بسوا اس فیملی کی کاڑھی کیا ڈنڈے سے باہر نکل جانے کے بعد غسل خانے کی سیڑھی پر ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی تھی جس وقت میز بسوا اس سٹنگ روم میں دھاڑ رہی تھیں وہ غسل خانے کے کواڑ سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اور اس نے سنا تھا کہ ہم نے انکو انری کی۔ میری سسٹر ان لانے لکھا لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اس کے ہندو بوائے فرینڈز ہیں۔ لڑکی کا ٹریسی کیونسٹ ہو گئی ہے

وہ دھک سے رہ گئی۔ یہ خبر کس طرح پھیلی، اب پاپا اس کا کس طرح قیہ اور بھرتہ بنائیں گے۔ اُسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے رات کو اپنے کمرے سے باہر نکلی کر دیکھا کہ پاپا اور ماما دونوں نے اس ایک لفظ نہیں کہا۔ پاپا روتے رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا) اور ماما کی بھی آنکھیں دھجی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔

پادری بنرجی کی یہ خاموشی وقتی نہیں تھی۔ اس روز کے بعد سے انہوں نے اپنی اکلوتی لڑکی سے لہجہ جال تقریباً بند کر دی۔

ریورنڈ بنرجی کی خفگی روزی سے محض اس بنا پر نہیں تھی کہ اس نے نو تھر بسواس اور اس کے ندان کے سامنے ان کو اس بُری طرح شرمندہ کیا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز مختلف ذرائع سے روزی سرگرمیوں کے متعلق معلوم کر دیا تھا۔ اور ان کو پتہ چلا تھا کہ مسٹر بسواس کی ماحولی سسٹر کی اطلاع تھی۔ روزی بنرجی اکثر اوقات برات شہر کے کولون کھدروں میں پند لہند، قندہ پر دان اور حکومت باغی اور غدار ہندو اور مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ریورنڈ بنرجی کا جھکا دیا تھا۔

اسی دوران میں چارلس بارلو کے متعلق دیپالی کا خط پہنچا۔ روزکانے وہ خط پڑے پڑے کر کے آتش کر دیا۔ اور لرز کر سوچا۔ مجھے جیل بھیجا جاسکتا ہے۔ مگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے لیے دیپالی آیا کے بھیس میں کینٹ ویل کے جنگلے پر پہنچی تھی۔ تو مجھے جیل ہو سکتی ہے۔ میں اپنے سیدھے نیک دل باپ کو کس قصور میں سزا دے رہی ہوں؟ کیا یہ ان کا تصور تھا کہ ماما کو بال و دھواں بنا پڑا۔ پانے میٹ کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا۔ میری سمجھ میں یہ چند باتیں آگئی ہیں، تو کیا دنیا کے حالات بدل جائیں گے؟

وہ اب خاموشی سے کالج جاتی اور واپس آکر اپنے کمرے میں پڑھتی۔ تعطیلات میں اسے بھرنجی نے شوہر کو سمجھا بچھا کر اس کے لئے لال مینرٹ کا گٹ منگوادیا۔ شمالی بنگال سے واپس آکر وہ بھرنجی انی میں لگ گئی۔ کبھی کبھار جہاں آرام کے اصرار پر ارجمند منزل چلی جاتی۔ مگر ارجمند منزل کی امارت اور کشش اسے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ یہ لوگ اتنے امیر اور باعزت ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت ہوں۔ میا چرنیشین لوگ میرے گھر آکر میرے ماں باپ کو ان کے افلاس کا طعنہ دے کر چلے جاتے ہیں اور میرا

باپ میری خاطر آنسو پیتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں۔ میں اس کا حل کس طرح تلاش کروں۔ پھر جہاں آرا نے اس کے لئے مولانا صاحب کے ہاں سگن بگچے میں میوشن لگادیا۔ (دوہ لڑکی یاسین بھی خاصی باؤلی سی تھی۔ جانے ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا) اور وہ شام کو دہاں جانے لگی۔

ایک روز وہ میوشن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جہاں آرا کے یہاں ارجمند منزل گئی تو جہاں آرا نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ شمالی بنگال کی برہمن عورتیں بی رگوری ہوتی ہیں! اور روزی بھی اپنے سفید اور حسین رنگ و روپ کے لئے مشہور تھی۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔ "روزی۔ تم تو بالکل سپی پڑ گئیں تم نے ان کو چلتا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب گیوں بکس رہی ہو؟ سوچو، تم میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر دو۔ مگر جب میری اس طرح بنادی طے کی جانے گی تو میں سر جھکا کر ہاں کر دوں گی۔"

"تمہاری شادی۔ جہاں آرا۔؟" روزی نے پوچھا۔

اچانک جہاں آرا کاؤٹکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"جیزس کرائسٹ۔ تم کو کیا ہو گیا جہاں آرا۔" روزی نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" جہاں آرا نے آنسو پوچھ کر کہا! اور سیدھی ہو بیٹھی۔

روزی نے پہلی بار جہاں آرا کو تعجب سے دیکھا۔ یہ خوش قسمت، باعزت، پردہ نشین رئیس رادی جو بیرونی دنیا کے خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ و امون اپنی مجلس میں آرام سے بیٹھ رہے۔ اسے کیا شکر ہے، صرف یہی کہ جانے کیسے آدمی سے شادی ہوگی۔ ساری پردہ نشین لڑکیوں کا محض یہی ایک مسئلہ تھا۔ جہاں آرا۔ روزی اور دیپالی دونوں سے بڑی تھی۔ اور روزی کو یاد آیا۔ کچھ سال ایک مرتبہ اما کہہ رہی تھیں۔ بیگم قمر الزماں اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ جہاں آرا جو بیس سال کی ہو گئی۔ اپنے ہر پردہ رولہ کے لڑکے جاہل اور نکمے ہیں۔ متوسط طبقے میں بیاہ دینے سے ناک کٹ جائے گا۔ اس کے علاوہ جہاں آرا کی شادی کے سلسلے میں اور کیا مسائل تھے۔ ان کا ذکر بیگم قمر الزماں نے مسز برجی سے نہیں کیا تھا۔ خود جہاں آرا نے اپنے نجی معاملات کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے آج تک کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ جہاں آرا کی اچھی خاصی شکل تھی گو وہ دیپالی کی طرح دلکش اور دوزی کی طرح گوری نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ دار حساس اور خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ لیکن وہ اس میں مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔

روزی نے آج تک جہاں آرا کی ذاتی زندگی کے متعلق نہ سوچا تھا۔ اسے اور دیپالی کو کالج کے رازموں اور اب سیاسی مسائل ہی سے فرصت نہیں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی دلچسپیوں اور اپنے آئیڈیلز کے سلسلے میں کتنے خود غرض ہیں۔ روزی کو اس وقت پہلی بار خیال آیا۔ اس نے دوبارہ جہاں آرا پر نظر ڈالی، جو اپنی شاندار نوابگاہ میں مسند پر نیم دراز پھر چپکے چپکے رو رہی تھی۔

”جہاں آرا —“ روزی نے انہیں سے کہا۔ وہ کچھلے چند ہیمنوں میں بڑی ہو گئی تھی اور خود کو بوڑھی عورت سمجھنے لگی تھی۔ چند ماہ قبل اگر وہ جہاں آرا کو اس طرح روتے دیکھ لیتی تو فیوڈل روڈ ٹیک ہیروئن، کہہ کر اس کس طرح لے نہ چڑھتی۔

پھر روزی نے سوچا۔ میں اور دیپالی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس سولیڈرٹی موجود ہے۔ جو ہمارے ذاتی اور جذباتی مسائل سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر بے چاری جہاں آرا، واقعہ یہ ہے کہ اپنے جاگیر مذہبی رجعت پسند تمدنی حصار میں قید ہے۔ اور اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ نہ یہ کچھ سمجھنا چاہتی ہے۔ پھر جہاں آرا مسند سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنی جاہدانی کی ساری کے پتوں کو ایک بازو پر لپیٹتے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”روزی — ذرا اپنی صورت دیکھ آئیے میں۔ اتنے دنوں میں ایسی زرد پڑ گئیں تو ابھی سے سوچ لو کہ کس حد تک بغاوت کر دو گی۔“

”سولیڈرٹی —“ روزی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”وہ کس ہلاکا نام ہے۔ جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ پھر اس نے ملازمہ کو چائے لانے کے لئے آواز دی۔

”میں نے سولیڈرٹی کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ وہی مجھے سہارا دے گی۔“ روزی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں آرا نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

”تم کو کچھ معلوم نہیں جہاں آرا کی گیم کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔“ روزی نے اب ذرا با اعتماد آواز میں کہا۔

”تمہیں معلوم ہے؟“

روزی خاموش ہو گئی۔

مآل انفرقی کشی میں چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں انجم آرا اور اختر آرا شور مچاتی اندر آ گئیں۔ جہاں آرا فوراً ہنس ہنس کے اور مصنوعی ہنساشت سے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ روزی چپ چاپ کشتی کے گنگا جہنی نقش و نگار کو دیکھتی رہی

”اور سناؤ روزی۔“ جہاں آرا نے چائے بنا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری شاگرد اور مستقبل کی مشہور رقاصہ یا سمن مجید کے کیا احوال ہیں۔“

۱۴

آمار پرانیر آرام مونیر آنند۔

بی اے پر یو ایس کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ مگر دیپالی موسیقی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری کے سلسلے میں مزید چند ہفتوں کے لئے شانتی نکیتن میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ساری درس گاہ تقریباً سنان ہو چکی تھی۔

آخر می کی ایک گرم شام وہ کلا بھون کے باغ میں گھاس میں ڈولے گوتم بدھ کے مجسمے کے نیچے بیٹھی قدیم راگوں کے ایک ”شجرے“ پر سر کھپا رہی تھی۔ جب درختوں میں سے نکل کر اس کا داس اُس کے سامنے نمودار ہوا۔ اہل ایک خوش مزاج لڑکا تھا۔ ہر وقت باجھیں کھلیں رہتی تھیں۔ سامنے آکر نمسکار کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب دیپالی کو دی۔

دیپالی نے کتاب کھولی۔ اس میں سے حسب توقع ایک پرچہ نکلا۔ دیپالی کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ پرچے میں لکھا تھا۔

”پیاری بچی۔“

معاف کرنا تم کو اتنے طویل عرصے تک کوئی خیر خبر نہ بھیجوا سکا۔ (انداز تحریر کیس قدر غیر منتظمی تھا۔ کمال کی تکنیک ہے۔ واقعی دیپالی نے سوچا) تم نے اس بار ہیں خاصی بری طرح لیٹ ڈلو نہ کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کوئی زبردست مجبوری رہی ہوگی۔ بہر حال۔ اب اہل تم سے جو کہتا ہے اس پر رحم۔ از جلد عمل کرو۔ اس میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ فقط۔“

”ریحان داد سمبر کے مہینے سے کھلنا اور اس کے بعد سے نواکھالی میں تھے آج کل وہ خاص انخاص
مہ میں ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے کل ہی واپس آیا ہوں۔ ریڈیو کی نئی بیڑی
ساتھا۔“ اُن اطمینان سے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”مگر ریحان دانے مجھے کیا کرنے کو کہا ہے؟“ دیپالی نے پوچھا۔
”بتاتا ہوں دیدی۔ بتاتا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ دھاکے واپس گئیں۔ مگر راستے میں معلوم ہوا
ابھی۔“

”اٹل بات بتاؤ۔“ دیپالی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔
”بات۔ بات کچھ بھی نہیں۔“ اُن نے کھسیں نکال کر جواب دیا۔ ”ریحان دانے آپ کو
ربن بلایا ہے۔“
”کیا۔؟“

”میں۔ دیدی۔۔“
”مجھے سندربن کیوں بلایا ہے؟ وہاں پہنچنا آسان ہے؟ اور کس لئے؟“
”پہنچنا آسان بالکل نہیں ہے۔ بڑا خطرناک سفر ہے۔ دیدی اور کیوں بلایا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم۔
نہی کہا تھا۔ اپنی دیپالی دی کو فوراً یہ سندریہ دو کہ ایک سید اہم میٹنگ میں ان کی شرکت ضروری ہے۔
“ اور کون کون جارہا ہے۔“

”دادا نے کہا تھا دیپالی دی کو بتا دینا کہ سریندو دا، محفوظ الرحمن میاں، اور ان کی بیوی عالتہ
گے۔ باریال سے۔ یہاں سے آپ ہوں گی اور محمود الحق دا۔ دھاکے سے پہنچیں گے۔ کانفرنس ہے۔
ن نے تھوڑی سی چیزیں بھی منگوائی ہیں۔ لیتی جائیے گا۔“ اُن نے کرتے کی جیب سے ایک فہرست نکال
ن۔ فہرست میں چند نئے اخباروں اور بھٹانوی رسالوں کے نام لکھے تھے۔

”دادا کو بس ان کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے؟“ دیپالی نے تعجب سے پوچھا۔ اُن کا دل
کھانے کھانے کو بھی تو چاہتا ہوگا۔ میں۔۔۔
”یہ کچھ نہیں بتایا۔ لے جائیے ایک آدھ اچار جٹنی۔“
”اور میں جاؤں گی یہاں سے کس طرح؟“

”آپ یہاں سے رانا گھاٹ اسٹیشن تک اکیلی جائیے۔ ریحان داکا ایک آدمی آپ کو رانا گھاٹ اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ آپ کو جیسور کے راستے سے کھلنا تک پہنچائے گا۔ وہاں سے ایک اور آدمی کو باگھیراٹ تک لے جائے گا۔ باگھیراٹ سے۔“ اگلے پندرہ منٹ اس نے دیپالی کو ریحان پہنچنے کا پتہ دار راستہ سمجھانے میں صرف کئے اور ایک تنکے سے مٹی پر دریاؤں اور ٹرینوں کا نقشہ بنایا۔ دیپالی آنکھیں پھیلنے لقمہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر اہل جلدی سے اٹھا اور مداری کی طرح جیب سے نکال کر دوستو کے نوٹ اسے تھما دیئے۔
”یہ کیا ہے؟“

”ریحان دانے بھجوائے ہیں کرائے کے لئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ دیپالی سے کہنا آج کل ہم بہت سخت رئیس ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تم لوگ جلدی سے آکر جنگل میں تھوڑا سا جشن منا جاؤ۔ پھر پیٹنے ہو جائیں گے! اور اس کے بعد اور بھی نہ جانے کیا ہو جائے۔“

”یہ بیکار کی بات ہے۔“ دیپالی نے متانت سے کہا۔ ”تمہارے ریحان والے بعض مرتبہ ایسی ڈرمٹک باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔“ اُس نے نوٹ اپنے بیک میں رکھ لئے۔

”اچھا اب میں بھاگتا ہوں دیدی۔ آپ کو جس دن روانہ ہونا ہو، مجھے ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیجئے گا۔ میں آپ کو یہاں سے رانا گھاٹ جانے والی ٹرین پر بھال دوں گا۔“ اہل سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کر اسے نمسکار کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سر کی طرف چلا گیا۔ دیپالی کو تم بدھ کے کا اونچے مجسمے کے پیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کلا بھون کے جس فنکار نے یہ مجسمہ بنایا تھا وہ داف بڑا زبردست ماہر اناٹومی تھا۔ کیوں کہ پاؤں کی ایک ایک انگلی کا ایک ایک جوڑا اور ناخن بے حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے دوسرے شیا علی مجھنیزوں کی دیواروں پر بنے ہوئے سیاہ مجسمے بڑے جاندار سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میگھ دوت کے ایجنٹ پرور کھڑی ہے! اور ڈیکور کی مورتیاں اُسے گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ بادل خلیج اور سندربن کے اوپر سے بہتے بیرجھوم کی سمت بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دھیان سے دیکھا تو سیاہ بادلوں میں ایک سفید نگلہ اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب ہو سکرانی اور اس کا چہرہ بھی مقسم تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ہو سکر کی سمت قدم بڑھانے شروع

رات کو اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر خود سے کہا۔ اب میں اپنے باپ کو ایک اور
 ست دھوکا دیتی ہوں۔ اُس نے لکھا۔ بابا۔ یہاں سے لوگ گیت جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی
 ل پرگنہ کے گاؤں میں جا رہی ہے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہہ دیے۔ کیونکہ یہ فوراً مری
 ری آف میوزک کے دوسرے پرچے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ میں جلد ہی گھر پہنچنے کی کوشش
 کی۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی بیٹی، دیپالی
 خط بند کر کے وہ باہر آئی۔ نیم تاریک روستوں اور سناں باغ میں سے گزرتی سڑک تک پہنچی
 نکھیں بند کر کے خط لیٹر بکس میں گرادیا۔

۱۵

سندربن

سندربن کا سلسلہ جنوبی بنگال میں جو میں پرگنہ سے لے کر باقرگنج اور کھلنا کے اضلاع تک پھیلا
 ہے۔ ان گھنے اور پرخطر جنگلوں میں مشہور عالم رائل بنگال ہائیسنگر اور چیتے اور ہرن دوڑتے پھرتے ہیں۔
 ان کے وقت رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لاتعداد ندیوں اور جزیروں اور سمندری کھاڑیوں
 لہلوں اور سمندری درختوں کی اس لرزہ خیز حسین و جمیل کائنات میں، اکا دکا پھیروں اور کھڑکھاروں کی
 ان گھنے جھرمٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ سندربن کا یہ وسیع و عریض علاقہ دنیا کے حسین ترین اور خطرناک ترین
 مابین سے ہے۔

دیپالی سڑکار کی کشتی باگھیراٹ سے روانہ ہو کر ایک نامعلوم منزل کی طرف بہتی جا رہی تھی۔
 چاروں طرف کے مہتاباگ حدِ خوبصورت مناظر کو دیکھ دیکھ کر سکتے ہیں بیٹھی تھی۔ اور اس کا دل دھڑک
 رہا تھا۔ وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

ریکان دا — چیپٹوں کی چپ شپ اور کائنات کی اس آبی اور سبز سمفنی میں یہی نام مرتعش
 — وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

دن بھر چلتے رہنے کے بعد کشتی شام کو ایک گاؤں کے گھاٹ پر پہنچی۔ سناں جیٹی پر ایک بوڑھا

مسلمان جس کی سفید دائرہ سی ہو اس پر لہر رہی تھی لائین لم تھ میں لئے کھڑا تھا۔ دیپالی اپنا اٹیچی کیس (یہ تارک اٹیچی کیس!) اور تھیلا اٹھا کر بانس کی جھٹی پر اتاری۔ تاج نے کھٹنا کی ساحلی بنگلہ میں بوڑھے مولوی سے کوئی کہی۔ مولوی نے لائین اٹھا کر دیپالی سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ بیٹی۔“

کشتی پانی پر واپس چلی گئی۔ دیپالی اب بھوکے عالم میں اس ازلی جنگل میں تنہا کھڑی تھی۔ میں کہاں سے کہاں آگئی۔ اس نے حیرت اور خوف کے ساتھ سوچا۔ لیکن دیکھان اس راستے کے سرے پر موجود ہیں۔ محفوظ ہوں۔

بوڑھے نے اس کا بکس اور تھیلا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ اس کے ساتھ جھٹی پر سے اتر کر گاڑی بڈی؛ آگئی۔ بوڑھا بلا کی پھرتی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ شاید اس بوڑھے نے اپنی ساری عمر اسی جگہ پر گزاری ہے اور اسی جگہ اسی حالت میں مرجائے گا۔ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا کر پائیں گے؟ یہ سوچ کر دیپالی حسب عادت نئے جوش کے ساتھ اپنی رفتار تیز کر دی۔

”باقی لوگ آگئے؟“ دیپالی نے بوڑھے سے پوچھا۔

وہ چپ رہا۔ دیپالی کو تکلیف ڈر سالگا۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید یہ میرا شہری لہجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”دوسرے لوگ جو آنے والے تھے۔“

بوڑھے نے نفی میں سر ہلادیا۔ دیپالی متفکر ہو گئی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر میں اتنی دہشت زدہ کیوں ہو رہی ہوں۔ حد ہے۔ اگر میں نے کوئی حماقت کی ہے تو۔ تو اُسے بھگتنا پڑے گا۔ او ماں — او ماں — ماں — دیپالی نے بے طرح ہڑبڑا کر دیوی سے دعا کرتا مانگنا شروع کر دیں۔

آدھ گھنٹے میں وہ لوگ درختوں کے ایک جھرمٹ میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک طرف ندی رہی تھی۔ سائیکلوں کے تعبیضیوں سے شکستہ لیکن خوبصورت بانس کا جھونپہ اس نے کھڑا تھا۔ برآمدے پر بیچوں کی سیلےں چڑھی تھیں اور طاق میں دیا جل رہا تھا۔ مولوی نے کبس اور تھیلا برآمدے کے کچے فرش پر رکھ کر آواز دی۔ ”زینب!“

ایک بوڑھی عورت پیوندوں سے بھری اودی ساری پیٹے اندر سے نکلی۔ اس نے جھک کر دیپالی کو غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ ”آؤ — آجاؤ —“

دیپالی نے اسے نمسکار کیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین کردوں کے صاف تھرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔
 ”تمہاری کھاٹ میں نے اپنی کوٹھری میں بچھا دی ہے۔ براہِ زوالے کمرے میں مولوی صاحب اور میرے
 نوں بیٹے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کام سے کھٹنا گئے ہوئے ہیں۔“
 دیپالی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم کو بھوک لگی ہوگی۔ راستے میں کچھ کھایا تھا۔؟ یہ لو۔“ بوڑھی عورت نے جھینے ہوئے
 دل کے میٹھے لڈو ایک رکابی میں رکھ کر اُسے پیش کئے اور پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ یہ غربت اور
 ہان لوانزی۔ دیپالی کے حلق میں کوئی چیز آگئی۔ اس کی جھپکپھٹ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا۔
 ”جان میاں باہر عدی پر بیٹھے ہیں ادھر۔“

دیپالی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی جو اس
 اپنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غریب کا افسوس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔
 نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مولوی صاحب زینب بی بی کے شوہر برآمدے میں چٹائی بچھا کر مغرب کی نماز
 محو ہو چکے تھے۔ اس نے زینب بی بی سے چند باتیں کیں۔ ایک لڈو دانتوں سے کتر اور لالٹیں ہاتھ میں لے
 کھیلے برآمدے میں نکلی جس کے عین نیچے ندی مرواں تھی۔

ندی کے کنارے جھونپڑے کی طرف پشت کئے وہ بیٹھا تھا۔
 وہ آہستہ سے نیچے اتری اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کہتی پر سر رکھے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا
 ۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ ”شوکتی آگئیں۔“

”ہاں۔“

وہ آہستہ شاہشی دینے کے انداز میں مسکرایا۔ ”گوگرل۔ بریوٹل گرل۔“
 اُس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔

”آپ نے۔“ دیپالی نے اپنے چہرے پر اٹکھٹا اور انگلی پھیری۔

”ہاں بھائی۔ دوڑھاٹی برس سے کسی طرح اس کجخت داڑھی سے پیچھا ہی نہیں چھٹتا تھا۔ مسلمان
 صی۔ ہندو داڑھی۔ عید جھاڑ جھنکار ہوگئی تھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی سے سارے

میں گھومتا ہوں آج صبح تہلے آنے کی تقریب میں مولوی صاحب کے بڑے لڑکے سے استراے شیو کیا۔ دیکھو ٹھیک ہے نا۔ "اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ایک بائیں رخسار پر استرے کا خفیف سا زخم تھا اور خون کی بوند جم گئی تھی۔ خون کے اس قطرے کو دیکھ کر وہ اچانک بے حد مضطرب ہو گئی۔

ندی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ دور سے شیروں کے گرجنے کی آواز آرہی تھی۔ ریمان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا: "پھر اس نے ٹھٹھک کر پوچھا: تم نے علاؤ اللہ پڑھا ہے؟"

"تھوڑا سا۔"

"کوئی نظم یاد ہے؟"

"راتِ سرخ اور تاریک تھی۔"

"ہاں۔ ادھر دیکھو۔" ریمان نے دھڑا فٹ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سمندر اور دریا اور جنگل ایک ہو گئے تھے۔

"سرخ اور تاریک رات میں ایک بہری ناؤ۔" اس نے پانی میں انگلیاں ڈبو کر آہستہ آہستہ اپنی خوبصورت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہلتی۔ ڈولتی، طوفان زدہ، ستیر، خائف، ارکان کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔"

"لیکن طوفان آیا۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن طوفان آیا۔" ریمان کہتا ہوا۔ "اور ناؤ ساحل کے بجائے ایک دور دراز جزیرے سے جا لگی اور ناؤ میں سے وہ نوجوان نکلا۔ بھوکا، زخمی، نڈھال۔ وہ ریت پر پڑا تھا۔ جب وہ لڑکی وہاں پر آئی اور اس نے کہا۔"

"اُس نے کہا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ انسان کو بے آسرا اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔" دیپالی نے کہا۔

"تم انسان ہونا۔ تاہم ایک تنہا غضبناک سمندر کی روح تو نہیں؟"

ملہ سید علاؤ اللہ۔ سترہویں صدی بنگال کا عظیم شاعر جس کی کشتی پر لکائی قزاقوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی ایلکان پتھی

وہ ٹھٹھک گئی اور ریکان کو دیکھ کر علاؤل کے الفاظ میں سوال دہرایا۔

ریکان نے اقرار میں سر ہٹایا۔

”کیونکہ —“ دیپالی کہتی رہی۔ ”سمندر اپنے غم میں مبتلا سارے کرۂ ارض کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ مگر زمین تک نہیں پہنچ پاتا۔ زمین مضبوط ہے۔ اس نے انسانیت کے مظالم کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ سمندر تو ایک چھوٹی سی نوکا کو بھی سمہارا نہیں دے سکتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے میورینگی جہاز چاہئیں۔ ایسے بکرے، جن کو چودہ چودہ ماٹھی کھیتے ہیں۔“

”اور اس لڑکی نے علاؤل سے کہا تھا — دھرتی پر گھر بنے ہیں۔ آسمان خول بصدت ہے۔ چاند خوب صورت ہے۔ مگر چاندیں گھر نہیں ہے۔ گھر ناریل کے سائے میں بنتے ہیں۔ میں تمہارا گھر بنوں گی۔“
ہوا ساکت رہی۔ کائنات ہنسم گئی۔ ندی نے بہنا بند کر دیا۔ ایک ازلی، ابدی لحظے کے لئے سارا وجود غلام میں تحلیل ہو گیا۔

پھر ہوا چلی۔ سمندری کے درخت سرسرائے۔ ندی پسنے لگی۔ دیپالی اپنی گود میں ہاتھ رکھے اسی طرح ساحل پر بیٹھی رہی۔

”پھر کیا ہو سکتی؟ علاؤل نے اسے کیا جواب دیا؟“ ریکان کی آواز سناتے میں لہروں کے ساتھ گونجی۔
”مجھے پتہ نہیں آگئے مجھے یاد نہیں آ رہا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ پھر اس نے سادگی سے پوچھا ”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

”ایک اہم کانفرنس کے لئے۔“ ریکان نے سنجیدگی سے کہا۔

”باقی لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ سرنیدر دا وغیرہ ادھلا لٹا آیا۔“

”نہیں، بس اب آتے ہی ہوں گے۔“

”میں آپ کی ساری چیزیں جو مشکواتی تھیں یعنی آئی ہوں۔“
”گڈ۔“

”دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔“ یہ آپ کے پاس کہا
سے آگئے تھے۔“

اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی۔ ”ہیں! اپنی کتاب کی رائٹنگ ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئیئر

یہاں تک ۔

”ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائٹی ملے گی۔“

”افوہ۔ تو اس وقت گویا دوسرا یہ دارسند بن میں آؤٹنگ کر رہے ہیں۔“ اس نے شگفتگی سے ایک کنکریاتی میں پھینکا۔

دیپالی پھر بڑی متفکر نظر آئی۔ ”ریحان دا۔“

”کہو۔“ وہ کنکراٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکتا رہا۔

”باقی لوگ کہاں ٹھہریں گے؟“

”ارے بھئی۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”کیا باقی لوگ باقی لوگ کر کے پور کر رکھتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ قبضہ لگا کر منہا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔“

”دیپالی نے بھونچکی ہو کر اسے دیکھا۔“ تو آپ نے اوٹل سے جوٹ بولا تھا۔“

”بالکل۔“

”اور آپ کا خیال تھا۔ میں چلی آؤں گی۔“

”میرا خیال صمیع تھا۔!“

”دیپالی غصے سے دوسری طرف مڑ گئی۔“

”شوکتی۔“

اس نے جواب نہیں دیا! اور ندی کے کنارے کنا رے چلنے لگی۔

”شوکتی!“

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

”ایسے ہی چلتی چلی جاؤ تو سیدھی ڈھاکے پہنچ جاؤ گی۔ مگر ذرا خیال رکھنا۔ وہ تمہارے سامنے ایک عدد

آدم خور گھڑیاں بٹھائے۔“ ریحان نے بے اشت سے آواز دی۔ سامنے ندی کی سطح پر ایک سیاہ لکیر

نظر آرہی تھی۔ ایک گھڑیاں تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیپالی چیخ مار کر واپس پٹی۔

ریحان کھلکھلا کر ہنستا ہوا سیڑھی پر بٹھ گیا۔ دیپالی اس سے کچھ فاصلے پر دوسری سیڑھی پر آ بیٹھی۔

”بے حد۔ ایک اجنبی آدمی کے بلانے پر تنہا اس کے پاس بنوں میں آگئیں۔“

”مجھے اس اجنبی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”قطعی نہیں!“

”اور ایسے ناقابل اعتبار آدمی کے ہاتھوں میں صوبے کی تحریک کی باگ ڈور ہے۔ جب ہی تو یہ گت

بن رہی ہے تحریک کی۔“

”ہا ہا۔ وہ بھی خوب ہنسا۔“

اب چاند دل دی جنگلوں کے سیاہ افق پر آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا۔

”چلو تم کو اپنے میزبانوں سے ملو ایں۔“

وہ اس بوڑھے جوڑے کے مسکین اور باصبر چہرے کو یاد کر کے فوراً رکھی ہو گئی۔

”یہ لون لوگ ہیں؟“

”مولوی ابوالہاشم۔ ماہی گیر ہیں اور اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام۔ ان کے بڑے بھائی

میں درجہ سے درگزر بھی ہیں۔ میں ان کیسے دو مہینے سے مقیم ہوں۔ کھانا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ گو

رفتار سست ہے۔“

آپ نے ان دونوں میاں بیوی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟“

”تمہارے متعلق۔؟ کچھ نہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنے

والا ہوں۔“ ریحان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”مشرم تو نہیں آتی آپ کو۔“ دیپالی نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

”بالکل نہیں۔ چلو۔ اٹھو۔“ ریحان نے بڑے نہایت اور شائستگی سے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر کہا اور لالٹین اٹھالی۔ وہ بانس کی سیڑھیاں چڑھ کر چھو پڑے میں داخل ہوئے

زمین نے مچھلی بھات ان کے سامنے رکھا۔ دیوار پر پھیلے مچھلی پکڑنے کے جال کے نیچے

وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کا سایہ دیوار پر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتنے میں مولوی

درمھی والا جھکا جھکا سایہ بھی پر چھائیوں میں آ شامل ہوا۔

”بابا۔ بخار۔“ ریحان نے دونوں بوڑھے پر چھائیوں سے کہا۔ ”یہ ہماری کولنٹم ہے۔“

کو ٹنٹم دیپالی ۔

مولوی نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا ۔ اور سر ہلایا ۔

ریحان ہتار دیا ۔ یہ ہمارے لئے کو ٹنٹم بھی ہے اور دیپالی بھی ۔ کسی دن میں تم کو سمجھاؤں گا کہ اس دیس میں کو ٹنٹم اور دیپالی ایک کیسے ہو سکتی ہیں ۔

بس شروع ہو گئی تبلیغ ۔ ایک منٹ کو بھی پارٹی لائن چلانا نہیں بھولتے ۔ دیپالی نے ذرا الجھن سے سوچا اور کلیخت لے لیا لگا کر سامنے پر چھائیوں میں بنوئے چند رسکار کا سایہ بھی اُکڑھڑا ہو گیا ہے ۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں ۔ وہ سر جھکا کر تندھی سے کھانا کھانے میں مہمک ہو گئی ۔

کھانے کے بعد ریحان نے کہا ۔ رات بہت آگئی ہے ۔ تم اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو دیپالی ۔ ب آرام کرنا چاہو گی ؟

”جی ہاں ۔“

”گڈ نائٹ“ ریحان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔

”گڈ نائٹ ۔“

ریحان اور مولوی ابوالہاشم کمرے سے باہر چلے گئے ۔

اُس رات ، سندھ بن کے غریقِ مسئلے میں ، زینب بی بی کے برابر والی کھاٹ پر لیٹ کر دیپالی نے موجدِ ندگی کی کوئی تاک بھی ہے ۔ بہت جلد سے نیند آگئی ۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ جھونپڑے سے نکلتی ہوئی ایک قریبی کینچ میں چلی گئی جہاں دوسرے ایسے گلداز ہرنوں کی ایک ڈارچو کڑیاں بھرتی گز رہی تھیں ۔ وہ ایک درخت کی شاخ پر ہاتھ لکھ کر ان خوبصورت نونوں کا نظارہ کرنے میں محو تھی ۔ جب کسی نے پیچھے سے کھنکھارا ۔

”ہوئی غریب شکستہ ، اس وقت اس پوز کو دیکھ کر فوراً بے ہوش ہو جاتی اور کالیداس کو میں دوبارہ لکھنا پڑتا ۔“

دیپالی نے پلٹ کر دیکھا ۔

”ریحان ۔ آپ اس قدر نون سیریں ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر ہو چلی ہے ۔ آئیے ۔

میں آپ کو آپ کے رسالے دے دوں۔“

”اجی پڑھ لیں گے رسالے“ وہ آرام سے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے آپ سے جنگ کی تازہ ترین صورت حال ڈسکس کرنا ہے۔“

”وہ بھی کر لی جائے گی۔“

”اچھا تو چل کر ناشتہ تو کر لیجئے۔“

”ناشتہ۔ ادہ۔ آج کا سینو کیا ہے ہمارے بریکفاسٹ کا؟“ ریمان نے شان سے پوچھا۔

”مرغ مسلم اور پلاؤ۔ یا جو کچھ بھی آپ مسلمان لوگ کھاتے ہیں صبح کو۔“

”اری یوقوف۔ مسلمان ناشتے میں مرغ مسلم نہیں کھاتے۔“

”واہ۔ جہاں آرا کے ہاں میں نے ایک مرتبہ مرغ مسلم اور پراٹھے کھائے تو اس نے کہا

کہ صبح پکے تھے۔“

”جہاں آرام کون۔؟“ وہ دونوں ٹپلتے ہوئے اب جھونپڑے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

”میری دوست ہے۔ نواب قمرالزماں چودھری کی لڑکی۔ سخت فیوڈل لیکن بیکریوٹ۔“

”ادہ۔“

وہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ زینب بی بی نے رات کا بکایا ہوا ہینٹھا بھات سامنے رکھا۔

”میں آج لٹ جا کر آپ کے لئے کھانے پینے کی سامان خرید لادوں گی۔“ دیپالی نے ریمان سے

انگریزی میں کہا۔

”دیپالی تم چند روز یہاں رہ کر میرے لئے بہتر کھانا پکا دو گی۔ مگر ان دونوں کو تو ساری زندگی

اس کے علاوہ کچھ میسر نہیں ہوا۔“

”ادہ۔“ دیپالی نادیم ہو کر المونیم کی رکابی پر جھک گئی۔ زینب بی بی چولے پر چائے اوٹھنے میں

مصرود تھیں۔ چار پینے کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے جس میں ریمان کی چارپائی بھی تھی۔

فرش پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ٹرنک کے اوپر بیڑی کارڈ لپور رکھا تھا۔ ریمان نے

صبح کی خبروں کے لئے ریڈیو اون کیا۔ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے میلون ڈی سیلو کی آواز گونجی۔

خبریں سننے کے بعد ریمان نے کہا۔ چلو باہر چلیں۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جھونپڑے کے نیچے گھاٹ

مولوی کی ناؤ بندھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب دن بھر کے لئے کسی کام سے گاؤں جا چکے تھے اور پانی سطح پر بکری عقاب پھیلیوں پر جھپٹا مار رہے تھے۔

”میں وہ چکرے ہرن دیکھنا چاہتی ہوں، جو صبح اتنی تیزی سے بھاگ گئے۔ آگے جا کر جنگل زیادہ خوب رت ہو جاتا ہے۔“

”زیادہ خوب صورت اور زیادہ خطرناک۔“

”مگر میں وہ ہرن ضرور دیکھوں گی۔ اتنے حسین ہرن میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ مگر سیتا کے انجام سے واقف ہو؟“

وہ سنستی ہوئی اتر کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ ریکان نے کشتی کھول کر دھارے پر چھوڑ دی۔ وہ اس اور اس منظر اور اس ماحول کا ایک لازمی اور فطری جزو معلوم ہو رہا تھا۔ دیہاتی کو نیک بیک خیال آنا کہ زندگی کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں۔

ناؤ پانی کی سطح پر روانی سے بہہ رہی تھی۔ ریکان نے آہستہ آہستہ نیک ساری گنگا نا شروع کیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

کنارے پر جھکے سُدری درختوں پر رنگ برنگے پرندے چکر کاٹ رہے تھے۔
”تم کو احساس ہے شو کی کہ ان دریاؤں اور لہ دھرتی نے کیسے کیسے دکھ دیکھے ہیں؟ میں ان دکھوں کو سمجھتی ہوں۔“

”کب۔۔۔ آپ بھی ناؤں کے رہنے والے ہیں؟“

”ہاں، تم نے مولوی ابوالباشم کو دیکھا۔ میرے بابا مولوی ابوالباشم کا نمونہ ہیں ایسے ہی صابر۔

اور بولے۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ چپ ہو گئی۔ وہ یکسر عید نہ کرنا چاہتی تھی کہ ایک غریب کسان کا لڑکا لندن اسکول آف سنج گیا۔ یقیناً وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ لندن کیسے گئے تھے۔“

”لندن۔؟“ ریکان نے چونک کر دہرایا۔ ”لندن کا یہاں کیا ذکر ہے؟ یہ اپنا ملک دیکھو اور دیکھو

لے اس کے ساتھ کیا کیا؟“ وہ خاموش رہا۔ ”میں ۱۹۳۵ء میں لندن گیا تھا۔۔۔ تم میرے حالات زندگی

جاننا چاہتی ہو؟ میں نے علی گڑھ سے ہائی اسکول اور ایف اے کیا تھا۔

”علی گڑھ۔“

”ہاں یہ تمہارے لئے تقریباً اجنبی نام ہے۔ گریہ ملک اور قوم کی ایک اور بیدار ہم داستان کا ایک حصہ ہے اور اس داستان سے تم کو واقف ہونا چاہیے۔ پھر میں نے ڈھاکہ کے لوٹ کر بی اے اور کلکٹ سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے تمہارے چچا کی کتاب ”بنگلہ کی اقتصادی تاریخ“ پڑھی تھی۔ وہ رک کر کسی سوچ میں کھو گیا۔ اور پھر جتو چلانے شروع کئے اور کہنے لگا ”اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی ہتھیجی۔ کوئی سڑتی سی لونڈیا کسی اسکول میں پڑھ رہی ہے اور ایک دن میری زندگی میں سائیکل کی طرح داخل ہوگی۔ دیکھو کھٹن کی مناسبت سے کسی بر محل تشبیہ دی ہے۔ وہ اداسی سے ہنسا۔“

”میرت خوب آگے چلے!!“

”اس کے بعد ایک۔ ایک وظیفہ پر لندن چلا گیا۔ وہاں میں اور ادما اور رکتے اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بڑا ہی تاریخی قسم کا گروہ تھا وہ!“

”اور واپس آتے ہی کووڈ ٹیم سے انقلاب کے شعلوں میں دیا پیلی نے کہا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اس نے کہا ”کلکتہ میں چند سال ہوئے پروگریسو راء خیر زکی دوسرا کالفرنس ہوئی تھی۔ اس میں تمہیں آنا چاہئے تھا۔ بڑا دلور خیر تجربہ تھا۔“

”آپ بھی لکھتے ہیں؟“

ریحان نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ”ارے تم کتنی جاہل ہو۔ یہ رائٹی مجھے ابھی کس شے کی ہے اور وہ جو میں نور الرحمن بنارس لائبریریٹ کر رہا تھا تو کیا لکھا اس کو درم تھا؟ دیا پیلی کیا تم نے وائیری کتاب نہیں پڑھی؟ ادما نے تم کو نہیں دی پڑھنے کو؟“

”کیا افسانے لکھتے ہیں؟“

ریحان نے چپو چھوڑ کر آسمان کی طرف احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔ ”اوہ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ اس نے فریاد کی۔“

”نہیں سچ بتائیے۔“

”میں افسانے نہیں لکھتا ہوں نہ شاعری کرتا ہوں۔ شعوس کام کرتا ہوں۔“

”تھوڑا سا انکسار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کو کتاب کا کیا نام ہے؟“

”انیسویں صدی میں بنگال کی زرعی حالت۔“ ریحان نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”ارے دیپالی تم بڑی جاہل نکلیں۔“

”اور یہ پروگرام کیسے لکھنا ہوتا ہے؟“

ریحان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور گراہا۔

”نہیں بلیز۔ بتائیے نا۔“

”ابھی جب کالج واپس جاؤ گی تو گرد دیو نے جو پیغام کانفرنس کے نام بھیجا وہ پڑھ لینا، سمجھ میں آجائے گا۔“

”گرد دیو نے کیا کہا تھا۔؟“

”انہوں نے کہا تھا کہ میری طرح گوشہ نشین بن کر کام نہیں چل سکتا۔ اومادی کو چاہئے تھا کہ تمہیں

سب باتیں بتاتیں۔“

اومادی۔ اومادی۔

”آپ نے بہت سے لوگوں کو آئیڈیالائز کر رکھا ہے۔“

”ہاں۔“

”کون کون۔“

”بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ دیپالی تم کلچرل فرنٹ پر کام کر چکی؟“

”آپ جو کہیں گے کروں گی۔“

کشتی اب درختوں کی سڑنگ میں سے گزر رہی تھی۔

”مغرب میں بھی یہی صوبہ ہو رہا ہے؟ جدید؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”مغرب میں۔؟ اسپین میں ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی ہے دیپالی۔“

”مجھے اور بتائیے۔ لندن کے متعلق۔ جب آپ وہاں طالب علم تھے۔“

”جب ہم وہاں طالب علم تھے۔“ ریحان چوتھ ایک طرف دیکھ کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ واقعی ”ری“ کیسے

بات تھا۔ اس زمانے میں وہاں بڑے معقول لوگ جمع تھے۔ پاک۔ راج آئندہ اور تاجا ظہیر نے مل کر بی ڈبلیو اے

قائم کی تھی۔

”آپ انگلینڈ ہی میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ دیپالی نے بات کاٹی۔

”ہاں۔ اور واپس آکر دیکھا کہ ہمارے ساتھی۔ علی گڑھ اور لکھنؤ۔ اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب

جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آچکے

تھے۔ شوکتی۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کیلئے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں۔

سرنگ کے اختتام پر بیچ کر ریمان نے کشتی موڑ لی۔ ”آگے گھڑیا لوں گی راجدھانی ہے۔ اب واپس

چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

والسی میں ریمان خاموشی سے پتو اچلانے میں مصروف رہا۔ بادل گھرائے تھے اور سورج کبھی کبھی

بادلوں میں سے نمودار ہو کر چمکنے لگتا تھا۔ لعلق اور رام چڑیاں سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ تیسرے پہر

کوریمان نے دیپالی کے دروازے پر آن کر آواز دی۔ ”شوکتی۔ یہاں آنا تو۔“ دیپالی کھاٹ پر ساری بچھا

کر اور اپنے تھیلے کا تکیہ بنائے بے خبر سو رہی تھی۔ زینب بی بی گھڑائے کر شام کے پکانے، رینڈھنے کے لئے پانی

لینے ندی پر گئی ہوئی تھیں۔ ریمان ذرا جھجکتا ہوا اندر آگیا اور کواڑ سے لگ کر خوابیدہ دیپالی کو دیکھنے لگا۔

”شوکتی!“ اس نے چند منٹ بعد پھر اترتے سے آواز دی۔ وہ مڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”وہ رسالے کہاں ہیں؟“ ریمان نے یوں ہی بے مقصد سوال کیا۔

”ابھی لاتی ہوں۔“

ریمان ذرا احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجاتا رہا۔ پھلنے کمرے میں چلا گیا۔ دیپالی اخبار اور رسالے

اُس کے پاس لے گئی۔

”آؤ باہر روشنی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔“ ریمان نے کہا۔ وہ یہ رسالے حاصل کر کے واقعی بے

خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

برآمدے میں چٹائی بچھا کر وہ سورج ڈوبنے تک رسالوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ریمان دیپا

و مختلف مضامین کے نکات سمجھاتا گیا۔

سامنے گھاٹ پر نازاؤ کر رہی۔ مولوی صاحب اترے۔

زینب بی بی نے اندر سے آواز دی۔ ”کھانا تیار ہے۔“

کھانے کے بعد دیپالی پھر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور افق پر قہرے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔
نزدیک کے کھمبے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔

زندگی کا۔ ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گزر گیا۔ ایک شعر پڑھا جا چکا۔
نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی۔

”گڈ نائٹ۔ دیپالی۔“ اور وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

دوسرے دن وہ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور چھیروں سے باتیں کئے۔
اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی
نے کے لئے زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دفعتاً پوچھا۔ ”ساری
آیا۔ تمہاری چوری کا پتہ چل گیا۔؟“

”جی ہاں۔“ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے
نش کرنے لگی۔

”مجھے ان ساریوں کے کہنے کا بڑا سبب ہوا تھا۔“ ریحان نے کہا۔ ”میں نے سر چاہا، جو لڑکی اتنی
بانی دے سکتی ہے۔“

”میں نے کیا قربانی دی ہے۔“ دیپالی نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔

”کیوں۔ کیا میں جانتا نہیں کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے۔“ وہ
خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اتنی کے پاس بھی دو باجوہ ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ

تھیں تو میری دادی مائاں نے ان کو دی تھیں۔ وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی۔“

دیپالی سکے میں رد گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر پتھر پر سے اٹھی۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ گھر چلے۔“

وہ اونچے نیچے ٹیلوں، اور جھاڑیوں کو بھلا ننگے جھونپڑے کی طرف رواں ہو گئے۔ دیپالی نے
ایک دم چپ سا دھلی تھی۔

تیسرے روز وہ دونوں ٹہلے ہوئے ندی کے ساحل پر کافی دیر نکل گئے۔ جب، اچانک دور ایک لانچ نظر آئی۔ دیپالی ہم کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ یہ سرکاری لانچ تھی۔ غالباً معمول کے دو پراس طرف سے گزر رہی تھی یا شاید کچھ سرکاری افسر شکار کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔ لانچ شور مچاتی پانی پر گزر کر درختوں کی سرنگ میں غائب ہو گئی۔ دیپالی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

”سارے شوکتی۔ ایک ذرا سی سولین لانچ سے ڈر گئیں۔“

دور سے گویاں چلنے کی آواز آئی۔

”ادام۔“ دیپالی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔ ”گھبراتی کیوں ہو بھائی! افسر لوگ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم لوگ یہاں بالکل ہیں۔ یہ دنیا اور جنگل ڈیڑھ سو سال سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔“ ریحان چند لمحوں تک جنگل کے اور گنجان ستائے کی آواز سن رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”کل ہم جن کسانوں سے ملے تھے۔ ان کے پڑکھے ستواں فرانسی تحریک میں لڑے تھے۔“

”ریحان۔ آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شبہ، کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟“ دیپالی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”نہیں جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہو سکتی وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ ”سنو دیپالی۔ یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کھلنا اور نوا کھالی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔ مغلوں اور لوابوں کے عہد میں کتنے تجارتی علاقے تھے؛ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندو کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔“

وہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر ساحل پر آگئے۔ چاروں طرف پھولوں کی ردشہی نے بڑی سہانی عجیب سی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔

”تم جانتی ہونا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے فولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فولاد پروڈکشن سے برتر تھا۔“

دفعتاً دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کیا ہوا۔؟“

”کچھ نہیں! کوئی اس وقت یہاں آن کر دیکھے کہ اس شدید روحانی ماحول میں ریمان الدین احمد تیرہویں صدی کے فولادی پروڈکشن کے متعلق سمجھا رہا ہے۔ اگر میں یہ بات واپس جا کر لوگوں کو کسی کو یقین آئے گا۔؟“

”ہماری جدوجہد کا تدارک کرنے کے لئے۔“ ریمان کہتا ہوا۔ ”پچھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت ہا کہ امپریزم کے سائے میں اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور ٹیاں اور مشن کالج۔“

”یورنڈ بنرجی۔“ دیپالی نے زیر لب کہا۔

”کیا۔؟“

”کچھ نہیں۔“

”وہ خود کھیل ہندوستانی موسیقی جو مہابھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قائم رہی تھی۔“ انگریزی سرمایہ داری نے جاہ کر دیا۔ کیا سوچ رہی ہو۔؟“ ریمان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اور بتائیے۔“

”ہاں قومیں یہ کہہ رہا تھا۔“ ریمان نے سرکھج کر بات دو بارہ شروع کی۔ ”مگر یورپ میں سرمایہ داری نے نئی سماجی طاقتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئیں۔“

”لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے ہندوستانی گاؤں کی اکوفونی کی برطانیہ کے ہاتھوں تباہی کو کارل مارکس۔ سماجی انقلاب بتا رہے۔ کیونکہ ذات بندی کی بنا پر ہمارے گاؤں رجعت پسند تھے۔ اور ان میں کی گنجائش نہ تھی۔“

”گڈ کولیشن۔“ ریمان نے کہا اور جھونپڑے کی طرف لوٹتے ہوئے دیپالی کو ان دقیق مسائل کے کات کھلنے میں مصروف رہا۔

جو تھکاد۔ ریمان نے دیپالی کو برطانوی سرمائے کے تین ادوار۔ کمپنی کے مرحلے سرمائے، انیسویں صدی، ٹریڈ سرمائے اور جدید فنانس کے سرمائے اور نئے ہندوستانی سرمایہ داروں کے متعلق سمجھانے میں مصروف کیا۔

پانچویں دن جب وہ کشتی رانی کے لئے نکلے تو اچانک بید طول ہو کر اس نے دیپالی سے پوچھا۔
 ”شوکتی۔ تم کتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔“

”لوگ گیت جمع کرنے میں جتنے دن بھی لگ جائیں۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔
 چھ دن وہ ناؤ کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے۔

پھولوں کے ایک کچھ میں سے ناؤ گزر نے لگی تو اس نے اوپر جھکی ہوئی ڈالیوں میں سے چند کا
 ٹوکرا اس کے بالوں پر برسا دیئے۔ ناؤ ایک گھاٹ کے قریب پہنچی۔

بنگال کے ہندو عوام کا عقیدہ ہے کہ جب رام اور سیتا نے بن باس لیا تو انہوں نے کافی
 سندربن میں بھی گزارا تھا۔ کاٹھیاواڑ، وسطی اور جنوبی ہند۔ سے لے کر چائینگام تک ان علاقوں کے
 کا اپنے اپنے جنگلوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان جنگلوں میں رام اور سیتا انھیں اب بھی چلتے نظر آ
 سندربن کے اسی تقدس کی وجہ سے نو اکھالی اور کھن کے جنگلوں اور دریاؤں اور سندپ
 جزیروں میں پرانے مندروں، مٹھوں اور سنیاسیوں کے جھونپڑوں کی بہتات ہے۔

ریحان نے ناؤ جس جگہ کن سے سے باندھی اس کے قریب بھی جنگل میں ایک پرانا مندر نظر
 آتا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کا بازار تھا۔

”بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کچھ کھالیں۔“ ریحان نے کہا۔ کھارے پر اتر کر وہ جنگل
 داخل ہوئے۔ دفعتاً مندرائ کے سامنے آگیا۔

دیپالی نے غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ہٹھک لیا۔

”دسویں صدی“ ریحان نے کافی آلود معبد پر نظر ڈال کر ماہرہ انداز میں کہا
 ”افوہ۔“ کے حالت خراب۔“ دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

”آؤ۔ اندر۔“ یہ تو بہت ہی تاریخی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسلچر دیکھ

صری سیتی پیرٹ۔“

ایک بوڑھا اندھا دھندل بھاری اندر سے پرچھائیں کی طرح برآمد ہوا۔ ریحان چلیوں سمیٹ
 پرچھ کر موتیوں کی فرنی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بھاری کو اپنی طرف تانے دیکھ کر اس نے دیپالی سے
 میں کہا۔ ”اگر کچھ اعتراض کرے تو کہہ دینا میں تمہارا جی دلوں ہوں۔ روہن سرکار۔“

”شٹ اپ“

پجاری نے نذرانے کی امید میں مسکرا کر دیپالی کو اندر بلا دیا۔ اور ریمان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔
دوسرے لمحے وہ دونوں درگاہوانی کی مورتی کے سامنے کھڑے تھے۔ ریمان نے چہرے پر مصنوعی
عقیدت طاری کر لی۔

پجاری نے دونوں کی پیشانیوں پر تنک لگا کر انھیں پرشاد دیا اور دیوی کے چرنوں میں پڑے گیندے
کے دوہار ان کے گلے میں ڈال دیئے اور جھکا جھکا ٹٹول ٹٹول کر لوہان سلگانے میں مصروف ہو گیا۔
”لو بھئی مبارک ہو۔ شادی ہو گئی۔“ ریمان نے چلا کر انگریزی میں کہا۔
دیپالی شرم سے لال بھوکا ہو رہی تھی۔

ریمان نے جیب سے نکال کر پجاری کو کچھ روپے دیئے اور دیپالی کا بازو تھام کر اسے باہر لے آیا
— ”ارے بھائی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر انڈین فلم میں دیکھا ہے کہ میرا دور ہیر و ن مندر میں
جا پہنچتے ہیں اور پجاری عین اسی طریقے سے ہار پہنا کر ان کا بیاہ کر دیتا ہے۔ بھئی کمال ہو گیا۔“
”ریمان۔ ول یو پلزز شٹ اپ۔“ دیپالی نے کہا اور چند قدم چلنے کے بعد ایک شکستہ ستون پر
بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ریمان حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اس ہندو لڑکی کی جذباتی کیفیت اور موقع کی نزاکت
کالے اندازہ ہوا تو وہ گھبرا کر اس کے قریب دوڑا تو جھک گیا۔ اور بجا جت سے کہنے لگا۔ ”ارے بیوقوف۔
منہیں ہوا سیاہ۔ کون گدھا کہتا ہے کہ سیاہ ہو گیا۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہو۔ ارے تم ابھی تک مذہبی
توہمات کی قائل ہو۔ مندر اور پجاری۔۔۔ اور۔۔۔ کمال ہے۔“ وہ سر کھجانے لگا۔ ارے جتنی
لڑکی۔ شادی صرف کورٹ میں ہوتی ہے۔ تم اور میں مندر اور مولوی کے قائل ہی کہاں ہیں۔ اور۔
اور کوئی۔۔۔ تنگ بھی ہے بھلا۔۔۔ چلو اٹھو۔۔۔ عجیب بے قوف لڑکی ہو بھئی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پلگٹڈی پر لے آیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایک چائے خانے میں گئے اور لکھری
کی بیچ پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیپالی بالکل چپ رہی۔ ریمان اسے بار بار پریشانی سے دیکھتا
تھا۔ پھر وہ چائے خانے میں جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ نکلوت اسے خیال آیا کہ وہ سید غریب محتاط
ہو گیا ہے۔ یہ گاؤں کھلنا شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور پولیس کے سپاہی بھی زیادہ دور

نہیں ہوں گے۔ چائے ختم کر کے وہ دونوں گھاٹ پر آئے اور کشتی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔
 ”دیپالی“ کشتی نندی کے دھارے پر آئی تو ریمان نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ میں نے
 مذاق کیا تھا۔ اگر تم کو برا لگا ہے تو مجھے معاف کر دو۔“
 وہ ایک دم پھر رونے لگی۔

”اومائی گاڈ۔۔۔“ ریمان نے بازو پھیلا کر آسمان کو دیکھا۔ ”حد ہے۔“
 وہ ہنس پڑی۔ اب وہ دروہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ ریمان خاموش رہا۔ اسے احساس ہو
 چکا تھا کہ اُس کی اور اس لڑکی کی زندگی اس لوہا کی مانند طوفانوں سے بے پرواہ، دریا کے پُر شور دھارے
 پر کسی نامعلوم ساحل کی طرف بہہ رہی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ رہیں گے۔

اب چاند بہت دیر میں طلوع ہوتا تھا۔ سُندر بن پر گھٹپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس رات
 جب مھو نیڑے میں سب لوگ سو گئے تو دیپالی چپکے سے اٹھی۔ طاق میں رکھے خالی دیوں میں سے ایک دیا
 کال کر اُس میں تیل ڈالا۔ اور بتی لگائی۔ پھر دیا اور کانا ایک ٹکڑا لے کر باہر چلی گئی۔ اور نندی کے کنارے بیٹھ
 کر اس کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ دیا جلا کر اس ناؤ میں رکھا اور اُسے پانی میں بہا دیا۔ اور گھاٹ پر
 گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے حد صیوان اور منکر مندی سے اُسے دیکھنے لگی۔ دیا دریا کی دھار پر دو رنگ
 بہتا چلا گیا اور پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اچانک دیپالی کو احساس ہوا کہ ریمان اپنے کمرے سے نکل کر بڑے
 میں کھڑا اُسے نندی میں چراغ بہاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سیڑھی چڑھ کر بھاگتی ہوئی اپنے
 کمرے میں چلی گئی۔

دوسری صبح وہ چولہے کے پاس بالکل نارمل اور بشاش نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔
 ریمان نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”گڈ مارننگ۔“
 ”گڈ مارننگ۔“

زینب بی بی اور مولوی صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب اس سے لڑائی کی خبریں
 پوچھ رہے تھے۔ ریمان نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو لگایا۔ دیپالی زینب بی بی کے

کے ساتھ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

اچانک ریحان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ”دیپالی۔
 کیا ہوا؟“ وہ ڈڈی لئے لئے برآمدے میں گئی۔
 ”ہٹلر نے سودیت یونین پر حملہ کر دیا۔“

لوک گیت جمع کرنے کی مدت ختم ہوئی۔ دیپالی اور ریحان گھاٹ پر کھڑے تھے۔ قرب و جوار کے
 آدموں میں بچی ہوئی دکنش حیر چٹائیاں فروخت کے لئے منڈی لے جانے والے چھتریاں لگائے کاریگروں
 ہجوم ساحل پر جمع تھا۔ ابھی گیارہ بجی اپنی کشتیاں لے کر مکمل رہے تھے۔ مولوی بابو الہاشم حسب عادت خاموشی
 سے سر جھکائے اپنی کشتی کے بادبان درست کرنے میں مہمک تھے۔ وہ دیپالی کو باگھیر گھاٹ تک پہنچانے
 لے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا۔

رات وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بالکل چپ چاپ کھڑا اندھیری نندی پر سے گذرتی ہوئی کشتیوں
 دیکھ رہا تھا۔ دیپالی اس کے ٹرنک پر ریڈیو کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ریحان سے کہا تھا۔ ”آپ کو اب
 ڈاکو ارٹرز سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اس نئی جنگ کی وجہ سے پھولشن بدلنے والی ہو گئی نا۔؟“
 وہ چونک اٹھا۔ ”جنگ۔؟ کیسی جنگ۔؟“ اس نے صہجہلا کر پوچھا۔

دیپالی نے تعجب اور ادا سی سے اس پر نظر ڈالی۔ ”آپ حقیقت سے اتنی آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔“
 ”ایسا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا شوکتی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اسی طرح کھڑاندی
 بیکھتا رہا۔

”کل۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ دیپالی نے کہا۔

”کیوں۔؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”اگرے۔ ریحان۔ میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔“

”وہ اس کی طرف مڑا۔“ ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، تم یا میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔ شاید کہیں
 نہیں رہ سکتے۔“ پھر چند لمحوں بعد اس نے برآمدے میں جا کر مولوی بابو الہاشم سے دیپالی کی واپسی کے انتظامات
 تعلق بات چیت شروع کر دی تھی۔

یہیں دن پہلے کی بات تھی۔ آج وہ سندربن سے واپس جا رہی ہے باگھیراٹ پہنچ کر وہ اسٹیمر کے ذریعے بار لیرال اور فرید پور کے دریاؤں پر سے گزرتی نارائن گنج چلی جائے گی۔

ریحان اب پریشانی کے ساتھ کلکتے کے خفیہ ہیڈ کوارٹرز سے کسی اطلاع کا منتظر تھا۔ پارٹی کے نمائندے بڑے بڑے دور رس تھے۔ ان کے پاس سے اسکل ہو کر کسی نئے ڈائریکٹو کا کلکتہ ہوتے ہوئے سندربن پہنچنا محنتوں کا نسخہ تھا۔ سندربن پر بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں یہاں جانے کب تک رہوں گا۔" ایسا لگتا ہے کہ جیسے کلکتے کے ساتھ مجھے بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے سچ بڑی طول آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔

اور اب دیپالی چھتری کے نیچے چھپی گھاٹ پر کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر چھتریوں کا میلہ سا لگا تھا۔ صبا ماو بار آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ چھتری لگتی ہے تو سندربن کے جنگل اور کھال اور دریا اور سارا اور سندربن میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک بڑے سے وائرڈ لینیڈ اسکریپ کو واش کرنے بعد پانی کی چلیمی پی میں چھوڑ دیا ہو۔ اور سارے رنگ پانی میں پھیل کر آپس میں لگدڑ ہو جائیں۔

ریحان چھتری لگائے دیپالی کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک اس نے بڑے غصے سے کہا: تم بھی جا رہی ہو چلو بیٹی کو لٹم۔" مولوی ابوالہاشم نے اسے آوازی دی۔ وہ اور زینب بی بی لے کر باضابطہ کلکتہ ہی لپکارتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریحان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہو کر اس سے نکاح کرے گی۔ جانے ریحان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا ٹی پڑھا رکھی تھی۔ زینب بی بی نے تو ایک رات ریحان سے بڑی رازداری سے کہا تھا کہ کلکتہ کو مولوی صاحب کلمہ پڑھا دیں اور شربت کے پیالے پر نکارہ ہو جائے۔ لیوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ ان بیچاری نے برسوں سے سینے کر رکھ ہوئی ایک نئی سوئی ساری بھی نکال کر ریحان کو پیش کر دی تھی۔ یہ ساری انہوں نے اپنی بیوی کے لئے رکھی تھی اور جب ریحان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے تب ہم وہ یہ ساری اپنی طرف سے تحفہ دینے پر مصر رہی تھیں۔ ریحان کے انکار پر انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں غریب کو کرم ہے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے ہو بھئی اور روئے لگتے تھیں۔ لیکن ریحان بے حد سٹیٹا یا تھا۔ اس مندرا واقعے کے بعد اب دیپالی سے یہ کس طرح کہے کہ یہ سرخ ساری بھی لے لو، جسے پہنا کر زینب بی بی تمہیں دلہنا بنا چاہتی ہیں۔ عجب گھپلا ہو رہا ہے یہ خدا کی قسم۔ اس نے پیدا کچھ کر سوچا تھا۔ مگر زینب بی بی کا دا

رکھنے کے لئے وہ ساری ان سے لے کر ٹرنک پر رکھے ہوئے اخباروں کے نیچے چھپا دی تھی۔ زینب بی بی کے جانے کے بعد دیپالی بیڈ یو سننے کے لئے اس کے کمرے میں آئی اور ٹرنک پر بیٹھنے کے لئے اس پر سے اخبار اٹھائے تو نیچے سرخ ساری پر اس کی نظر پڑی اور ریحان خود شرم سے سرخ ہو کر فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دیپالی چھتری ذرا اونچی کر کے اس کی طرف مڑی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دونوں یکساں دیکھتے ہیں کہ زینب بی بی اپنی خشک چھتری لٹکائے بغل میں ایک بندل والے اقلاد خیزال پگڈنڈی پر سے بھاگتی چلی آ رہی ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے اجند میں لپٹی ہوئی سرخ ساری دیپالی کے ہاتھوں میں ٹھونس دی اور کچھ کہنے سے بغیر اسی سرعت سے گھاٹ کی بھیڑ میں غائب ہو گئیں۔

چند قطرے ٹپ ٹپ بندل کے کاغذ پر گرے۔ دیپالی نے اوپر دیکھا۔ شاید بارش آگئی۔ مگر وہ ریحان تھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ یہ آنسو اسی کی آنکھوں سے گرے تھے۔

وہ دونوں چپ چاپ کھڑے دریا کے کنارے منظر کو دیکھتے رہے۔ کشتیوں نے لنگر اٹھا دیئے تھے۔ بادبان کھول دیئے گئے تھے۔ قسم قسم کی کشتیاں سطح آب پر کھجور کی پتھریں۔ مولوی ابوالہاشم نے اپنی کشتی جیٹی سے لگا دی اور دوبارہ پکارا۔ ”کو لٹم بیٹی۔ اللہ کا نام لے کر آ جاؤ۔ اللہ تم دونوں کا نگہبان۔“ اللہ۔ دیپالی نے چپکے سے دل میں دہرایا اور سرخ ساری کا بندل مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ کر آگے بڑھے اور کوڈر کشتی میں بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب کا چھوٹا لڑکا جواب تک چٹائی کی چھت کے اندر دیپالی کا سامان رکھنے میں مشغول تھا باہر نکلا اور دونوں باپ بیٹوں نے چپو منبھالے۔ ریحان نے گھاٹ کی میڑھیوں پر آکر اوداع کے لئے ایک ہاتھ اٹھایا اور پھر گر ادا کیا۔

عین اسی وقت ایک نوک کشتیوں کی بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتی سامنے آکر مولوی صاحب کی کشتی سے لگ گئی۔ مولوی صاحب کا ہم شکل ایک داڑھی والا نوجوان کوڈر گھاٹ پر اترتا۔ اس نے اپنے باپ کو اور دیپالی کو آداب کیا اور ریحان کے پاس جا پہنچا۔

”ریحان بھائی“

ریحان جواب تک سر جھکائے کھڑا تھا چونک پڑا۔

”تم اس وقت کیسے؟“

ابوالقاسم نے اپنی تہ پر بندھی بیٹی کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا اور آہستہ سے کہا: ”او ماہری

نے آپ کو کلکتے فوراً بلایا ہے۔ کل رات میرے پاس سیتندر —
 دیالی نے صرف اتنا ہی سنا۔ اُمادی نے آپ کو کلکتے بلایا ہے۔ اُمادی نے آپ کو فوراً —
 اُمادی نے آپ کو — اُمادی نے آپ کو فوراً — اُمادی نے —
 کشتی گھاٹ سے الگ ہو کر یانی میں پہنچ چکی تھی۔
 اُمادی نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اُمادی نے —

”شوکتی —“ گھاٹ پر سے ریمان کی آواز آئی۔ ”ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“
 ”میں سیدھی ڈھاکے جاؤں گی۔“ اس نے یکھت ذرا خشکی سے جواب دیا۔
 ”ہاں۔ ہاں۔ لیکن کچھ دور تک —“
 ریمان تازہ انگریزی اخباروں کا پلندہ البوائفا سم کے ہاتھ سے لے کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ گفتگو
 میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ دیالی کے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک اسی طرح کشتی میں بیٹھی رہی۔ پھر مولوی ابوالہاشم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے
 اشارہ کیا کہ وہ گھاٹ پر اتر آئے۔
 بوڑھے مولوی صاحب دنیا دیکھ چکے تھے۔

ارجمند منزل

نواب قمر الزماں چودھری کا کتب خانہ ارجمند منزل کے بیرونی، طویل برآمدے کے ایک سرے پر تھا۔ اس کمرے کے سیاہ و سفید ٹائلوں کے فرش پر بیش قیمت کشمیری قالین بچھا تھا۔ جس میں بنا ہوا "شجر حیات" کا ایرانی نمونہ اب کافی گھس چکا تھا۔ دیواروں کے برابر لحیم شحیم الماریاں استادہ تھیں۔ ایک طرف آنیوس کی بڑی میز پر چاندی کا قلمدان اور کاغذ اور کتابیں لفافست سے موجود تھیں۔ بڑے درجے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا۔ نواب صاحب کی آرام کرسی بھی تھی اور چاندی کی نقشبیں پتر چڑھی نیچی جو کی پر سچوان دھرا تھا۔ دیواروں پر سرسید، جالی، سرسلیم اللہ اور شیر بنگال لے۔ کے فضل الحق کی تھاویا درنیل نقیص۔ ڈھاکے کے مغل قلعے ہلال باغ کا بڑا دلآویز وارٹر کلر، آتشدان کے اوپر اور بوڑھی لنگا کے کنارے شائستہ خاں کے دور میں بنی صحت گنبد مسجد کا وارٹر کلر مقابل کی دیوار پر سجا تھا۔ بی بی پری کے مقبرے اور حسینی والان کی مختصر تصاویر ایک الماری کے اوپر رکھی تھیں۔ جناح صاحب کا دستخط شدہ پورٹریٹ نیز کی عقبی دیوار پر آویزاں تھا۔ مسلم بنگال کے پرانے اور نئے بنگلہ اخبار شدہا کر، نوبو نور، بنگو ستانیر شاہتہ پریکا، اسلام پرچارک، المسلم اور ہتیر کے مجلد فائل اور الہلال، پیسہ اخبار، ہتم میندار اور ڈھاکے سے شائع ہونے والے پرانے اردو رسالوں جادو اور المشرق کے فائل ایک الماری میں مقفل تھے۔ دوسری الماریوں میں بنگلہ، فارسی اور اردو کی کتابوں اور قدیم نسخوں کا اچھا خاصہ خیرہ موجود تھا۔ انگریزی کتابوں کی تعداد مقابلہ کم تھی۔

جوانی اسماء کے ایک اتوار کی صبح نواب قمر الزماں چودھری اپنی آرام کرسی پر نیم دراز پوچھا، نے منہ میں لگائے صوبائی مسلم لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے جو تیسرے پہر کو ارجمند منزل کے بڑے ہال، منفقہ ہونے والا تھا، اپنی تقریر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تازہ اخبارات کا اخباران کے نزدیک اخروٹ

کی کشمیری میز پر موجود تھا۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے اپنی بلند پیشانی پر اونگلی پھرتے ہوئے تقریر کا افسانوی پیرا گراف سوچ رہے تھے۔ چند منٹ بعد انہوں نے فائنل سنسین پن اٹھا کر ٹیکہ بن لکھ کر تفسیر لکھنی شروع کر دی۔

نواب قمر الزماں چودھری بڑی بڑی آنکھوں والے ایک وحیدہ و طبع پچاس سالہ ثقہ، مضبوط اور سٹو کرٹ تھے۔ ان کے والد نواب نور الزماں مرحوم ضلع فرید پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے اور چند منزل تعمیر کروائے ایسٹنٹ لینڈلارڈ کی حیثیت سے ڈھاکے میں اقامت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے خود کو نوابین ڈھاکہ کے توڑکار کیس سمجھنے کے شوق میں راگ رنگ حقیر اور دوسرے رئیسانہ مشاغل پر بے گماشت ہو کر پیہا اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اب بھی ان کے جانشین نواب قمر الزماں کاشمیر کے چوٹی کے مسلمان رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ نواب نور الزماں مرحوم کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے اولین اراکین اور سرپرستوں میں شامل تھے۔ ڈھاکے کے اکثر مسلمان رئیسوں کی مانند نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی اردو کا چرچا تھا۔ اور بچوں کو گھر پر بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی تھی۔ نواب قمر الزماں کی ولحد نور الفساریم دہلی اور لاہور کے زمانہ رسالوں، محنت اور تہذیب نسوہ کی خریدار تھیں اور ”مسئلہ بیگم نور الزماں چودھری ڈھاکہ بنگال“ کی طرف سے کبھی کبھی اصلاح معاشرت پر ان کے مضامین ان جریدوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی یعنی بیگم قمر الزماں کشتیا ضلع کے ایک خالص ”بنگالی اسپیکنگ“ زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ مگر جہاں آراء اور اس کے بھائی اور بہنوں کو گھر پر اردو پڑھائی گئی تھی۔ اس وقت جبکہ نواب قمر الزماں اپنی خاموش اسٹیڈی میں سکون سے بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے۔ بالکلانی شور مچ رہا تھا۔ کوٹھی کے وسطی ہال میں لیگ کے جلسے کے لئے ایک قطار میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ پوربنی والی رلم سرن اسٹیج کی میز پر رکھے گلڈن میں پھول سجائے تھے۔ باقی دوسرے ملازمین کمرے کی صفائی میں لگے تھے۔

لیکن اندر تان خانے میں جس قدر جہل پہل اور رونق تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد نواب قمر الزماں چودھری کے فرزند اور جانشین نواب زادہ نیر الزماں کی بارات چڑھنے والی تھی۔ شادی کے جوڑے سب سے پہلے جوبھری پھیرے لگا رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے۔ فہریر سے رشتہ دار آنے

دفع ہو گئے تھے۔ بارات دینا ج پور جائے گی۔

تقریر لکھتے لکھتے نواب صاحب نے اٹھ کر سالوں کی الماری میں سے المشرق کا فائل نکالا۔
ابانہ رسالہ تقسیم بنگالہ کے بعد جب لارڈ کزن نے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلم اکثریت کا ایک
برباد دیا تھا، مسلم بنگال کی ایک مشہور ہستی، حکیم حبیب الرحمن نے ۱۹۰۶ء میں نکالا تھا، تاکہ اردو
ذریعہ بقیہ مسلمانان ہند سے ذہنی اور سیاسی رابطہ قائم کیا جاسکے۔ یہ پاکستان کی اولیں داغ میل
۶۔ نواب قمر الزماں نے اپنی تقریر میں اس رسالے کے پہلے شائع کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس نقل
— "۱۶ اگست ۱۹۰۶ء اگر غور سے دیکھے تو کیسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو زندگی اور موت
مرض و صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے۔ مسلمانوں کے
اب کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرگنائزیشن قائم کریں۔ بنگالی اخبار
اور تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کیجہ منہ تک آگیا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ آخر ہماری حالت
ہوگی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق کون سی بھتی ہے جو رد وادہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں بڑے ہیں۔
لئے کہ وہ بہت سادہ ذاتی نقصان برداشت کر کے صرف اس لئے پارٹیشن کے مؤید ہوئے ہیں کہ یہ مسلمانوں
لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدردی ہونے کے نام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن
سزا دے لئے ایک آرہے، شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم گھٹائے میں رہتی۔"

اقتباس کا بنگالی ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے فائل بند کیا اور ۱۹۰۶ء سے لے کر اب تک کی
اسی جدوجہد کا مختصر تذکرہ قلمبند کرنے کے بعد مزید لکھتے ہوئے اخباروں میں مسلم لیگ کے صفحہ
خبر ڈان کا تازہ شمارہ تلاش کرنے لگے۔ اس شمارے میں مجوزہ پاکستان کا تفصیلی نقشہ شائع ہوا
اور نواب صاحب اس نقشہ کے حوالے سے بنگال و آسام کے متعلق چند اہم نکات اپنی تقریر میں شامل
ہا ہوتے تھے۔ جب وہ پرچہ نہیں ملا، جو کل شام کی ڈاک میں دہلی سے آیا تھا۔ تو انھوں نے ذرا بے دماغ ہو کر
"جیائی۔"

ایک ملازم کتب خانے کے دروازے کا ادوا مچھلیں پر وہ سرکا کر اندر داخل ہوا۔
"تازہ ڈان اخبار۔" نواب صاحب نے کہا۔ "نیر میاں سے پوچھو۔ وہ تو نہیں اٹھا نے
ان سے کہنا ہیں پاکستان کا نقشہ چاہئے۔"

”حضور۔ پاکستان کا نقشہ تو نیر مہیاں نے اس میں سے کاٹ کر باہر برآمدے میں دیوار پر لگا دیا ہے۔ فرمائیے تو انکھیر لاؤں۔ مگر دیوار خراب ہو جائے گی۔“
 ”ادہ۔۔۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ رہنے دو۔ جاؤ۔“
 ملازم باہر چلا گیا۔ نواب صاحب پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

اور اُس وقت عبدالقادر کو چوان کی کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی اور جبہ منسلک کی برساتی میں داخل ہوئی۔

دیپال سرکار گاڑی کے دروازے کی چٹخنی کھول کر نیچے اتری عبدالقادر کو کرایہ ادا کیا۔ عبدالقادر حسب معمول سر جھکائے گھوڑے کو ہٹکا تا آگے بڑھ گیا۔ سر جھکائے دیپال برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا لیکن اندر جاتے ہوئے اسی کی نظر صدر دروازے کے برابر والی دیوار پر لٹکی جیباں پام کے گلے کے اوپر نیر الزماں نے بوزہ پاکستان کا نقشہ ڈرائنگ بنوں کے ذریعہ لگا دیا تھا۔

دیپال کی صفحہ شک لگی دار آنکھیں پھیل کر اسے دیکھنے لگی۔ پنجاب، آسام، بنگال، کشمیر، سرحد و مندر۔ بلوچستان۔ وہ تیوری پر بنی ڈال کر بڑے غور سے اس نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تک ملازم ہال میں کمر سیں لگا کر جا چکے تھے۔ اور طویل برآمدہ خاموش پڑا تھا۔
 اتنے میں ایک گھبرانم آواز نے اسے چونکا دیا۔

”دیپال بیٹی۔۔۔ اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہی ہو۔؟“

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ نواب قمر الزماں اپنے کتب خانے کے دروازے میں کھڑے شفقت سے مسکرا رہے تھے۔

اُسے جیباں آرا کے بابا بہت اچھے لگتے تھے۔ اس قدم بہت بڑ اور نفیس اور خوش اخلاق گو اسے باتیں کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن وہ خوراپنے باپ کی اتنی منہ چڑھی اور لاڈلی تھی۔ اس لئے نواب صاحب سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ذرا خالفت نہ تھی۔ اب اس نے آنکھیں پھیل کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے۔ کاکا۔؟“

”بیٹی، تم کو تو جانا چاہئے۔ ایک روز میری جلد۔ انشاء اللہ جب پاکستان بن جائے گا تو

باکستانی ہوگی۔"

"میں۔ کاکا۔" اُس نے اسٹڈی کے دروازے کی طرف چلتے ہوئے دریافت کیا۔
نواب صاحب نرمی سے ہنسنے۔ اپنی نساہری اولاد میں جہاں آزار ان کو سب سے زیادہ
ری تھی۔ اس وجہ سے جہاں آزار کی سہیلیوں کا وہ بڑا خیال کرتے تھے۔ علاوہ ان میں دیپالی ان کے
نے دوست کی لڑکی تھی۔

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ تمہارا صبح سے انتظار کیا جا رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔ اب جادو جلد
ر۔ جہاں آزار تمہارے لئے بہت سا کام لئے بیٹھی ہے۔"

"ابھی جاتی ہوں کاکا۔ مگر پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گی۔" دیپالی نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہاں۔ ہاں پوچھو بیٹی۔ آؤ۔" نواب صاحب نے پردہ ہاتھ سے ایک طرف کو اٹھا دیا۔ دیپالی
اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ نواب صاحب جا کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دیپالی قریب ایک صوفے پر
بٹھ گئی۔

"تمہارے باپ کیسے ہیں۔"

"اچھی طرح ہیں۔"

"اچھا ذرا سیہ کاغذ پتر سمیٹ لوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے عینک کیس
ن رکھ کر کاغذات بھیک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سرکار اسکول میو، نواب قمر الزماں کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ
ہارجند منزل کے فیملی ڈاکٹر رہے۔ مارے دوستی کے فیس نہیں لیتے تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے
بس کے بجائے تحفے تحائف اُن کے گھر بھجوانے شروع کئے۔ ڈاکٹر سرکار نے ہارجند منزل ہی آنا چھوڑ دیا۔
اب صاحب کو اُن کی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ دُر کا پوجا اور عید کے مواقع پر جہاں آزار نے
دیپالی کو ساریاں تحفے میں دیں تو اُن کو دیکھ کر ڈاکٹر سرکار کا منہ تر گیا۔ انہوں نے دیپالی سے کہا: جب
تم اس کو کچھ دے نہیں سکتیں تو اس سے لیتی کیوں ہو۔ لہذا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

"بھئی ہم کیا کریں۔" نواب قمر الزماں نے اخباروں کا پلندہ ایک تپائی پر سرکاتے ہوئے کہا۔
"ہمارے یہاں تم جانتی ہو۔ بیماری کا سلسلہ کتنا ہلکا ہے۔ جہاں آزار کی ماں اختلاجِ قلب کی مریض ہیں۔"

آئے دن ڈاکٹر کی حاجت۔ مگر تمہارے باپ ایسی اٹلی کھوپڑی کے آدمی ہیں۔ مجبوراً ہم نے ڈاکٹر کھوش کو لگا لیا۔ بتاؤ بھلا اگر ڈاکٹر اور وکیل دوستوں سے فیس لینا چھوڑ دے، تو کرے کیا۔“

”آپ ان کو سمجھائیے۔“ دیپالی نے کہا۔

”خبطی ہیں۔ اُن کو کون سمجھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ بیٹی۔ ایسی پریشان سی کیوں نظر آرہی ہو

اور تمہارا شانتی نکیتھی کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک ہے کا کا۔“

”بنوئے بابو ایک روز ملے تھے، بتلا رہے تھے کہ تم چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے لوگ گیت

جمع کرنے سنتھال پر گزرجا گئیں۔“

”جی ہاں۔ کا کا۔“ دیپالی نے بڑی بے چینی سے مجرموں کی طرح صوفے پر پہلو بدلا۔

”بے چارے بہت سخت پریشان تھے کہ برسات کا زمانہ ہے۔ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی

کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔“

دیپالی اپنے آپ سے نظریں چڑا کر دیکھے سے باہر دیکھنے لگی جہاں کا سنی پھول کھلے تھے۔ کیہ

پرسکون سہانا اتوار کا دن تھا۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو پنکھے سے لگ گئے اور پاکستان کا نقشہ۔

اس نے بابا کو اتنا بڑا دھوکا دینے کے احساس کو نظر انداز کرنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ نواب صاحب

کو مخاطب کیا۔ ”پاکستان واقعی بن جائے گا کا کا؟“

”انشاء اللہ۔“ اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کر رہے پر نیم دراز ہو کر کسی سوچ

میں کھو چکے تھے۔ دیپالی نے اُن کے خیالات میں مداخلت نہیں کی۔ سمجھا اور دیوار پر لگے دائرہ کلرنگ

دیکھنے لگی۔۔۔ ڈھاکے کے آثارِ العنا دید۔۔۔ قلعہ لال باغ۔۔۔ مست گنبد مسجد۔۔۔ بی بی پری کا مقبرہ۔

حسینی دالان۔

نواب قمرالراہ بننگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں۔ دیپالی نے سوچا۔ اور اسے یاد

آیا۔ اُس کی جنم بھوم مین سنگھ کے وسیع و عریض، سرسبز علاقے میں۔ ہندو اور بھو بننگال کے پرسوں اور

روزہ خیز، کھنڈر بھی موجود ہیں تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلام

ماضی کی وراثت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔؟

لیکن ریمان نے سندھ میں ایک روز اس سے کہا تھا۔ تاریخ آپ سے آپ میں سمجھا دیتی ہے
 ہم خود تاریخ ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی تاریخ کی مجموعیت کی سب سے بڑی تصویریں۔
 نواب صاحب آنکھیں بند کئے، سمجھوان کے آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ اور غالباً دیہاتی
 لی سے بے خبر ہو چکے تھے۔ دیہاتی نے انھیں دیکھ دھڑ، نیک نفس، شریف انسان، مسلم
 لیڈر۔ لیکن اپنی نیک نفسی اور خلوص نیت کے باوجود ان کو عبدالقادر کوچوان کے مسائل
 ساس ہے؟ عبدالقادر کوچوان پاکستان کے قیام سے مستفید ہوگا۔؟ مجھے یہ سب کون

۹

ریمان نے کہا تھا۔۔۔ دیہاتی۔۔۔ ہندوستان کے نوے فیصدی انسان مفلس ہیں اصحاب
 کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عرقی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی
 لچر اور اخلاق اور مذہب احد فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور
 عاری بنادیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لئے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے
 ماضی سنہرا تھا کیونکہ آبادی کم اور گیموں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کوئٹل نظام اور
 آبادی نے ملک کا یکدم نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنادیا۔ ہر کوئٹل ملک
 سے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔
 مورج اب نصف النہار پر پہنچنے والا تھا۔ کتب خانے کے وسیع درجوں میں سے آتی ہوئی۔
 ل نے شہنشاہ اور نگریب عالمگیر کے بیٹے، صوبے دار بنگال، شہزادہ محمد اعظم کے بولے قلعہ
 بڑی پینٹنگ کو جھللا دیا۔ دیہاتی مسخو رہو کر اس پینٹنگ کو دیکھا کی۔ ریمان نے کہا تھا۔ (وہ
 سوچ رہی تھی۔ جس طرح پادری ہنرچی بات بات پر اس سے کہا کرتے تھے۔ "یسوع"
 ۔) ریمان نے کہا تھا،۔۔۔ ہمارے بنگال کی، ڈھاکے کی مسجدیں۔ قلعے، پرائے مملات،
 عات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس شہرے، رومانی ماضی کی یادگار ہیں۔
 ہمارے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھنچاؤ اور افلاس برطانوی کولونیلزم کا ثبوت ہیں۔
 بکھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے
 اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگ کا قانون ہے۔ برطانوی نظام ایک ایسی بدکار

ہے۔ جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی فرقے اپنے اپنے کھٹکول،
 جھولیاں پھیلائے ایک دوسرے کو دھکیلیں کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ اور ہر پھٹول میں مصروف
 لڑے جھگڑے، غرغر شہیڈ، اب نارمل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کر رہے
 ہیں۔

”ہاں بھائی دیپالی۔ کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔“ نواب صاحب نے ایک دم زور سے
 گڑ گڑا کر آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دیپالی چونک بڑی۔ پھراس نے کہا۔ ”کاکا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ملک تقسیم ہو جا۔
 نواب صاحب چند سیکنڈ تک سچو ان گڑ گڑاتے رہے اور پھر رساں سے کہا۔ ”بیٹی تم
 علوم ہے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں، ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان
 حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے۔ بیٹی۔ ایک لاکھ در
 اب یہاں مسلمانوں کی عزت اور چہالت کی کیا چاہت ہے؟ خود تمہارے گرد دیو شیگر بنگالی
 کی اقتصادی پسماندگی اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں۔“

”مگر کاکا۔ آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوشحال ہو سکتے ہیں۔“

”متحدہ ہندوستان میں۔؟ ہرگز نہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اور سب
 متحد کب تھا۔ اسے انگریزوں نے متحد کیا۔ دیپالی تم میری بچی ہو۔ میں تم سے کیا بحث کروں۔
 اب تمہارے بابا سے بھی بحث نہیں کرتا۔ جوانی کے زمانے میں ہم دونوں خوب جھگڑتے
 جب وہ احمق الدین اپنے باپ دادا کی کچی کھچھی زمینیں بیچ کر کانگریس میں گھس گئے تھے۔ جیل
 گئے تھے۔“ انھوں نے پھر سچو ان کی منہ سے لگائی۔

”کاکا۔ میں بچی نہیں ہوں۔“ دیپالی نے اٹھ کر کہا۔ ”میں آپ سے یہ باتیں ڈسکن کرنا چاہتا

نواب صاحب نے ذرا اداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ ”میں بھی

تھا تم اس سر پھرے سچاے دینیش بابو کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سر پھری ہوگی۔ مگر آج ایک نصیحت کرتا

قومی جدوجہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمہارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑا

سے چکے ہیں۔“

”قربانی۔۔۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”تیگ اور قربانی تو اس دیس کی پرانی روایت ہے۔
 تو تم بدھ سے لے کر جہاں گاندھی اور جواہر لال جہر دیک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیگ اور
 ۔۔۔ تیگ اور قربانی۔۔۔“
 ”ہوں۔۔۔“ نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

”جہیں کالا۔۔۔“ دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجیے۔“
 ”بیٹی۔۔۔“ نواب صاحب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا اور تمہارا نقطہ نظر بالکل
 نہ ہے۔ میں تم سے کیا کہوں۔“ پھر انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور قریب کی میز پر سے اپنی ناکل
 ٹھاکر لے دھیانی سے اس کے اوراق پلٹتے ہوئے دہرایا۔ ”بالکل جدا گانہ ہے۔ ہم ۱۹۰۶ء کی تقسیم
 سے محوش تھے۔ کیونکہ اس میں ہمارا اقتصادی فائدہ تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عزائم پر فرض
 سمجھا اور اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کی تحریک شروع کر دی اور ہم پھینکے گئے۔ یہ ہم پھینکنے
 جہاں سے میری وقار پائے بیٹی معاف کرنا۔ تم نے ہی یہ ذکر چھیڑا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہو گئیں
 سمجھ دار ہو۔ اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اسی دھاکے میں تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کے
 لہریوں پر ہم پھینکے والوں کے پانچ سو خفیہ گروہ تھے۔“

”پانچ سو۔۔۔ کالا۔۔۔“ دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا اور سوچا۔ میں اس ہم پھینکنے و
 رہہ کی روایت کی پیروی ہوں۔ اور نواب قمر الزماں چودھری مخالف کیمپ میں ہیں۔ ایسا کیوں
 ؟۔۔۔

”بنگال کی مسلم اکثریت کا یقیناً اس تقسیم سے فائدہ تھا۔ تم نے تو بیٹی گاؤں میں ہندو
 ان اور ہندو زمیندار کے بچے میں پھنسنے مسلمان کسان کی حالت نہیں دیکھی۔“
 ”آپ بھی تو زمیندار ہیں کالا۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ نواب صاحب نے ذرا ہنچھلا کر بچپان کی لالٹ کی اور گھنٹی بجائی۔
 ”میں ملازم ایک تابع فرمان جن کی طرح نمودار ہوا۔ نواب صاحب نے ابرو سے بچپان کی طرف
 دیکھا۔ ملازم چلم تازہ کرنے کے لئے باہر لے گیا۔ نواب صاحب دیپالی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا
 ہی کانگریس میں زمیندار اور سرمایہ دار شامل نہیں۔؟“

”میں کا حکم کیسی نہیں ہوں کا کا۔“

”پھر۔ پھر کیا ہو۔؟“ وہ دفعتاً چونک اُٹھے۔ ”تم بیٹی کہیں کیونسٹ تو ہو گئیں؟ بنگال میں آج کل یہ تھی دبا پھیل رہی ہے۔“ انہوں نے بڑی آرزو کی اور تردد سے نظر ڈالی۔

”جی نہیں۔ میں کیونسٹ نہیں ہوں کا کا۔“

نواب صاحب کو اس انکار کا قطعی یقین نہ آیا۔ وہ تاسف کے ساتھ سر ہٹایا کہ دیپالی نے ذرا بے خوفی سے کہا۔ ”کا کا میں تو محض دیش کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

آنادی کی خاطر۔“

”ضرور خدمت کرو بیٹی۔ آزادی حاصل کرو۔ مگر یہ آزادی مسلمانوں کے لئے نہیں ہوگا اتنی تلخی ان کے خیالات میں ہے۔ دیپالی نے لرز کر سوچا۔ تو ہم لوگ، ریحان اور سائے، محض ایک مصنوعی، غیر حقیقی، خیالی دنیا آباد کر رہے ہیں۔؟“

جن تازہ چلمے کراندہ آیا۔ چلم پچوان پر رکھی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دروازے باہر نکل گیا۔ کہ نواب صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہ جاسکتا تھا۔ دیپالی نے نواب صاحب سے در کیا۔ ”کا کا۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جماعت ہے راجہ محمود آباد۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اور جیسے نواب قوہ الزماں چودھری۔“ وہ کھا کر ہنسنے لگی۔ نواب صاحب نے تپائی سے ہلکی ہوئی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھا کر اسے گویا پیٹے ارادہ ظاہر کیا اور پچوان کا ایک کش لگا کر بولے ”بنوے چندر نے اپنے لاڈ پیار میں تجھے بالکل برباد نہیں بتائیے کا کا۔“ وہ مچل کر بولی۔

نواب صاحب تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”دیپالی۔ تمہارے ٹھاکر دادا بھی زمیندار تھے اور ان کی اور میرے والد مرحوم کی آپس میں خاصی دوستی دونوں کے ہاں ناچ گانے اور ناٹک کی محفلیں جتنی تھیں اور عیش ہوتے تھے اور یہ دونوں ہزر میرے آبا مرحوم اور تمہارے ٹھاکر دادا انگریزوں کے وفادار تھے۔“ پھر وہ جیسے یکلخت پرانی بات سوچنے لگے۔ جند محفلوں بعد انہوں نے کہا۔ ”اسکول میں بنوے چندر اور میں ہم جماعت تھے۔ نہ

ید پانچ چھ سال کچھ سے چھوٹا ہے۔ مگر مسلمان رئیس زادہ ہونے کے کارن میری انگریزی تعلیم خاصی پردانی اور دیر میں شروع کروائی گئی تھی۔۔۔ خیر۔۔۔ وہ آنکھیں بند کر کے ابروؤں پر اپنے ہاتھ کی اور انگوٹھا پھیرنے لگے۔ اور پھر کہا۔۔۔ ہمارا ایک اور کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ سید مرتضیٰ حسین۔ جو بڑا کٹر نیشنلسٹ مسلمان ہے اور تمہارے دشمن ابھارتی میں بڑھاتا ہے۔ خیر۔۔۔ پھر تمہارے باپ چچا اپنی قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ وہ جس سیاست میں شامل ہوئے، وہ میرے نزدیک مسلمانوں مخالف سیاست ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے بے چارے دشمن کی شہادت کا صدمہ نہیں ہوا۔؟

بہی جب اس کی آنکھیں اور شبکیں اور باتیں یاد آتی ہیں۔۔۔ دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر بیٹی مجھے سوچ رہی ہے کہ وہ گمراہ تھا۔ اور اپنی جان اس نے بیکار ضائع کی۔ یہ تشدد پسندی اور ہم پھینکا۔ گولی مار دینا۔ اس طریقے سے کیا برطانیہ کی طاقت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ مگر اب ہر حال اس ایک کا زور کم پڑ چکا ہے۔ خیر بھائی دیپالی۔ یہ بڑے گنجلک معاملے ہیں۔ بڑی ہوگی تو سمجھو گی۔

نوعمری کا جوش ہے اور انقلاب زندہ باد کے نعے لگا رہی ہو۔ مگر سردھڑکی بازی سوچ سمجھ لگانا چاہئے۔ اور بی بی تم اس فلاکت زدہ زمانے میں پیدا ہوئیں۔ تم بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمہاری چند رکنج نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ارے بھٹا کر ادا کے زمانے کی امارت تھوڑی سی لہجی تک باقی ہوتی تو شاید تم اس جوش و خروش، خواہوں اور امیروں کی مخالف نہ ہوتیں۔

”لیکن امارائے تو اب بھی بڑی رئیس زادی ہیں۔ دیپالی نے کہنا شروع کیا۔

”ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بیرسٹری تو ش رائے کی لڑکی تم سب کی سرغنہ گرو بن گئی ہے۔ مگر میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ دیپالی میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ میرے لات پر تم کو غصہ ہی آئے گا۔۔۔ خیر تو تم مجھ سے ڈر سکتی کیا کرنا چاہتی تھیں۔؟ وہ پھر سکرانے لگے۔

”کا کا۔ میں صرف یہ کہہ رہی تھی۔۔۔ دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا۔ کہ بھوارے کے لئے اتحاد کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔؟“

”اتحاد۔ اتحاد ہے کہاں۔؟ پنجاب کا آریہ سماج اور مہا ایشور اور شنگال کی ہندو تجدید

اتحاد کی نشانیاں ہیں۔؟“

”میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہیں جانتی گاگا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔“

”مانتا ہوں بھائی۔ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی نوک سنگیت، لوک سامان، چیزیں مسلمانوں کا لٹریچر احصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے انہی نے انحصار ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگالی مسلمانوں کی زبان ہی نہیں۔ بلکہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے۔ کیا ہم انہی سے نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے اور پچھلے آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی نوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے۔ مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت۔ ان کے لئے حقہ کا ایسا رویہ۔ تم نے آئندہ کچھ کرنا ہے؟“

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور تاج اور کارگر ہیں۔ اپنی رافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تمہارا ہندو بنگالی پریس نواب سر سیم اللہ کو انگریز کا چٹھو کہتا ہے اور یہ جواتے بنگالی ہندو نارٹ ہیں۔ یہ انگریز کے چٹھو نہیں۔؟“

دیپالی خاموش رہی۔ نواب صاحب نے ذرا جوش بات جاری رکھی۔ ”تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔ بالکل صحیح ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھی۔ راجہ رام موہن رائے عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ نوابین مرشد آباد کے دوستک ہندو متر فار فارسی پڑھتے تھے۔ تمہارے گرد دیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھاکر کے بجائے ٹیگور کر دیا۔ ٹھاکر کا یہ خطاب۔۔۔ اس خاندان کو بنگال کے مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔ تم یہ بات جانتی ہو۔؟“

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”ایک زمانے میں یہ ٹھاکر خاندان پیر علی برہمنوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے قنوجی برہمن کی ذات پات کی قیود توڑ کر مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ خود اپنا نام دیکھو۔ سرکار مجموعہ دلیا مزمار، تعلقہ دارا اور قانون گو۔ یہ سب بنگالی کا مستحقوں کے مغل عہدے تھے، جواب تمہارا ذات بن چکے ہیں۔ نواب صاحب نے پچوان کی لے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔“

”مگر کاکا — دیپالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہندو تجدیدیت کے ساتھ مسلم تجدیدیت بھی تو شروع ہوئی بنگال میں۔“ سندھ میں اسے ریکان نے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتلایا تھا۔ جس کی زیر قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ اپنے ہندو مذہب و سماج ترک کر دیں۔“ اور پھر لڑوایا انگریزوں نے آپس میں۔“ اس نے آواز بلند کر کے ”ہر بات کا الزام انگریزوں کے سر تعویذ بنا کر لکل غلط چیز ہے۔ تم لوگ چند مفروضوں کی بنا پر بنی ساری دلیلیں پیش کرتے ہو۔“ انہوں نے گھڑی دکھی اور چونک کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ میں بیگار کی مفروضہ سوزی میں اتنا وقت نکل گیا۔ مجھے ابھی تقریر بھی تو لکھنی ہے۔“ انھوں نے تپائی پر سے کاغذ اٹھایا۔

”کاکا — مجھے سنائیے اپنی تقریر۔“

”بھاگ جاؤ۔“

”نہیں کاکا —“ اس نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور نامکمل صفحہ پڑھنے لگی۔ ”اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانان بنگال نے عیسائی مبلغین کے خلاف اور ہندو احمیاء کی مدد سے اخبار اور رسالے نکالے اور ہمارے لیڈر قوم کی بے چارگی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ بھائیو! اقد یہ ہے کہ مشاعرے کے بعد سے آج تک، لاہور سے لے کر جالنگام اور دہلی سے لے کر مدراس تک کے مسلمان محض خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ مگر اب مل کا وقت آگیا ہے۔“

دیپالی نے پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

نواب صاحب المشرق کا فاسل الماری میں واپس رکھنے کے لئے آرام کرسی سے اٹھے۔

”دیپالی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”تم نے مسلم احمیاء کے متعلق کسی کانگریسی کی کتاب پڑھی ہوگی۔“

”جی نہیں کاکا۔“ ریکان کا نام اس کی زبان پر آنے آتے رہ گیا۔ ”ایسے ہی بس ادھر ادھر

سے سنا ہے۔“

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا۔ ریکان نے کہا تھا۔ (یسوع مسیحؑ نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی گورکھ رتے جیسے ناموں کی کتابیں لکھتے تھے اور شہنشاہ گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے

تترنگ یوگ تک کے ہم شکل تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ ساجتہ" تھوڑا ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور ہندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور یہ مذاری فقیر اور ہندو سنیا کے مشابہ، کے بھیانک قحط کے بعد کمپنی کی افواج سے لڑتے بھڑتے پھرتے تھے۔ اور ریحان نے بتایا تھا کہ ایک مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سلسلہ تھا۔ جن کے گرو سید مرتضیٰ آئندہ نے یوگ قلندر اور دوشنو بھنور کی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک شادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر ان کی چلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آئندہ یاد دی تھا۔ اسی لئے وہ مرتضیٰ آئندہ کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر۔۔۔ ریحان نے کھنکار کر اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس خاکسار کو باؤل فقیر سید ریحان دیپالی کہا جائے گا! درپے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے ہنسی آگئی۔ "You and I — we two are —"

ریحان نے کہا تھا۔

the stuff all human love is made

"اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے باؤل مغنی عشق مجازی اور عشق حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، ہشتون شاہ، حسن رضا، لال شاہ۔۔۔ یہ سنگیت کا درویش جن کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرو دیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا۔ کیا یہ مشترکہ ذہن نہیں؟" اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میں سنگھ میں دیکھا تھا کہ برہما دتہ فقیر جو مسلمان تھے منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی و جے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خود ریحان کا عرف رونا میاں تھا۔ وٹو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد کے بے حد سطحی مظاہر ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گہبھرتا تاریخی، نسلی اور نفسیاتی محسوسیت بھی پنہاں ہے؟ جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور مادہ دار ہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ الجھ کر دریچے سے مڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میز کی طرف جارہے تھے۔

"یہ سب طبقاتی سیاست ہے" دیپالی نے ریحان کے الفاظ دہرائے اور اونچی آواز میں

کہا۔ "اب میں جاتی ہوں کا کا۔"

نواب صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور شامانہ دقار سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آکر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بیٹی۔ مجھے آج تک معلوم نہ تھا کہ اتنا زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو مجھے تمہاری

طرف سے بہت تشویش ہو گئی۔ لڑکیوں کے لئے اتنا بڑھکھ جانا بہت مضربے۔ اسی لئے میں نے جہاں آبا کو کالج سے اٹھالیا۔ تمہارا اصل فرض وہ ہے، جس کے لئے اندر تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ جاؤ جاؤ کے اپنے بھائی نیر کی بری کے جوڑے ٹانگو۔ جاؤ۔ بھاگو۔“

”جی کا کا۔۔۔“ دیپاتی نے ہنس کر کہا۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی کتب خانے سے باہر نکل گئی۔

نواب صاحب کیس میں سے عینک نکال کر بڑی میز پر جا بیٹھے۔

ارجمند منزل کے پائیں باغ کے وسط میں سنگِ سرخ کا بڑا خوبصورت تالاب تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی، کنگورے دار منڈیروں کے ساتھ ساتھ سنگی بنچیں نصب تھیں۔ اور بیرونی سیڑھیوں کے دونوں جانب حسنہ حنا کی جھانپیاں تھیں۔ تالاب کے کنارے سیل کے نیچے کئی لڑکیاں ایک تخت پر جمع سلامتی میں مصروف تھیں۔ قریب ہی گھاس پر سیٹل پاشیاں کبھی تھیں اور بڑی سرگرمی سے جوڑے سیل رہے تھے۔ تالاب کی دوسری جانب گلاب خاص کے گھنے سائے میں ایک مسکتہ سا ”شاہی تخت“ بکھا تھا۔ جس پر عجم آرا اطمس دلائی پھیلائے اس پر گولے کا چومکھا جال بنانے میں مصروف تھی۔

یہ ”شاہی تخت“ اس زمانے کی یادگار تھا جب نواب نور الزماں مرحوم کے ہاں ارجمند منزل کے باغ میں جاترا والوں کی منڈیاں اکڑ دیرے ڈالتی تھیں۔ لوک ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ اور شہر کے ہندو اور مسلم اہل جمع ہو کر ”شاہجہاں“ ”ٹیپو سلطان“ ”سراج الدولہ“ ”میر قاسم“ ”کرانی جیون“ اور ”خودی رام باسو“ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (خودی رام باسو، جو ایک دہشت پسند نوجوان تھا اور جسے مظفر پور کے انگریز جج کنگز فرڈ پرتالانہ حملہ کرنے کے جرم میں حوالہ میں پھانسی ہوئی تھی ہزاروں ہندو گھروں میں اس کی اکھ تبرک کی طرح تقسیم کی گئی اور لوگ اس کے تعویذ بنانا کر سیتے لگے۔ اس کے متعلق مقبول ڈرامہ بھی ارجمند منزل میں کھیلا جا چکا تھا) یہاں گریش چندر اور شیگور کا چرچا رہتا تھا۔ اور بنگلہ سنگیت ناٹکوں کی موسیقی لوبی تھی۔

ڈھاکہ کے میں اردو تھیٹر ۱۹۳۷ء سے پہلے سے قائم تھا۔ اور اواخر انیسویں صدی تک یعنی جب نواب نور الزماں فرید پور سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شہر میں متعدد تھیٹر کمپنیاں موجود تھیں جن کے

نشی اور ایکویسیں لکھتو سے منگوائے جاتے تھے اور ایک دس سیر مردانہ پارٹ کرتی تھیں۔ ۱۸۷۵ء تک، جب نواب قمر الزماں کے دادا پہلی بار فریدپور سے ڈھاکے آن کرہ سے تھے۔ شہر میں چونتیس تھپڑ کمپنیاں قائم تھیں۔ اور اس زمانہ سے لے کر آج تک ارجمند منزل میں نانک کا سلسلہ جاری تھا۔ جنگلی زمینداروں کو تھپڑ کا اصرار شوق تھا۔ اپنے گھروں میں ایسٹج کئے جانے والے ڈراموں میں اکثر وہ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ ”جلسہ گھر“ زمینداروں کے مکان کا لازمی حصہ تھا۔ ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اب سیاسی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی ایسٹج اور دیگر ساز و سامان جوں کا توں موجود تھا۔ نواب نور الزماں کے چھوٹے بھائی نوابانہ فخر الزماں مرحوم نے خود ایک ٹیکسٹر کمپنی کھولی تھی۔ خواص و عوام سبھی اسٹج کے رسیا تھے۔ کلکتہ میں دلوں سے رپو اوٹنگ ایسٹج موجود تھی اور ”ترکی حور“ نانک میں پہلی بار بیک گراؤڈ میں فلم کے مناظر سے کام لیا گیا تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں کے ہر محلے کی اپنی نانک منڈلی تھی۔ دیہات میں جہاں تارالے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔

اسی دور کے ”سین سینیر لوں“ کے پردوں، ادنیٰ اپنے چینی کے گدوں، فرنچیز، ”شاہی“ ملبوسات، نفتی تاج، داروہی مونچھوں، کاکھ کی تلواروں اور دیگر لوازمات کا انبار ارجمند منزل کے شاگرد پیشے کے ایک گودام میں مقفل تھا۔ اور جب کبھی کالج میں ڈرامہ ہوتا تو دیہاتی اور روزنی فوراً ارجمند منزل کا رخ کرتیں۔ نواب زادہ قمر الزماں گودام کھلواتے اور وہ اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر لے جاتیں۔

نواب زادہ فخر الزماں مرحوم نے ”مراجہ بھوج“ کے عنوان سے خود ایک سنگیت نانک منگلہ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے لئے نئے نئے آئینوں اور رنگ برنگے نقش و نگار سے مزین دکریم آدیہ کا روایتی سنگھاسن بنوایا گیا تھا۔ جس میں ساری میں لپٹی چار مورتیاں چاروں پایوں کی جگہ تخت نمبر پر اٹھائے کھڑی تھیں۔ بقیہ اٹھائیس مورتیاں سنگھاسن کے سر طرف ہینگلے میں نصب تھیں۔ یہ ”شاہی تخت“ ایسٹج کے دوسرے فرنچیز کے انبار کے نیچے دلوں سے دبا پڑا تھا۔ اور آج صبح ملازموں نے باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کے گلابِ خاص کے نیچے بچھا دیا تھا۔ تاکہ صاحبزادیاں آرام سے بیٹھ کر سی پروسکیں۔

سنگھاسن کے مقابل میں سیل کے نیچے مہر آراہ مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ تین چار خادائیں

تالاب کی سیرھیوں پر بیٹھی پان چار ہی تھیں۔ ایک سیٹل پانی پر بارمونیم رکھا تھا اور ایک لڑکی بیاہ کے گیت لاپنے میں مصروف تھی۔

نواب قسم الزماں چودھری کو کتب خانے میں لیگ کے مابانہ جلسے کے لئے تقریر لکھتا چھوڑ کر دیپالی سرکار طویل گیسٹری میں سے گزرتی کشادہ چوٹی نے پہنچی۔ اور دوسری منزل پر جا کر جہاں آراء کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرہ خالی پڑا تھا۔ تخت اور مسبری پر بنارس ساریوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مٹھائی کے گلابی کاغذوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ساری کوٹھی کی طرح اس کمرے میں بھی شادی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔

نیچے سے بارمونیم کی آواز بلند ہوئی۔ دیپالی دریچے میں لگی جو پھیلے بانغ پر کھلتا تھا۔ اس نے جھانک کر غم اور مہر آرا کو دیکھا۔ مونگیا ساری اپنے ایک اور لڑکی، جس کی پشت کوٹھی کی طرف تھی۔ بڑی تندہی سے شین کا سینڈل گھمانے میں مصروف تھی۔ بادل گھرائے تھے۔ مگر ابھی بارش کے آثار نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک ملازمہ تالاب کے دوسرے کمرے کی اندرونی سیرھی پر بیٹھی چاندی کے برتن صاف کر رہی تھی۔ کتب خانے کے پریشان کن، کریناک ملکی سیاست کے تذکرے کے بعد یہ منظر کس قدر سکون اور نظر فریب تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے جہاں آرا خڑماں خڑماں چلتی تالاب کی طرف آئی۔ دیپالی نے دریچے میں سے اُسے آواز دی۔ جہاں آرا نے اسے سراٹھا کر دیکھا۔ "دیپالی۔ اتنی دیر لگا دی۔" حبدی آؤ۔

"آئی ہوں بھائی۔" اُس نے جواب دیا۔ اور تیزی سے نیچے چلی گئی۔

"آہ۔ دیدی آگئیں۔" راج سنگھاسن پر بیٹھی ناظم آرا نے نعرہ لگایا۔ دیپالی تقریباً دوڑتی ہوئی سیمل کے نیچے پہنچی۔ مونگیا ساری والی اجنبی لڑکی نے پلٹ کر باور بالوں کی ایک لمبی چوٹی نور سے پشت پر پھینک کے دیپالی کو دیکھا اسے آداب کیا۔ اور پھر سینڈل گھمانے میں جُٹ گئی۔ دیپالی تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

"آج صبح سے بارش نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے کارخانہ باہری جمار کھلا ہے۔" جہاں آرا نے بیش قیمت

جینی ریشم کی پستی ساری کا ڈھیر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”لو اس پر یہ سیل ٹانگ دو۔“ دیپالی نے سورت کی جگمگاتی ہیل اور ساری کے ہمرنگ دھاکے کی ریل نیچے سیتل پائی پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان، کیونسٹ تحریک، ہندو مسلم آویزش، عالمی جنگ۔ ان سب جھگڑوں سے بے پروا جہاں اپنا اپنے بھائی کی ہی تیار کر رہی ہے۔ کیسی خوش قسمت ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی فکر میں کیوں ہلکان رہتی ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے فوراً بناشت اور زندہ دل اپنے ادھر پڑاری کر لی اور جہاں آرار اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے فکری سے ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔

”رندی آپا بھی ابھی تک نہیں سچیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”آج اتوار جو ہے۔ گرجا میں دیر لگے گی۔ پھر سنڈے اسکول پڑھائیں گی۔“ اختر آرار نے جواب دیا۔ ”اب آتی ہی ہوں گی بے چاری۔“ ”تم بھی سویرے سے آجائیں تو یہ سیل اب تک ٹک گئی ہوئی۔“ جہاں آرار نے دیپالی سے کہا۔

”میں باہر کا سے بحث میں لگ گئی تھی۔“

”کیسی بحث۔“ اختر آرار نے پوچھا، جو دیپالی کی ہم عمر تھی

”کچھ نہیں۔ پاکستان کے متعلق۔“

”کیا کہا تم نے؟“

”میں انھیں سمجھا رہی تھی کہ پاکستان اگر میزوں کا منصوبہ ہے۔“

”تم آبا سے جھگڑ رہی تھیں؟“ جہاں آرار نے حیرت سے پوچھا۔

”اب اگر ہاے بزرگ غلطی پر ہوں تو انھیں سمجھانا تو چاہئے ہی۔“ مونگی ساری والی لڑکی نے

مشین چلاتے چلاتے منہ لٹکا کر کہا۔ دیپالی نے چونک کر اسے دیکھا۔

جہاں آرا منس بڑی۔ ”ارے دیپالی۔ یہ یا تمہیں ہے باولی۔ میں نے تمہیں اس کے متعلق خط میں

لکھا تھا نا؟ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ جہاں آرار کے دل میں ساری دنیا کے لئے محبت تھی۔

مولہ سترہ سالہ ذرا وحشی آنکھوں والی یاسمین مجید نے دیپالی کو دوبارہ آداب کیا۔

”یہ تمہاری رندی آپا کی اور تمہاری بھجولی ہیں۔“ جہاں آرار نے اس سے کہا۔

”آں ہاں۔ دیدی۔ میرے پاس تو آپ کے تینوں ریکارڈ موجود ہیں۔ اور ایک سیت پتو یہ ہاں۔“

یہوں۔

”ہاں بھائی۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ اتنی مشہور مغینہ ہو اور لوگ تم کو پہلے سے غائب ہی سمجھتے ہیں! بھیجی ہم کیا کریں۔ ہمارے لئے تو تم دی ہمیشہ کی دیالی ہو۔ بقول ہماری اتنی بنوئے بابو کی خطی نڈیا۔۔۔ جہاں آمار نے بس کر کہا۔

”آپ تو مجھے بھی خطی سمجھتی ہیں آپا۔“ یا سمین شگفتگی سے ہولی۔

”یہ جہل کا دھڑکا، جہاں ما۔ ان کے خیال میں سب دیوانے ہیں۔ بس یہی سب سے زیادہ ہوشمند

۔ بڑی بی۔ دیپالی نے کہا۔

”روز پکڑا آگئیں۔“ انجم آرد چلائی۔

روز سی ساجکل پر فرار تے بھرتی سیدھی تالاب کے کنارے پہنچی اور سائیکل تالاب کی منڈیر لٹکا کر تخت پر آن بیٹھی اور فوراً سلائی میں مصروف ہو گئی۔

دوسری منزل کے ایک درجے میں سے نیر الزماں نے سر نکال کر جھانکا۔ ”بھئی واہ۔ دکھو پائی یلدوز پائی کتنی سکھڑ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں سینا پر دنا نہیں جانتیں۔“ اس وار دی۔

جہاں آمار نے سر اٹھا کر بھائی کا منہ چڑایا۔ روزی اور دیپالی نے اُسے فسکا دیا۔

”کتنائیگ دو گئے نیر بھائی۔“ یا سمین چلائی۔

”جتنا چاہو۔“ بیگم قمر الزماں نے درجے میں بیٹھے کے چہچہے سے انکار کیا۔

”اے ہے۔ اللہ رکھے۔ اشارہ کر لیا اچھا لگ رہا ہے۔“ سگن بیگم والی نمسہ خالہ فی دیپ لہ۔ ”لے کچھ گاؤ بھی تو۔ لڑکیوں نے فریدہ۔ لڑکیوں چپ ہو گئی۔؟ دیپالی تم کچھ گاؤ بیٹی۔“

نیر الزماں درجے سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔

”بہت اچھا خالہ۔“ دیپالی نے جواب دیا

بیگم قمر الزماں اور شمسہ خالہ بھی باتوں میں مصروف درجے میں سے غائب ہو گئیں۔

نیچے سکن کی ڈالیوں میں مینا میں شور مچا رہی تھیں۔ تالاب کے کنارے سلطانہ جیسا کار دخت مہک پھر فاصلے پر سا گوان کے جھرمٹ میں سفید پھول کھیلے تھے۔

”دیدل نندل کا کوئی گیت سنائیے۔“ یاسمین نے کہا۔
 ”نندل کا۔ اچھا۔“ دیپالی سر جھکا کر سلائی کرتی رہی پھر گنگنا نے لگی۔
 ”نورگس باگ میں۔ نورگس باگ میں۔“

”ہمار کی آگ میں۔“
 یاسمین تخت پر سے اٹھ کر اس گیت کے ساتھ مٹی پوری طرز کا ہلکا پھلکا رقص کرنے لگی
 واقعی وہ بہت اچھی رقصہ تھی۔

”ہمار کی آگ میں۔ بھرے دل داگ میں۔“
 جہاں آراء سر جھکائے سلائی کرتی رہی۔
 ”ہمار کی آگ میں۔ کہاں میرے پیارے۔“ دیپالی نے گایا۔ یاسمین نے گردن ہلا ہلا
 بچ جاری رکھا۔

”درد دل زور۔“ دیپالی نے گایا۔
 جہاں آراء ایک لخت اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔
 ”ہر ادھا کا ختم ہو گیا۔“ روزی نے اختصار سے کہا۔
 ”دیدری۔“ اختصار نے دیپالی سے کہا۔ ”ذرا طیز اور پر جا کر آپاکی الماسی میں سے ہری اور شہ
 ریلیں نکال لائیے۔“ اُس نے تخت پر بکھرے کپڑوں کے نیچے جہاں آراء کا موتیوں کا جتوہ تلاش کیا اور
 میں سے کنبیوں کا گچھا نکال کر دیپالی کو تھما دیا۔ ”میر بیج والی کنبی ہے۔ چاکلیٹ کے بڑے ڈبے میں
 رہیں ہوگی اور آپا کا سویٹنگ باکس اگر عقل نہ ہو تو اس میں سے ڈی ایم سی کا کاسنی لٹھا بھی نکالتی لائیے
 ” اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا اور کنبی لے کر پہلو کے زینے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جہاں آراء کے کمرے میں پہنچ کر اس نے لمبی جھڑی وکٹورین وضع کی الماری جس کے ایک پٹ
 ”آدم آئینہ لگا تھا کھولی۔ چاکلیٹ کا تین اور سویٹنگ باکس چوڑیوں کے ڈھیر کے پاس ایک دوسرا
 تختے پر سامنے ہی رکھے تھے۔ دیپالی نے چاکلیٹ کے ڈبے میں سے مطلوبہ ریلیں نکالیں۔ بید کا
 باکس بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کاسنی لٹھا تلاش کرنا شروع کیا۔

ریشم کے پھتوں، ریلیوں اور کشیدہ کاری کے دوسرے لوازمات کے نیچے سے ڈی ایم سی

سکی جھلک نظر آئی۔ اُسے نکالنے کے لئے دیپالی نے باقی چیزیں ایک طرف سرکائیں تو بکس کی تہہ
 بھی ایک تصویر دکھائی پڑی۔

دیپالی سُن سی رہ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے تصویر باہر نکالی۔

یہ آج سے چند برس پہلے کے ریحان الدین احمد کی تصویر تھی۔

تصویر کی پشت پر جھکالی میں لکھا تھا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم کے حضور میں۔

اُن کے ادنیٰ غلام بے رام کی طرف سے۔

ملکتہ - ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء

اس تحریر کے نیچے ایک اردو شعر لکھا تھا۔

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک وہ تصویر ہاتھ میں لئے مفلوج
 رہی رہی۔ اتنے میں برابر کے کمرے میں کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔ اور وہ ہوش میں آکر چاروں
 دیکھنے لگی۔ کمرہ وہی تھا۔ ساگوان کی مسہری۔ بنارسی ساریلوں کے ڈپے ان گنت "طاقچوں" اور
 یوں والی وکٹورین سنگھار میز۔ مسند۔ قالین۔ کنہیوں کی الماری۔ کشمیری کڑھکتے کے پردے۔
 چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ درپے کے باہر جھلانی کی بدھم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور نیچے تالاب کے کنارے
 ٹکیوں کے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

دیپالی نے جلدی سے تصویر سوئیچ باکس کی تہہ میں واپس رکھ کر الماری بند کی اور قد آدم کینے
 نے اپنی دہشت زدہ، بھونکی شکل نظر آئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ
 تھیں۔

دھاگوں کی بلیں اور لچھا مٹھی میں بھینچ کر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اور زینہ اتر کر سڑک کے نیچے پہنچی۔
 مٹھوس بھاکرنہ ازل سے اب تک کا فاصلہ طے کر کے لوٹی ہے۔

نور گسن، باگ میں۔ بہار کی آگ میں۔

درد دل زور۔

اب شمعہ خالہ کی لڑکی فریدہ ہارنیم پر زور زور سے گارہی تھی اور یاسمین پھر کی کی طرح

ناچنے میں مشغول تھی اختر آراء اور روزی سیمل کے نیچے سلائی کر رہی تھیں۔ انجم آراء گلاب خاص
 نیچے "راج سنگھاسن" پر سے دلائی سمیٹ کر اٹھ رہی تھی۔ یاسمین ناچتے ناچتے جا کر اس
 بیٹھ گئی۔ دیپالی کو دیکھ کر انجم آراء نے آواز دی۔ "دیدئی۔ ادھر آؤ۔"

دیپالی اختر آراء کو دھاگے دینے کے بعد جا کر شاہی تخت کے کنارے پرٹک گئی۔
 "دیدئی ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔" یاسمین نے کہا۔
 "اچھا۔" اس نے محنتوں کی طرح ہنس کر جواب دیا۔

"آستینوں کی تربانی۔" انجم آراء نے اسے بروکیڈ کا ایک ادھ سلا بلاؤنڈ تھما دیا اور خود
 کر کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

نزدیک ایک سیٹل پاٹی پر فرید پور سے آئی ہوئی ایک رشتہ دار لڑکی نے گلابی کرب ڈ
 کا ایک ٹکڑا اچھا کر بلاؤنڈ تراشنے کے لئے اسے ماینا شروع کیا۔ مالا ملازمہ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی
 باغ چادوں طرف ڈول سا رہا تھا۔ دیپالی نے بروکیڈ کے بلاؤنڈ کی ایک آستین کا کنارہ مو
 لکھوئی۔ جیال آراء باورچی خانہ سے لوٹ کر کرب آئی اور اس کے نزدیک بیٹھ کر کرب سلائی کرنے لگی۔
 بھی نہ پٹا۔ باغ بڑے سے جہان کی طرح ڈول رہا تھا۔

سیمل کے نیچے سے روزی اٹھ کر گلاب خاص کے نیچے "سنگھاسن" پر آن بیٹھی۔ یاسمین
 بندریا کی طرح تخت کی پشت کے برابر اکڑوں بیٹھ کر جینکے میں بنی سوتیوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔
 سیٹل پاٹی پر بیٹھی لڑکی نے دلہن کا بلاؤنڈ تراشنا شروع کیا۔

"اللہ کرے اب جلدی سے جیال آراء بی بی کے جوڑے بھی سلیں۔" قریب بیٹھی ملازمہ
 ایک انگلی سے کپڑے کا کوناد بابتے ہوئے کہا۔ جیال آراء نے سر اٹھا کر غصے اور کرب سے اس
 ڈالی اور اپنی سلائی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جنہیں اس نے چپکے
 اپنی ساری کے سرخ کنارے سے پونچھ لیا۔

دیپالی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اپنی شادی کے ذکر پر نہ جانے کیوں اس کا یہی ری ایکشن ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے
 بھی رونے لگی تھی۔ جانے کیا بات ہے۔ کبھی کبھ بتاتی بھی نہیں۔" روزی نے چپکے سے اس کے

لہا۔ دیوال اپنے ہاتھوں کا برعشرہ چھپانے کے لئے ذرا دوسری طرف کو مڑ گئی۔ مگر اس طرف گلابی بی بی شین کے بکھرے ٹکڑوں میں سے کھلنا میں بنی سیتل پاٹی پر چھپا ہوا گلدار ہرن آتے نکلنے لگا۔

فریدہ بار مومنہ بند کر چکی تھی۔ باغ پر ایک دم بڑا سناٹا سا چھا گیا۔ ساری لڑکیاں سرے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چند منٹ بعد باتوئی اور بے چین یاسمین نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”کیسا unny تلخ تخت اس نے جھٹکے پر طبلہ بجاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”سنگھاسن تبتی۔!“ گھاس پر بیٹھی ملازمہ مالا نے کھیسیں نکال کر کہا۔

”کون چیز۔؟“ یاسمین نے پوچھا۔

”راجہ بکرم جیت کا سنگھاسن۔“ فریدہ نے سراٹھا کر جواب دیا۔

”ادہ۔“ یاسمین نے مورتیوں کی غور سے دیکھتے ہوئے سر ملایا۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی دفعتاً باتیں شروع کر دیں۔

”ایک جوڑا فرشی پانچا مے کا بھی رکھ رہی ہیں۔“ اختر آرار فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

”ادھر ہندوستان میں تو صرف عزارہ ہی پہنا جاتا ہے۔“ آبتارہہ تھے۔ ”انجم آرار نے جو

سے واپس آچکی تھی۔ گھاس پر دوڑا نو بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپا کے پاس تو کئی فرشی پانچا مے ہیں۔“ ہن نا آپا۔؟ مگر آپا پہنتی ہی نہیں۔“ اختر آرار نے کہا۔

”اب بڑھاپے میں کیا خاک پہنوں گی۔“ جہاں آرار نے تلخی سے کہا۔

”اے لو۔ اور سنو۔“ فریدہ نے ذرا کھوکھلی آواز میں بڑا مانا۔

”یاد ہے ایک دفعہ آپا نے عید پر عزارہ پہنا تھا۔؟ جب ہم لوگ سب خالوجان کے ہاں

گئے تھے۔“ اختر آرار نے انجم آرار سے کہا۔

اُس عید پر اس نے گلکٹہ سے حسبِ معمول شرارتاً ایک سیدھا ہیات سا عید کا رڈ بھیجا

پر ہلال، کھجور کے درخت ادا اونٹ کے منظر کے نیچے دو ہاتھ (ایک نسوانی ایک مردانہ)

ہے تھے اور برابر میں دو موٹے مسخرے نفیریاں بجا رہے تھے۔ کارڈ کی پشت پر اس نے اردو

میں ایک سخت بازاری شعر لکھا تھا۔ "عید کا دن ہے، پتہ نہیں کیا۔" مجھے مصروف یا دہنیں
 گھٹے مل لو صاحب۔ رسم دنیا بھی ہے۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔" اس کی اردو
 رائٹنگ کتنی کچی اور بچکانہ تھی۔ جہاں آراہ ایک گھٹنے پر سر رکھ کر سلائی میں مصروف رہی۔
 "چلو لڑکیو۔ دسترخوان لگ گیا۔" برآمدے میں سے ایک بوڑھی ملازمہ نے پکا
 "آتے ہیں۔" آخر آراہ نے جواب دیا۔

روزی "سنگھاسن" سے اتر کر چیزیں سمیٹنے کے لئے سیمبل کے نیچے چلی گئی۔
 یاسمین ابھی تک سنگھاسن بتیسی کے تصور میں محو تھی۔ اس نے اچانک سر اٹھا کر جہاں
 اور دیپالی کو مخاطب کیا۔

"آہ۔ آیا۔ دیدی تم دونوں اور میں اس تخت پر بیٹھے ہیں نا۔ تو یہ pretend
 کر دو کہ ہم تینوں پالیوں والی مدیتیاں ہیں جو راجہ بھوج اس لائق نہ ہوگا ہم اسے اس تخت پر ف
 بھی نہ رکھنے دیں گے۔"

"کیا دیوانی لڑکی ہے! جہاں آراہ نے ہنس کر کہا۔
 دیپالی بلاؤ زختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب جہاں آراہ نے پہلی بار اس کی وحشت زد
 شکل دیکھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "ارے دیپالی تمہیں کیا ہو گیا۔؟"
 کچھ نہیں بھائی۔ میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔" اس نے شدید آلتا ہٹ او
 ٹکان کے ساتھ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"ارے تو اوپر جا کر ڈرائیٹ رہو۔ کھانا پھر کھا لینا۔"
 "نہیں۔ میں اب گھر جاؤں گی۔"

"ابھی سے؟ تمہیں ہو کیا رہا ہے بیٹھے بھلے؟"
 "جہاں آراہ" دیپالی کی آواز میں التجا تھی۔ "مجھے اب گھر جانے دو۔ اتوار کو بوبہورہ
 جانا ہے۔ اس کے لئے پیکنگ بھی۔" وہ بات پوری کئے بغیر تھک کر چپ ہو گئی۔

"ایک تو اتنے دنوں بعد آئیں۔ ساری چھٹیاں جانے کہاں کہاں سیر سپائے کرتی پھر
 اب بھائی جا رہی ہو۔ یہ کیا دھاندلی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر آج گپ بھی نہیں ہو سکی۔" جہاں آ

دیپالی پر دوبارہ نظر ڈالی۔ "تم واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چلو جلدی سے چل کر کھانا
لو۔ پھر چلی جانا۔ مالا۔" اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ "ڈرائیور سے کہو۔ موٹر ادھر لاکر لگاؤ۔
لی بی بی کی جلدی گھر جانا ہے۔ آؤ۔" اس نے دیپالی سے کہا۔

باقی لڑکیاں کام سمیٹ کر کوٹھی کے پچھلے دالان تک پہنچ چکی تھیں۔ بوند باندی شروع ہو گئی
کے پہلے قطرے تالاب کی سطح پر نہتے سے بھنور رہا ہے تھے۔

ردزی بھی گھاگی ہوئی دیپالی کے پاس آئی۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا جہاں آ رہی؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" دیپالی نے ذرا رشتہ سے کہا۔ یہ میں کیا اپنا تماشہ بنا رہی ہوں اس نے

یہ کہا اور "راج سنگھاسن" سے اٹری۔ چلو دیپالی اٹھو۔ اُس نے حسبِ عادت خود کو

مب کیا۔ اور پھر لپو لپو پہنچا ہے۔ چلو دیپالی سرکار دوسرا قدم آگے بڑھاؤ۔

وہ جہاں آ رہی اور ردزی کے ساتھ کوٹھی کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۷ گوڑ ملہار

جل بھل۔ نہر۔ تال۔ بن۔ آپ بن۔ ندی۔ نالے۔ گری۔ گولہ۔ سب ہی کچھ۔ سارا بنگال دس
رت میں، ایک سیکڑا دریا بن چکا ہے۔ شہر کی گلیوں میں نوکائیں چل رہی ہیں۔ کالے ہاروں کے
فانی ندیاں بہتی ہیں۔ کائنات پھیل کر وسیع تر ہو گئی۔ فصلیں بونے اور مالیدگی اور تجدید اور شادابی
م۔ پٹ سن کٹنے والا ہے۔ تنکے کی نوکیلی چھبے دار ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں دھان بو
ہیں۔ محلوں دو محلوں، مکانوں اور جھوپڑوں میں ڈھولک بج رہی ہے۔ آبی راستوں کے چوڑے
جال پر باتیں رواں ہیں۔ بانسریاں بجتی ہیں۔ امرا کی دہنوں کی پالکیاں کشتیوں اور اسیمنوں
عائی جابری ہیں۔ غریب بارتی شکستہ چھڑواں لگائے گاتے بجاتے شہنائوں میں لدے ایک گاؤں سے
بے گاؤں جا رہے۔ برکھائت، شادلیوں کی رُت ہے۔ ہر برسات کی مانند اس برس بھی کتے بندھن
۔ ان سب دہنوں کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔؟

گھر کی لکشی، ہزار برس کی بنو بہوؤں نے سندھیا کال اپنے اپنے آنکھوں میں لکشی کی اقدار کے گلوں کے سامنے چراغ جلا دیئے۔

پچھلی صدیوں کی وہ سدا سبھا گئیں جو زبردستی سی ہونے چلیں اور اپنے گھروں کے درو پریت کے مطابق لاکھ کے رنگ میں ڈبو کر اپنے دوا بنے ہاتھ کا نشان لگاتی گئیں۔ اندھیرے جنگل میں، درو افتادہ گاؤں میں پرانے بوسیدہ مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹوں پر ان کے چھو سے نیچے کے سرخ نشان ٹھٹھا رہے ہیں ستارے کی بنوں میں ان کے چارے سی سادڑیوں کی سما کے گول، نیچے لڑھکھڑ گنبد، بارش میں بھگیئے ہیں۔

شعرا کی موضوع سخن، افسانہ نگاروں کی ہیروئن۔ جذباتی چیز کاروں کی تصویر۔ بنگال کی عورت۔ سدا دکھ سہنے والی۔ صابر و شاکر۔ بے چاری۔

سیندور اور ہندی کی سُرخ۔ لاکھ کے رنگ کی سُرخ۔

بونددوں کی لڑیاں۔ زندگی۔ موت۔ زندگی کی پھول والا گوندھتی جا رہی ہیں۔

جب بارش ہفتی ہے تو بادلوں کے ادے شامیلانے کے نیچے مورنا چنا شروع کر دیتے ہیں کنبوں میں جو تھیکا کھلی ہے۔ بنوں میں سال کے پھول مہک اٹھے۔ بھگی، گھپ، اندھیری رات یا جنگو چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی میں کنبوں نے کہا۔ ابھی ساریکا۔ اپنے محبوب سے ملنے جاتی۔ ندی کنارے بید کے پھول کھلے ہیں۔ ہرے اور سیاہ پروں والی مرغابیاں چلا رہی ہیں۔ ہر درختوں کے نیچے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ چھتر ٹپکنے لگے۔

بلودے بڑھ رہے ہیں۔ کھیت لہلہا اٹھے۔ بانس کے سرسراتے جھنڈ میں ہاتھی بارش سے بچنے کے! کھڑے کان پھٹھار رہے ہیں۔ بلکے بھلیوں کے تعاقب میں ہیں جن سے تال اور دنیاں لبریز ہو گئیں۔ پرہاتی میں کیستی مہک رہی ہے۔ بانس کے جھرمٹ میں سانپ سوتا ہے۔

ندی پر سے بارات آ رہی ہے۔ بارات آنکھ کے دوار پر اتر گئی۔ تلسی کے سامنے چہرا۔ جل رہا ہے۔

یکس کا گھر ہے اور دو لہا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کس کی دہن ہے جو اٹاری پر ہوا بال بکھرائے پریشان سوتی ہے؟

۱۸ میگھ رنجی راگنی

آدھی رات کے بعد بارش تھمی۔ سیمل کے خنک پتوں میں سے ٹپ ٹپ کرتی بوندیں باغ کی
رہی مٹی پر گرتی رہیں۔ مینڈکوں کا شور ایک دم تیز ہو گیا۔ محل میں روشنیاں جل اٹھیں گہما
سی مذاق۔ شور۔ قندوں کی چاپ۔

دوسری منزل کی طویل گیلری میں سے گزرتی انجم آرا لہک لہک کر ٹنگور کا گیت الاپ رہی ہے۔
استھولے جوئے نبھرا استھولے بنے آب نے ندی نادے۔ گری گویا رابا رے
آشاڑھے نوبو آندوا نشبونو بو۔

اتی گبھیرانی گبھیر نیل ادھر سے ڈمرویلجے
وہ بے چینی سے سہری پر کروٹ بدلتی ہے۔ شکر کی ناچے۔ شکر کی ناچے۔ میں ملا رگیت گا ہی
ہمارا تے۔ آواز دُور چلی جاتی ہے۔

لیکن سینے میں گیت جاری ہے۔
کورے گرجن زیر جھنی سگھنے۔ اٹھے روبر بمیرب تانے بتانے
سینے میں وہ گارہ ہے

جبکہ وہ بال بھرائے بری نقش و نگار کے چھپر کھٹ پر بے چینی سے سوتی ہے۔ وہ سیمل کے نیچے
کے شکستہ سنگھاسن کے کنارے کھڑا گائے جارہا ہے۔ وکر ماتہ کے زرد عقیق کے تخت میں سے
بہر شاہیں چھوٹ رہی ہیں۔ انصاف کا تخت ایک دم جگمگانے لگا۔ وہ گارہ ہے۔

دیکھ دیکھ کنو بانی نوبو نوبو کتو بھاشا۔ جھور دھور دھور ورو شو دھارا۔
جھور و۔ جھور و۔ اتنی کتی ہیں۔ مالا لاتی ہے۔ سیل کے سفید اور زرد پھولوں میں بیجزے
کی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جادو ٹرنے۔ مجھڑے۔

”بی بی۔ بی بی۔ اٹھیے۔ وہ آگئے۔“

وہ ایک دم چونک کر ہڑڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

الامسہری پر ہنسی اسے جگا رہی ہے۔ چھت کا برقی پکھتاہیزی سے گھوم رہا ہے۔ کھلے ہو
دریچوں اور دروازوں میں گمازہ، سہانی، ہوا اندر آرہی ہے۔

چنبیلی کے پھولوں کی اور برسات کی رات کی ہنس۔

”کون آگئے۔؟ کون۔؟“ اُس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے۔ رنگ سفید پڑ گیا

پاؤں میں سنسنی۔

”بی بی۔“ ماما سر نے ریشمی جھالروا لمپ کا سوکچہ دبا کر اطمینان سے کھیسیں نکالتے ہو

جواب دیتی ہے۔ ”اجی وہی سب۔ سب بگچے والے۔ دوٹی ٹھو موٹر بھر کر۔ دینا چلو چلے خاطر

سب جنے تیار ہیں۔ چہاچ ٹھیک سات بجے چھوٹے گا۔ آپ ابھی تک سو رہی ہیں۔ یہ اندھی

”اوہ۔۔۔“ وہاں سمیٹ کر آنکھیں موند لیتی ہے۔ میرے خوابوں سے تمہارے خوابوں

اب قیامت تک کا فاصلہ ہے۔ اچھا بھائی۔ جو تمہاری مرضی۔

”جلدی کرئیے بی بی۔“

”اچھا۔ اچھا۔“

ماما بڑی مصروفیت سے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے۔

وہ مسہری سے انزکرنے کے پاؤں بڑے دریچے میں جاتی ہے۔ نیچے باغ پر گہرے بادل

کھڑے ہیں۔ یہ برسات بھی گورنے والی ہے۔ گزر جائے گی۔

بجلی چمکی ہے۔

ان مادی سودا منی رنگ بھرے زرتیر کو رے۔۔۔ او مہرتے۔۔۔ انجم آرا کی رے

آوازاں بجلی منزل سے آرہی ہے۔ فریدہ اور دوسری لڑکیوں کے قہقہے۔

وہ آگئے۔۔۔ وہ چند لمحوں قبل کی اپنی حماقت پر تلخی سے مسکراتی ہے۔ اتنے برس۔ اتنے

لئے خرابیاں، اتنے بھادرو، اتنے موسم نکل گئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ اب کیا آئیں گے۔

دریچے سے ہٹ کر وہ غسلی نے میں جاتی ہے۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مار کر واپس

ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ الماری کے تمام آئینے میں اپنے بھیگے ہوئے چہرے کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ میں ہوں۔

وہ الماری کا پٹ کھولتی ہے۔ مرشد آبادی رشیم کی ایک بیش قیمت گلابی ساڑھی نکال کر باندھتی ہے۔ پھر وہ سوئینگ باکس کھولتی ہے۔ (یہ سوئینگ باکس اسے دن میں کتنی بار کھولنا بند کرتا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو فلاد کی طرح مضبوط بنالیا ہے) اس میں سے وہ برما کے گلابی موتیوں کا ہارا اٹھالتی ہے۔ جو شامہاس نے اتمی کے سیف میں سے نکلوا یا تھا۔ تصویر کو اس نے مختلف چیزوں کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھا ہے۔ برسوں سے وہ تصویر اسی طرح بید کی اس صندلی کی تہ میں رکھی ہے۔ اتنی مدتوں بعد بھی اسے یقین ہے کہ اگر اس پر اس کی نظر پڑ گئی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہ بال گوندھ کر اپنے ہن کر کرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اور نیچے قہویوں اور شادمانیوں کی دنیا میں شامل ہونے کے لئے اپنے ہندی لگے ہاتھ کو جنگلے پر لٹکانی ہوئی میٹر جیاں اتارنے لگتی ہے۔

آٹاڑھے نوبو آندو آتنبو نوبو۔

میری ہر لحظہ، ہر آن جلتی ہوئی جتا اس نے دیکھی ہے؛

نواب قمر الزماں جو دھری کی بڑی صاحبزادی جہاں آواز بجیم۔

نیچے برساتی میں سترہ سالہ یاسمین مجید خوش اور بشاش، جارحیت کی ہری، اور بال چنری، ساری پینے، دو چوٹیاں گوندھے، زبور پینے، موٹر سے اتری ہے اور بآمدے میں کھڑی فریدہ اور خیرآوار کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر نیر الزماں کو تنگ کر رہی ہے۔ خوش اور بشاش۔

اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؛

اصوہ اجنبی، بھولی لڑکی، جوان پُرشور، دیباؤں، طوفانی راستوں کے اس پار، دینلچ پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اجنبیوں کے اس قافلے ایک اجنبی انسان کی آمد کی منتظر ہے۔ اس کی

میں کیا لکھا ہے۔

دھان کے پودوں کی آواز سنو۔ جو ہر سناٹے میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

۱۹

بھیرنی کا خواب

کس کی دہن ہے یہ، بیکراں، بھیانک رات نے پوچھا۔ جو بھیرنی کی طرح بال بکھرائے، پریشان سوتی ہے؛

بوندوں کی لڑیاں سرسری سدن کے باغ پر ٹپ ٹپ گرتی سرخ مٹی میں جذب ہو گئیں۔ عمارت کے ایک کمرے میں، کھڑکی کے نیچے، پلنگ پر مدہ بے حسنی سے کروٹ بدلتی ہے۔ سارا باغ جگنوؤں سے جگمگا رہا ہے۔ وہ بھونچ پتروں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ میں جگنوؤں کی روشنی میں زعفران سے تمبیں ڈھانکھوں گی، اور پون دوت کے ذریعے بھجواؤں گی۔ جس طرح ہم اپنے الفاظ ہوا کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر بولیں تو کی ہو۔؟ جگنو اور بھونچ پتر اچانک غائب ہو گئے۔ گور کھالی کا میڑھی میڑھی شانوں والا خونک درخت اس کے سر پر چھوے جا رہا ہے۔ بھوانی کا لوڑھا مندر جڑ سے اکھڑ گیا۔ اس سال بڑا بھاری سا ٹیکلون آیا تھا بھائی۔ کتب خانے میں دروازے نہیں ہیں۔ صرف دیواریں۔ صرف دیواریں۔ کوئی راستہ نکلنے کا نہیں۔ کھڑکھڑکھڑ۔ بھونچ پتروں کے نیچے سے وہ نمودار ہوتا ہے۔ بڑی چالاک سے، چوہے کی طرح چٹا وہ سامنے آگیا۔ بھگنو۔ سر منڈا۔ عینک لگائے۔ کھڑاؤں پہنے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھیسین نکال کر وہ ایک بھونچ پتر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

(یہ بھگنو چائنا بھون میں پڑھا تھا ہے) وہ غور سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی عجیب زبان ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ فائنل امتحان اسی زبان میں ہو گا۔ بجلی کڑکی۔

بھگنو بھی غائب۔ وہ چائنا بھون کے برآمدے میں کان لگا کر سن رہی ہے۔ "میری آواز تمہاری کڑک۔ میرے آنسو تمہاری مسلسل جھڑی۔ میرے من کی آگ تمہاری بجلی۔ میرے دل میں ماس کا چہرہ ہے اور تمہاری آغوش میں چاند۔ میں اور تم یکساں ہیں۔ بھائی بادل۔ پھر مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔"

بڑا دم، سہانا اجالا سارے میں پھیل گیا۔ بھول بن میں چمپک کے شگوفوں کا چرانا سا
 نور ہا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چلتا وہ خراں خراں اس کی سمت آ رہا ہے۔

وہ چکوروں کا محبوب لمبے بالوں، کالی آنکھوں والا، ہاتھ میں کنول سنبھالے، انگلیوں سے
 امرت گراتا۔ اولوکتیشور۔ پدم پانی۔

وہ کلا بھون کے باغ میں موجود ہے۔ مسرور۔ محفوظ۔ مندلاں بوس۔ برآمدے میں تسکی ٹوپی
 اوڑھے نقرائی پیچوان گڑ گڑا رہے ہیں۔ ہر طرف تصویریں ہی تصویریں۔ جو ان گھاس پر چلتا اشوک
 کے بھووں کا تاج پہنے وہ اس کی جانب آ رہا ہے۔ لوک تاتھ۔ لوکیشور۔

وہ خوشی سے کھل کھلا کر ہنستی ہے۔ وہ پین کی طرح منہ اٹھا کر بالاسری بجاتا ہے۔ وہ چاندی
 سے بنا۔ سیاہ بادلوں سے نکلتا سورج۔ ایتا بھ۔ منجھتری۔

بیکراں نور۔ بیکراں رحم۔ بیکراں محبت۔

بالکل قریب اگر اس نے سینک اتاری اور گھور کر اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
 تھیں۔ آنکھ۔ ناک۔ منہ۔ کچھ بھی نہیں۔ خالی چہرہ۔ بالکل خالی چہرہ۔ انڈے جیسا۔ اس چہرے
 و جیسا چاہو بنا لو۔ بھکشو نے غرا کر کہا۔ وہ دہل کر چنی۔

یہ لو۔ بھکشو نے کہا۔ اور خالی ہاتھ اس کی طرف بڑا دیا۔

یہ کیا ہے ؟

دودھ کا گلاس۔ جاؤ جا کر پرستش کرو کیسی کیونٹ ہمدرد ہو۔ پوچھا پاٹ نہیں کرتیں
 ہیں مٹی کیونٹ تو نہیں ہو گئیں ؟

کس کی پرستش ؟

اپنی۔ ہم سب اپنی اپنی پرستش کرتے ہیں۔

مگر آج تو ناگ پنچمی ہے۔

ہاں۔

کون سی ؟ کس صدی کی ناگ پنچمی۔

ازل سے ابد تک۔ محض ایک لمحہ۔ وہ اٹھ اٹھا کر مسخروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ خالی ہاتھ اس طرح اٹھائے گویا انجلی تھامے ہو۔ وزنی قدموں سے پھر گور کھاملی کی سمت چلی۔ جنگل کا جنگل جھنگا سا ہے۔
 او جگمگانے والو۔ جاگو۔ تھر ڈایر کی لڑکیوں نے قطار میں کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ حسب معمول ڈارکٹ کر رہی ہے۔

او جگمگانے والو۔ چوتھے پرکھڑی دہلی پتلی اور نو عمر حسین سروجنی دیوی کی آواز جاگو۔ کہ ہم گچھاؤں اور ٹیلوں اور مقدس برگدی جڑوں میں چھپے تھماے مندر دھونڈ آئے ہیں۔ ابدی خرد کے مراقبے سے اپنے پھن اٹھاؤ۔ جاگو۔ بانسری کی دھن پر وجد کرو۔ ہم تمہارے لئے دودھ اور باجرہ اور جنگلی انجیر اور سنہرے شہد کی انجلی لاتے ہیں۔ ہم نے عود و لؤلؤں سے فضا کو تبرک کیا ہے۔ ہماری لاچار زندگیوں اور با صبر مشقت اور ہماری نیندوں اور ہماری مضطر تمناؤں کی حفاظت کرو۔ ندی کی طرح تیز اور شبنم کی طرح خاموش، بجلی کی طرح سبک اور آفتاب کی طرف درخشاں۔ عارف۔ تم کہ اس قدیم خاموشی کی علامت ہو جس میں موت و حیات، رنج و غم ایک ہو۔ ایٹھ دھڑام سے گر پڑی۔ گور کھاملی کی شاخیں زرد زرد سے سرسرا رہی ہیں۔ سینکڑوں برس پرانا، بوڑھا جوگی درخت اُس کے سر پر کھڑکھڑا رہا ہے۔ پرتیوں کا بسیرا۔
 ”پچھلے آٹھ سو برس کی ہماری تہذیبی تخلیق۔۔۔ اُداس روجوں کا مسکن۔ بوڑھے مندر کے کنارے۔ مندر کا اندھا پردہ ہوت دیوی ہے، اس نے میرا سیاہ کرایا تھا) منڈیر پر کھڑا ہار رہا ہے۔ شری رام اور سیتا جہارانی۔ بندھیا چل کے بنوں میں کھو گئے۔ ہری ہری ہری ہری ہری۔ دہائی ہے۔ دہائی۔ گور کھاملی نے زرد کا ہنکا را بھرا۔ اس کی ڈراؤنی چھاؤں میں کپالی بیٹھے ہیں۔ کپالیوں کی آل لٹیا کا نفرنس۔ ڈانس پر تترک علیات کا عود و سلگ رہا ہے۔ آن گت کپالی۔ ایک کپالی کھڑکی میں سے اندر کود آیا۔ لودم لگاؤ۔ نو۔ بھینک یو۔ میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں چکھا۔ سگریٹ پیا جاتا ہے۔ چکھا نہیں جاتا۔ بے وقوف۔ لویا ایک سوٹا۔ لگے دم۔ مٹے غم۔ معاف کیجئے گا آپ مداری ہیں یا ویشنوب، الکھ زرخن۔ آمار پرانیر آرام مونیر آئند۔ آتار ہتیا۔ اکیس کیوزمی۔ آپ کی داڑھی تو بالکل پٹ سن کی معلوم ہوتی ہے۔ ہا ہا ہا۔ نقلی۔ سادھو۔ نقلی راجہ۔ نقلی سنگھاسن۔ آ آ۔ سب جگ نقلی۔ سب جگ دھوکا ساری دنیا گور کھ دھندرا۔ الجھن میں لے نام سجدہ سے۔ کھل جائے گا پھندا۔ ہارونیم

خوب زور سے نک رہا ہے۔ مائی نیم برس بہری متی۔ سارے کپالی کھوپڑیوں کی مالائیں پہنے، ترنگے، ہرے اور لال پھریرے اڑاتے، گھنٹیاں بجاتے، اند گراؤنڈ مٹھ میں اتر گئے۔ تم نے آند مٹھ پڑھا ہے؟ ترکی ٹوپی والا جوکر۔

چلتی چلتی وہ دریا پر آگئی۔ سامنے سُرخ لہروں پر بہری ناؤ بنا بتوار پہے جاتی ہے۔ ناؤ پر مگریزی میں لکھا ہے۔ "ایس۔ ایس۔ علاول"۔ بھئی واہ۔ ناؤ پہے جا رہی ہے۔ بے آواز منظر میں سے ساؤنڈ غائب۔ بھیانک۔ وہ خود کشتی میں بیٹھی ہے۔ اچانک دھماکہ۔ اب دنگ میں سے لائن شاہ قاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ لائن شاہ جادوگر۔ سینکڑوں برس ہوئے مر گیا۔ پھر بھی گار رہا ہے۔ دھندلی نکل۔ ہیولا۔ کتنا ہی غوسہ دیکھو۔ صاف نظر نہیں آئے گا۔ میں عشق ہوں۔ ناقابل فہم۔ غیر مرئی۔ گرفت سے باہر۔ لائن شاہ ڈائیلگ لول رہا ہے۔ اس کے دھواں ایسے ماتھے میں کدَم کا پتہ ہے۔ ل کی شکل والا کدَم کا پتہ۔ کیا گاتا ہے۔ لائن شاہ کہ میرے پاس شیشے کا ایک گھر ہے۔ اس میں میرا بڑی رہتا ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان گہرا دریا حائل ہے۔ میں دریا کو کیسے پا کر دوں۔ کاش وہ خود ہی میرے پاس آجائے۔

اوجھاتی رہے۔

اب وہ دوسری طرف کروٹ بدلتی ہے۔ سامنے گھڑیاں ہی گھڑیاں۔ گھڑیاؤں کی فوج یہ گھڑیاں اپشت پر ایک ایک سیلولائیٹڈ کا کام دیو سوار ہے۔ جا پانی کام دیو۔ بوگس۔ تاریک طویل رنگ برنگی ٹرننگ۔ اندھکار۔ سمندر۔ میں اس دریا میں ڈوب جاؤں تو مجھے جسے ملا صی دینا۔ سبے بن مالی۔

بتوار بغیر ناؤ کے بہہ گئی۔ ناؤ بغیر ندی کے رواں ہے۔ چراغ بتاؤ کے روشن ہے۔ لوہنا راز کے جل رہی ہے۔

جنگل کا جنگل چل رہا ہے۔ ندی کے ماشد بہتا ہے۔ اور ندی ساکت ہے اور انسان درختوں، طرح طرح کے کھڑے ہیں

میں کہیں بہہ چکا تھا۔

ساری غمراہات نہیں کروں گی۔ پہچان کے نہیں دوں گی۔ دھوکے باز۔
دھوکے باز۔ باغ بہت سنسان ہے۔ رات چیتے کی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔ غم
غمراہات نہیں کروں گی۔ ارے آپ کی اسلیٹ تو مجھے اب معلوم ہوئی بچہ جی۔ گردک۔

برآمدے میں مدھم بلب روشن تھا۔ مرے ہوئے برساتی پتنگوں کا مختصر سا ڈھیر بلب کے عین نیچے
فرش پر پڑا تھا۔ برآمدے کے باہر کرشن چوڑا کی ڈالیاں ٹھنڈی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ مینڈک خاموش
ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی جھینگر چلا اٹھتا۔

اسے ایک دم سردی سی لگی۔ وہ کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ نیم تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر سر ہانے کی میز
پر رکھا ہوا اٹمی کیس کھولا۔ اور ٹپٹول ٹپٹول کر ایک مٹی کا ہاتھی نکالا۔

ہاتھی نمکے پر رکھ کر اسے بڑی مہادری اور دھیان سے دیکھنے لگی۔ جھپٹا سا
بے چارہ مسخرا۔ سرخ اور زرد نقش و نگار والا مٹی کا ہاتھی۔

ابوالقاسم کی آمد کے بعد وہ مولوی ابوالہاشم کے کہے پر کیا محبت پٹ کشتی سے اُتر آئی تھی۔ اب وہ
ایک ایک بات بڑی تفصیل سے یاد ہے۔ ایک ایک بات۔ اس رات وہ اور ریحان ٹہلے ہوئے ایک
بستی کی طرف گئے تھے تو وہاں۔ وہاں کھاری دوکان پر مٹی کے کھلونوں کی قطار میں سجایہ ہاتھی کتن
لیوٹ لگا تھا۔ وہ کٹھک کرات دیکھنے لگی۔ تو ریحان نے خرید کر اسے دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
جب تم بہت دکھی ہو اسے اردین کے چراغ کی طرح گھسنے میں فوراً آجاذں گا۔ سنبھال کر رکھنا اسے تیرے
لی طرح۔

اور ریحان نے کہا تھا۔ عاشق۔ بچے۔ وحشی۔ یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں اور تصنع اور
ہذب و بیکاری کے پردوں میں اپنے اصل جذبات نہیں چھپا سکتے۔ اور ان سب کو ٹوٹ، منتروں اور
غویزوں کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سر ہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ وحشی تعویذ
پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں
ادگار ہیں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹ اور تعویذ ہیں۔

بذا شوکتی! مولوی صاحب کے جھوپڑے کی طرف آتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تم ایک چھوٹی

یہی تھی ہو۔ تمہیں حفاظت کی ضرورت ہے، میں تمہارا تعویذ ہوں، جو تمہیں ہر خطرہ پر دکھ سے بچائے گا۔
میں کہ ایک کپاٹی سیراگی ہوں، قوم کو مایا جال سے نکلانے کے لئے تپ کرنے والا مٹھ دھاری گوسا میں
تم میری شوکتی ہو۔

ہر علامت۔ ہر تصور بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔۔ بھیرا اس لے بڑی گمبیر آوازیں کہا تھا۔
تمہارا یہاں آنا بے حد خطرناک بات تھی۔ مگر میں نے مجرا نہ بے احتیاطی سے کام لے کر تم کو یہاں بلایا۔ کیونکہ مجھے
محسوس ہوا تھا کہ میں نے اگر تم کو جلد از جلد نہ دیکھا تو واقعی میں مرجاؤں گا۔ تم میرا اس جرم کا باعث ہو۔
لیکن چونکہ تم میرا ظلم ہو۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی
شاید میں بے حد کمزور انسان ہوں۔

بے احتیاطی۔۔۔ اس نے دفعتاً بے انتہا سرا سیم ہو کر پوچھا تھا۔
ہاں۔ کچھ عرصہ سے بڑی ناش غلیظوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب پہلے روز تم آوا
سے دو ڈالینڈ میں ملیں تو ان کو تمہیں ہرگز یہ نہ بتانا چاہئے تھا کہ نور الرحمن میاں دراصل میں ہی تھے۔ اگر تم کو
پکڑ لیا بڑا سچائی جاتی اور۔۔۔

ادہ نو۔۔۔ اس نے دہل کر کہا۔
تم صرف سر سید راو را دلی سے واقف ہو اور وہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ آوارے بھی کچھ نہیں جانتیں۔
دفعتاً وہ اس بے حد خوفناک نظر آیا۔ را کھشش۔ پامال میں رہنے والا ناگ دیوتا۔ راسپوٹین کا
ایسا جادو گر۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے سندھ بن میں مہذب دنیا سے سینکڑوں میل دور اس
پراسرار اجنبی کے ساتھ موجود تھی۔ نوعمری میں انسان ایسا DARE DEVIL کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہو گا؟
پولس اور تھرڈ ڈگری۔

اچانک وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ چنانچہ شوکتی۔۔۔ میں تم کو میرے جواہرات تو تحفے میں اور نشانی کے
طور پر دے نہیں سکتی تم مٹی کے اس حقیر کھلونے کو ہی احتیاط سے رکھنا۔ یہ تم کو ہر آفت سے بچائے گا۔
دیپاتی مانتھی کو نیکی رہی۔ پرانے خط۔ تصویریں۔ نشانیاں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم ہیں۔ اس نے غم
غصے سے ریمیاں کے الفاظ دل میں دہرائے۔ بید کی ایک سندھو فچی میں رکھی ہوئی ایک پرانی تصویر میں تو ٹوٹم ہے
تم اسے بھول گئے۔

جہاں آراہ۔ میری سکھی۔ میری بہن۔ میں نے تجھ سے تیرا آدمی چھینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔
 آپا۔ اب نہیں چھینوں گی۔ واپس کر دوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اس انجانی غلطی کو معاف کر دینا آپا
 ”ارے دیپاتی۔“ ابانی نے غصہ کرنے کی طرف جاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”صبح صبح
 کیوں رہی ہو۔ کیا ہوا؟ گھر پہ تو سب خیریت ہے؟ تم تو بالکل کسی بھرتی کی ایسی ہوتی معلوم ہو رہی ہو۔“
 وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔
 ”سب خیریت ہے ابانی۔“ اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر ناک سنکتے اور بال سمیٹتے ہوئے
 آہستہ سے جواب دیا۔ در ذرا آگے جھک کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بھرتی۔ بال بکھڑے فیہ
 کی جوگن۔ !! ”ہر علامت ہر امیجری بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچتی۔“ کپالی بیراگی کا بچہ۔ ڈیم
 — ڈیم — ڈیم —
 اُس نے ہلنگ سے پاؤں اتار کر چلتیں اپنی طرف سرکائیں۔

زندگی کی ہر نئی صبح آفاقی رات کے اٹھارہ سمنہ کے کنارے ایک نیا اجنبی ساحل ہے۔ جس پر ہم اپنے
 خوشگوار یا اذیت دہ خوابوں کی کشتی سے مسرور یا مغموم، لبثاس یا خوفزدہ، اترتے ہیں۔
 نیند کی نوکارات کے دریا پر ساری زندگی بہتی رہتی ہے۔ ہم اپنی عمر سبز کے کئی برس بغیر تپاؤ کی اس
 نوکامی گزار دیتے ہیں۔ عمر رواں کی ہر نئی صبح جب ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی نوکامی دم غائب ہو جاتی
 ہے اور دوسری رات تک کے لئے ہماری منتظر جاگ بھراپنے ساحل سے لگ جاتی ہے۔ نیند کی پرسکون
 طوفانی پلدا پر خوابیدہ انسانوں کے سینوں کی اُن گنت نوکائیں رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتی
 جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہیں یا کبھی کبھی دو نوکائیں اکٹھی گھاٹ کی سمت بڑھتی ہیں
 مقدس کی زینت بی بی اپنے کالے سوکھے مضبوط ہاتھوں میں سرخ ساری کا بندل سنبھالے دلہن کی منتظر

چلتیں پیروں میں ڈال کر اُس نے اپنی رسمٹ واپچ اٹھانے کے لئے تکیہ سرکایا اور تب اس کی نظر
 مٹی کے ہاتھی پر پڑی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ہاتھی کو اٹھا کر کھڑکی میں گئی۔ چند محظوظ تک ٹھٹھکی رہی
 ایک دم بڑے زور سے اُسے باہر بھینک دیا۔ پل کے پل میں وہ بے جا رکھڑکی کے نیچے اُگی ہوتی برساتا لگا۔

لے ہاں بے تحاشہ کھانے والے برہمنوں کو اب گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

پھر اشیہن کی تیز دھوپ پانیوں پر پھیل۔ سینہ دراپسے سرخ سورج کی گرمی نے نازک بدن

بلگوں کو دکھی کیا۔ نرسلوں میں چکنے والے پرند اور پن گڑیاں داد اس ہوئیں۔ ایک پک گئی۔ اب ہینیاک دریا اپنی پراپی رفتار پر واپس آرہے ہیں۔ سیلاب اتر گیا۔ درخت سطح آب سے نمودار ہوئے۔ ٹیلوں پر بنے جھوڑے ننھے ننھے زمردیں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں۔ ریت کی لہروں پر راج نہیں کے پخول کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بیجی دھرتی پر پئی فصلیں بونی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں کی مرمت کی جا رہی ہے۔

درگا پوجا کے لئے منڈپ اور بازار سج گئے۔ سارا دیس سنگیت سے گونج رہا ہے کہ درگا میکے آنے والی ہے۔ بیابا بیٹی کے سواگت کے لئے گھر گھر تیار کی گئی ہے۔ ہر منڈو گڑہستن درگا کی ماں اور ہر گڑہستن گڑی راج ہے۔ گیتوں میں درگا کی ماں نے کہا۔ آما کو میکے کب بلاؤ گے گڑی راج؟ جاڑے نکلے، برسات مٹی۔ خزاں آگئی۔ مگر گوری اب تک نہیں آئی۔ اُسے تم نے کیسے خبطی سنا سکی کہ تپے باندھ دیا۔ اس کا نورنگ بھی کالا پڑ گیا ہوگا۔ جب کہتی ہوں گوری کو کیلاش سے لے آؤ تم ٹال جاتے ہو گڑی راج۔ میں اُسے لینے کیسے جاؤں۔ میں تو لوک لاج سے مری جا رہی ہوں۔ ایسا بے تکا بھکاری دالو۔

شنکر نے جڑی مشکل سے چار دن کے لئے گوری کو میکے بھیجا ہے۔ ہر سو تہوار کی دھواں مچی ہے۔ دجے گاتے ہوئے دیوی کو گھروں سے وداع کیا گیا۔ دیوی جیسے ہوئے بگردوں میں دریاؤں پر پڑ پانی میں ڈب دی گئی۔

کارنگ میں رات کو آسمان کی شخاف خیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا بھرتا ہے۔ کچی سرک پر گتے کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر ٹوٹے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں پھیول نے اپنے جال دنیاؤں پر پھیلا دیئے۔ ان کی بالسرلوں کے سرخوں نے پردیں جانے والے مسافروں کو مضطرب کیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہ رہا ہے۔ اڑتے پگھلے اور سفید بادل اُسم کے ریتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلو فر۔ ندی کنارے رشتہ بندی کچھ میں جھوٹا ماسوتا ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

ادگھران مہینے میں دھان تیار ہو گیا۔ منڈیوں میں قیامت کی چہلی پہل ہے۔ گانے کے مقابلے کئے جا رہے ہیں۔ گھر گھر نئے چاول کی کھریک رہی ہے۔

چاول۔ چاول۔ چاول۔

”سنہرا منگال“ سال میں تین بار چاند اگتا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔

گلہابی چاروں میں سپاری کے سڈول درخت لگا ہوا سپاریوں سے لد گئے۔ فوش کی چاندنی راتوں میں چھیدوں کے جال روپہلی پھلیوں سے بھرے۔ کئی ہوئی فصلوں کی رکھوالی کے لئے چن بنائے گئے۔ الاؤ کے گرد غازی گان کی مجلس جی جھونپڑوں میں پرال بچھائی جانے لگی۔ رات کو گیدڑ جنگلوں سے باہر نکل آئے۔ سرسوں پھولی۔ دیاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے شروع ہوئے۔ مساری گان کے حوشیلے سر آبی راستوں پر پھیل گئے۔

ماگھ کی طویل راتوں میں بندر رسوی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چوپے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چرائے وہ کی رخصتی میں سوزنیاں کاڑھنے میں مصروف ہیں۔ پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ غریب بڑھیا آگ تابی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے گٹھوں کے پاس اُپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھڑپتے مسافر چوپال کے اڈے کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماؤس کے سردار تاریک اندھیرے میں چڑیلوں اور جادوگر نیوں نے اپنے اپنے چوپے جلا لئے۔

صبح کا دھندلکا سارے گاؤں پر چھا جاتا ہے۔ دُور افق پر سرخ چھون پہنے۔ گھونگٹ کا ڈھے اوشا سسرال جاتی نظر آتی ہے۔ بھیران کی سُرخ کی طرح لال۔ جنیو پہنے۔ تلک لگائے۔ کندھے پر لال انگو چھا ڈالے سوہے۔ ٹھاکر برگد کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ لونجھائی۔ وہ مالی اور سنار اور تیلی کے پھپھوں تک پہنچ گئے۔ مالی کی لڑکیاں باغ میں پیشپ انجلی کے پھول چھتی ہیں۔ تیلی کی لڑکی تالاب پر برتن مانجھتی ہے۔ صبح تڑکے سوہیہ ٹھاکر ل کر نی سیل کی بیٹھ پر برستی ہیں جو سرسبز چوپے پر سرسوں کے پھولوں سے لدا آرام سے لیٹا ہے اور کبر اس ناپکوں پر جم گیا ہے۔ گڈڑیاں اور پیوند بھری رضائیاں اوڑھے یا تری گلیوں میں بیٹھے رادھا کرشن لے نئے گاگا کرستی والوں کو جگارتے ہیں۔ کوہو چلنے لگے۔ گرہ کی بھیلیاں۔ نیوں کی دوکانوں پر نیں۔ گاؤں کے کہی نے کہا۔

ادراب جنگلوں میں پلاش کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ بنوں میں شیر دہارتے ہیں۔ شیشر کے خنک اندکے نیچے پہاڑی راستوں پر اور کڈ کھیلے ہیں۔ سرسوتی پوجا کے لئے مورتیاں گھڑ کر دھوپ لاسکھائی جا چکیں۔ سرسوں پک گئی۔

پھانگن میں بانس کے ہرے بھرے جھنڈوں میں سے گد رتی، شہد کی مکھیوں کو جلو میں لئے ران سنہی۔ دکھن کی سہانی ہوا میں چلیں۔ لڑکیوں نے بالوں میں کلیاں سجائیں۔ رنگین کشتیاں

لے کر مابھی دریا رک پر نکلے۔ پشپہ بنوں میں بھونرے گونجنے لگے۔

پھول بن میں آدھی رات کو آنارے بھونرے۔ میں چاند کی بتی جلاؤں گی ماور شبنم سے
باتیں کریں گی اور سپہنوں کی پگڑنڈی پر چلتی مہاری اور آؤں گی۔ بہت دھیرے سے آنارے بھونرے۔ کہیں تہرا
گیت ختم نہ ہو جائے۔ میری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ پھول اور ڈالیاں نہ جاگ اٹھیں رے بھونرے۔ گاؤں
کے کبی نے کہا۔

ہر جانی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھر رہی ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ پکھر چکے ہیں۔ رنگین ناؤ کا
مانجھی اودی موجوں پر اپنی سبک کشتی کھیتا ہے۔ بن کھاتے دریا کی موڑ پر اسے سرخ رنگ کا جھونپڑا نظر
آیا۔ ندی کے کنارے ہری گھاس پر نیلی ساری سوکھتی ہے۔ شام کی برجھائیوں میں چھپی کالی باڑی کی سمت سے
پائل کی آواز آرہی ہے۔ جھم جھم کرتی وہ گھاٹ پر آ کر اپنا رنگین گھڑ پانی میں ڈبو دیتی ہے۔ اس کی شکل کی
ایک جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ سورج لہروں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور میں اپنی ناؤ کھے رہا ہوں۔ جھیلی
کے مغنی نے کہا۔

چیتروک شہد ایسے مہینے میں پلاش پھولوں سے لد گئے۔ گل مہر کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ جنگلوں
میں زرد اور سرخ پتوں کے فرش بچھ گئے۔ آم کے کنجوں میں کوئل کوئی طوطے کی چونچ ایسے سرخ سورج
اما کا غصہ پل پل بڑھتا جا رہا ہے۔ جھیلیاں پکڑنے کا ہنگامہ شباب پر آیا۔ کشتیوں کی مرمت کی گئی۔ میسلے
لگے۔ خلق خدا جاگتا رہے تا ششوں سے محفوظ ہوئی۔ ندیوں اور جھیلوں پر بنسیاں اور جال سنہالے دیہاتوں
کی بھیڑ جمع ہے۔ جگمگاتی جھیلیوں کے انبار ہر سولگ گئے۔

بوئی شاک میں شیفالی مہکی اور مادھی اور لکھل۔ اشوک اور مہوے اور ایتاس اور شتم اور
لاکھ کی شاخوں پر پھول کھلے۔ پاٹ کی نئی فصل بوئی جا رہی ہے۔ خوشگوار ہوائیں آمدنیوں میں تبدیل
ہو نہ لگیں۔

جوتی شٹو کی دھوپ میں تال اور لو پکھر سو کھنے لگے۔ زرسلوں کے پرند اور بٹلے اور دریائی باز
پر پھیلا کر اڑتے باز ہے ہیں۔ خوفناک خوفان۔ نیرودہند جھکڑ۔ چھڑاؤ گئے۔ جھونپڑیاں گر گئیں۔ بار باران بکھر
گئے۔ ہواؤں کی غارت گری جھکڑ نے دھرتی پر پھلوں کی بارش کر دی۔ بازار اور باٹ آم سے پٹ گئے۔
اب جابل کھل چکے ہیں۔ اور چپا اور رو جی گندھو نے راتیں معطر کر دی ہیں۔ تباہ حال کسان بھر جھونپڑوں

ادرجالوں کی مرمت میں جُٹ چکے ہیں۔ برسات کے انتظار میں نئے جال بنے جا رہے ہیں۔ شدید دھوپ وحشت، خشک مٹی۔ اللہ نیگہ دے نیگہ دے رے۔ اللہ نیگہ دے۔ اللہ رے اللہ۔

تب بنگال کی کھاڑی سے آٹاڑھ کے درشا کا لہر بادلوں کے لشکر آگے جومعا شروع ہوئے۔ نیکی کے زرگل کا بھوت مل کر، کھوپڑیوں کے بجائے لنگوں کی قطاریں، لاپٹے سیاہ بادلوں کا جوڑا باندھ کر، دھنک کی چھڑی اور بجلی کی جھنڈیوں والا عصا۔ سنبھالے برہمنوں کو ڈرانے کے لئے موسم نے پھر جادوگر کا روپ دھارا۔ آسمان بارش کا تاریک درخت بن گیا۔ جس کی واڑھی زمین تلک آرہی ہے۔ سہ ماہیوں کے بھوکے موربوں میں چلانے لگے۔ گلابی کیلوں سے لدا درخت اپنے پتوں کا چلو بنا کر بارش پر پانی پی رہا ہے۔ بید کے پھولوں سے بھکتی ندی جامن کے درختوں کے نیچے دواں ہے۔ مچھلی کے قواقب میں بڑگا لڑاں پتوں کو پرامید لگا سوں سے دیکھتا ہے۔ مغلس کسان کی سیوی سر پر چٹائی اوڑھے، ہر طرف ٹپکتے جھونپٹے کا بچاؤ کرنی پھر رہی ہے۔ جنگلوں کے آدمی داسی کانن درگا کی پوجا کے لئے درختوں کی جڑوں میں خون چھڑک کر بلوا کے پیالوں میں گاڑی پی رہے ہیں۔ گاؤں نے کبی نے کہا۔

دریا چڑھے۔ میگھنا اور بہمن پتر۔ پدما اور مدھو متی۔ بھیرب اور بھاگیرتی۔ شب بھیشری اور کرناٹلی۔ سُرما اور دعا لیشوڑی۔ سرابن کے پانچویں دن ناگ سنجی منائی گئی۔ جنگلوں میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ ندیوں کے ساحل کچھرا درکائی اور کینچھوؤں اور دلدل کی راجدھانی بن گئے۔ سیپا یوں سے نکل آئے۔ اوجھوں کا کاروبار چمکا۔ چھڑیاں لگائے لوگ جلدی جلدی گھاٹ پر اترتے ہیں۔ بانس کے پلوں پر سے گزر رہے ہیں۔ تیرلیوں کی ایسی نازک کشتیوں کو طوفانی دریا نکل گئے۔ دریا گاؤں اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ درخت جڑ سے اکھڑے۔ مویشی اور انسان عزاب ہوئے۔

”میری قسمت ہی خراب ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہ گیا۔ اللہ تو نے دنیا بنائی اور پھر مجھ سے میرا پاٹ، میرا دھان سب کچھ چھین لیا۔ میری قسمت میں کتنے دکھ ہیں رے اللہ۔ میں پاٹ بیچ کر تیرے لئے سونے کی تھلاؤں گا۔ میں نے اُس سے کہا تھا۔ پاٹ تو سیلاب میں بہ گیا۔

اد مانجھی رے کتے منش۔ کتے ڈھورڈنگر طوفان کی بھینٹ چڑھے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

گاؤں کے کبی نے کہا۔

اگست اندولن اور سپلر زوار

آشالہ - بھاردرد - ۱۳۴۸ء

کال کے گھٹا ٹوپ اندھمارے میں مناظر غیر مری تھاویر کی طرح روشن رہیں گے۔ کیونکہ ہر منظر جو معدوم ہوا باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لوگ گزرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیبو گروپ۔ ان کی آوازیں۔

چندر کنج اندھیرا پڑا تھا؛ جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہ برآمدے میں آکر بیٹھ جانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چار دیوڑھی لپٹے ایک داہمی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نوادر برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گزرتے پھوڑے ڈیوڑھی کی کندھی بجا رہے ہیں۔

روٹی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے۔ گھاس پر مدوشنی کا راستہ سا بن گیا۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔
”دیپالی“

”ارے تم لوگ۔“ دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً ہار آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ پچھلے برآمدے میں آجاتے ہیں۔ دیپالی بیٹھ جانے کا دروازہ کھولتی ہے، جس میں شدید صحن طاری ہے۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر چمک جاتے ہیں۔ نمودار محنتی تالی بجا کر ایک پھیر مارتا ہے۔ جو ترموئے دتے نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیا نشانہ باندھ کر سایہ حوض میں پھینک دی۔ ردی ہنر جی تیوری پر ہل ڈالے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ دیپالی بھی خاموش ہے۔

”ادھر آؤ۔ دیپالی۔“ رندی اچانک ذرا دشمنی سے کہتی ہے اور دیپالی کے آگے چلتی اس کے کمرے داخل ہوتی ہے۔

کمرے میں پچتر بھنجانا رہے ہیں۔ دیپالی نے روشنی جلائی۔

”تمہارے بابا سورہے ہیں۔“؟ روزی کا سوال

”بابا اور بستی ماں فدیے پور گئے ہیں۔ بستی ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس میں بابا کی شرکت رہی تھی۔ رات کو عبدالقادر برآمدے میں سوئے ہیں۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی۔ شادی اتوار کو، کھو کھو بیار پڑ گیا تھا اس لئے میں بابا کے ساتھ نہ جاسکی۔“ وہ پلنگ پر ٹپک جاتی ہے روزی دروازہ زنجیر ہے۔

باہر محمود الحق اور جیو تر مومے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اچانک اندر سے روزی کی گرجدار آواز لگتی

”عندار۔۔۔“

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بزمی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے اسے حلف اٹھوایا تھا۔

”لوڈی۔“ روزی کی دوسری گہج۔

”پارٹی ڈائرکٹور۔“ دیپالی کا جو شیلا، برا فروختہ، تو ضعیفی لہجہ۔

”برٹش ایجنٹ۔۔۔“ روزی کی پھینکار۔

”فاسٹ۔۔۔“ دیپالی کا ترکی بہ ترکی جواب۔

جیو تر مومے دتا اٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔ ٹک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوجھار نے سارا ہر آئندہ شرالور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھکوں میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی تپتا جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹپک کر وہ چاروں زور شور سے غل سن کر کھوکھو اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیر گھسیٹتا بیٹھک میں آتا ہے۔ وہ اب بڑا ہوجکا ہے۔ اور کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندرستی سے تکرار میں شامل ہو

اب یہ لوگ دہشت پسند شہداء کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر نہ در سے بجلی چمکی۔ وہ چند لمحوں تک چپ کھڑی، اندر جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گٹھا ہرے بھرے آنکھ پر اتنی نیچے آئی ہے، لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھائے تو گرنٹ میں آجائے گی۔

”کنک لتا بروا — کل شبید ہوگی۔۔۔“ اندر محمود الحق کھڑا ہے۔

”امیریل ہوٹل میں ریکان دا اور اومادی —“ جیو تر مومے دتا کہ رہا ہے۔ دیپالی چوکتی ہوئی
”اومادی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں — فاشنزم کے خلاف — ہا ہا —“

نار ہر شند۔

”سریری تو شش رائے کی صاحبزادی؟“ محمود الحق کا تجاہل عارفانہ۔

”ڈیڈی کو نائٹ ہڈل گئی —، ہڑے — جیو تر مومے دتا کانفرہ۔

اب ساری آوازیں گڑمڈ ہو جاتی ہیں۔

”ڈز اڑاؤ۔“

”چرخہ چلاؤ۔“

”بیپلرز میں معنوں نکھو —“

”ہڑے — ہڑے —“

”ہم جاتے ہیں دیپالی —“ روزی کی آواز۔ ”تمہیں یاد رکھیں گے۔ بائی بائی۔ گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ دیپالی۔“ محمود الحق اور جیو تر مومے دتا کی آوازیں۔

وہ تینوں پھٹ سے کواڑ کھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جمے گئے ہیں۔ وہ دنیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر جلدی سے پلکیں جھکالتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نگل لیتی ہے۔

کھوکھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک جانے میں واپس آتا ہے۔ کیا یہ بھی یہ تو اندہ
میں شامل نہیں ہوگا۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتاتا۔ عجیب گھٹا، تلخ سا لڑکا بننا جا رہا ہے۔ وہ خاموش

پنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

باہر بارش کی بھوار سے عبدالقادر کا آدھا بستر بھیک چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود گہری نیند ہے۔ جب بارش کا جھینسا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل رہا ہے۔ دوسرے ہم پھٹنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہوگا۔

۲۲

بد روزی

بھادر کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بھرجی نے اپنی سائیکل لیلی کاٹج کے ایک میں مقفل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھرواپس پہنچی ہے۔ گاڑی اسے مشن کیاؤنڈ منے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں مرگلے گھوڑے ہنہا ہنہا کر کھڑے ہیں اپنے سم ہے ہیں۔

روزی بھرجی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے کسے لئے داخل ہو چکی ہیں۔ روزی بھرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اس قدر تہنک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی حقائقیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچی، وہ پھیلی رسال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان عیسائی کی تلاش از سر نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں۔ وہ اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ بے پڑھائی کی وجہ سے دیر تک اسے یونیورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن گچھے جا کر ٹن کرتی ہے (اس کی شاگردیا سمیں ہائی اسکول پانس کر کے اب این اے کے لئے اس سے انگریزی ہے) اس طرح روزی عموماً صبح کی گئی گدات پڑے لیلی کاٹج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر دہے تو پادری بھرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انھیں اس پر مکمل اعتماد ہے۔ بھرجی نے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی فصلیں ڈھادیں۔ جنگ دنیاوی

اور ہا بند وضع ڈھاکے تک پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری ہنری اپنے اتوار کے وعظوں میں اس اخلاقی کج کردی کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گناہگار شہر کی مانند یہاں بھی عام ہو جائے۔ ۱۔

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا فودوتا طبقہ تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگال میں پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں براہیمائیر کی بنیادیں ہلا دیں۔

۵ فردری کو سقوطِ سنگاپور کے بعد ریورنڈ ہنری نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل منعقد کی، کوئٹیر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلبِ بڑستوں کی پادری ہنری کے کلمے میں ایٹمی برٹش بھڑوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آگ

اور — O GOD OUR HELP IN AGES PAST

OUR HOPE IN YEARS TO COME

OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST

AND OUR ETERNAL HOME.

روزی پچیس سے کوئٹیر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT

ARE LIKE AN EVENING GONE

SHORT AS THE WATCH OF NIGHT

BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانی بونے سارے براہ پر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر سپیل بنگال تک پہنچنے والے پناہ گزینیوں کے حالات سن سن کر پادری ہنری کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے آبرمن ہندوستانی اور برمی عیسائی قافلہ کے لئے مشن کپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری ہنری د رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دلجوئی میں جُتے رہے۔

اب بنگال کی جھیاؤنیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے، جو برما کے جنگلوں میں

ی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔
ریورنڈ بنرجی کو سوا چند امریکن مشنریوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر
نوں انہوں نے اس اجنبی، بے نکی، انوکھی، ایسی پیورم قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے
بیب امریکن افسروں کی ٹولیاں جیب گاڑیوں میں لدر مشن کپاؤنڈ آنے لگیں۔ انہوں نے بیش
نالت عیسائی غرام میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں۔
ٹی چارے کے ساتھ انگریز ان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے۔

ملایا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں۔ ایک
ی بنرجی نے اسٹیشن میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملایا میں جا پانیوں نے جنگی
لیا۔ سمجھناش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں۔
لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے انقلابی، پرانے پاپی، اندھیری راتوں
از مشین کر رہے ہیں۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھراتی ہے۔ کیونکہ لائبریری مشن کپاؤنڈ سے
صلے پر ہے۔

ٹھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ لیکن
سبز بنرجی حسب معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آج اس نے بہت
پر لگا دی۔

اپنے کمرے میں جا کر پانی سے صیقلی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آکر میز پر بیٹھ گئی۔ سبز
انچن سے گرم گرم ٹوچیاں لے کر آئیں۔

ریورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکایا۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکایا۔
بھی۔ مگر کن انکھوں سے اپنی رست واپس دیکھتی رہی۔

لے ہمارے آسمانی باپ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں تیری
اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر بستی رہے۔ آمین۔ پادری بنرجی نے گریس ٹیبل کر کے

اٹھایا۔ ایستھر بنرجی نے ٹوچیاں پیش کیں۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا بنا کر
 کرنے کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے کھین رہی تھی۔
 ”کھانا کھاؤ بیٹی۔“

”جی ہاں بابا۔“

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا اور پانچ چھ نوالے نکلنے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگا
 پادری بنرجی نے اسے ٹوکا۔

”کیا بات ہے؟“

”بھوک بالکل ہے ہی نہیں بابا۔ یونیورسٹی کینیٹی میں بہت سے سمو سے کھائے تھے۔“
 ”سائے ملک میں ان بد معاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں تم اتنے
 گئے گھر لوٹی ہو۔ جو رزف ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔“

”مہیں بابا۔ گرو دیو کا انتقال ہو گیا ہے نابے چارے کا۔ تو یونیورسٹی میں ہم لوگ ان
 میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کے بعد آ
 جانے حسب معمول اذہ شروع ہو گیا۔“

”آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔“

”بہت اچھا بابا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اچانک ریورنڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بد بخت، بغاوت کی وجہ سے بند ہو
 ہے۔ یہ پھر مجھے دقتا نویں احمق بد بخت سمجھ کر بے وقوف تو نہیں بنا رہی؟

”روزی ادمہ آؤ۔“ انہوں نے کڑک کر کہا۔

وہ جھٹک گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم پھر ان — ان غداروں سے جا ملی ہو؟“

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”روزِ چپ۔“ ایستھر بنرجی نے سہم کر باپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی۔
 ”اور سنئے پایا۔“ روزی مزے سے کہتی تھی۔ ”تیسویں کے بچاریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر
 GHETTOS میں ڈال دیا۔ (میری اور بے چارے پایا کی ڈسٹنگ سو ساسی!) اس نے دلی میں سوچا اور
 یہ جو پایا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک جمہنی سوئپ یا اُسے کیا کہتے ہیں۔
 پاروومن۔ یہ کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں؟۔۔۔“
 ”کچ بخشی مت کرو روزی۔“ پادری بنرجی نے ڈامٹا۔

روزی کو ایک اور نکتہ یاد آیا (گو اس بحث بخشی میں آدھ ٹھنڈہ برباد جائے گا) ”یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان
 کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔۔۔ خصوصاً شراج الدولہ کو، جو میرا ہیرو ہے
 ۔۔۔ تو کیا آپ کے ایجنٹس انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دے جاتے تھے؟ جسے
 دیکھو ٹاؤن آف لندن میں پڑا جھینک رہا ہے اور دوسرے سڈر کھٹ سے سرفاب۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف
 تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑی چوری کی سزا موت تھی۔ اب یہ ”لائسنڈ آرڈر“
 کا کن منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں۔ یہ انگریز کب کبے کہنے۔۔۔ ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب
 بنایا ان بنیوں نے“

پادری بنرجی عینک تار کر اسے صاف کرتے ہوئے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بدتمیز، گستاخ، زبان
 دراز اور ذہین بچی۔

”اور بتاؤں آپ کو پایا۔۔۔“ روزی اب صریحاً بے رحمی پر انزائی تھی۔ ”آپ کے وہ جو ایک کٹر
 رومن کیتھولک دوست ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس باسکو۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے
 چارہ ایک اعلیٰ خاندان کا بنگالی ہے تو انہوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا۔ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے۔
 ماقوہ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے سیاہ رچایا تو انکل باسکو فخر سے
 بھولے نہیں سمائے حالانکہ۔۔۔ حالانکہ وہ رومن کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سوئے سے یہودی ہی ہے۔ اور
 جناب آپ نے بھی فوراً فلپینا کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ تو پایا یہ تو غلامانہ ذہنیت اور گوری چمڑی کا رعب۔“
 ”بس کرو روزی۔“ ایستھر بنرجی نے سر اٹھائی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے۔
 وہ گہرا سانس لے کر کرسی سے اٹھی۔

”اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔“ پادری ہنرجی نے طولی آواز میں جواب دیا۔ ”نکال دو انگریزوں کو
 رستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔ تم سب الرٹائیشلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ پتے تمہارے
 لے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا، وہ بھیا نک خانہ جنگی ہوگی کر دیکھ لینا۔ تب تمہیں اس
 بوڑھے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔“ ان کی آواز بھرا گئی

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”پاپا۔ میں تو لوہی آپ سے تفریبا بحث کر رہی تھی۔ آخر مجھے
 فی ڈیٹوں میں یونہی ٹریفیاں ملتی رہی ہیں، صفت میں قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جوتاہ
 بچ رہی ہے میں خود اس کے خطاف ہوں۔“

”تم نہانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر مل رہا ہے۔“
 ”ہیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ بالکل۔ بالکل۔“ روزی نے جوش سے ان کی
 پوزی کر دی۔

”اچھا بس ہو گئی تم لوگوں کی ڈبیٹ۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔“ ایستھر نے اطمینان کا
 دیتے ہوئے کہا۔

”یس ماما۔“ روزی نے دروازے میں جا کر باہر جھانکا۔ مینہ محکم چکا تھا۔ ”افوہ کتنی گھپ اندھیرا
 ہے ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر چٹنوں کیسے چمک رہے ہیں۔ پاپا۔“ اس نے مڑ کر پادری ہنرجی سے دوبارہ
 ”کیا آپ واقعی خفا ہو گئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی سچ پاپا۔“ کرسی کے پیچھے آکر
 بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ پادری ہنرجی خوش ہو گئے۔ ہینک اتار کر اسے رفا سے
 لیا۔

”سچ پاپا۔ یونیورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹری سوسائٹی ٹیگور کا تعزیتی پروگرام کر رہی
 جلسہ ہوگا بڑا۔“

”دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟“
 ”جی نہیں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ پاپا۔ راجندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”گڈ نائٹ پاپا۔“ اس نے جھک کر پورنڈ ہنرجی کا سر چھوا۔

”گڈ ٹائٹ ماما“

”گڈ ٹائٹ۔ گڈ ٹائٹ یو مائی جائلڈ۔ والدین نے تقریباً ایک زبان ہو کر کہا۔

روزی ایک لحظے کے لئے ٹھٹھکی۔ ان دونوں پراچستی سی نظر ڈالی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ریورنڈ سبزی کرسی سے اٹھے، اور دوبارہ ٹھٹھکے۔ سائیڈ بورڈ پر رکھے گلدان کو چھوا۔ گڈ ٹائٹ اور ہوم۔ ”کے طفرے پر نظر ڈالی جس کے مقابل میں یسوع“ کے ”آخری طعام“ کا بڑا سارنگین پرنٹ دوسری دیوار پر آویزاں تھا۔ وہ چند سکندریک اس تصویر کو دیکھ کئے۔ پھر حسبِ عادت کمرے کے چھپے ہاتھ باندھے سر جھکائے ہنسن اور خداوند تعالیٰ کے مشکور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد سبزی کرسی نے گھر کے سارے کام کا ج سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ معمول آدوٹین کی دو سیالیاں تیار کیں، ایک پیالی مشتری سے ڈھانپ کر سائیڈ بورڈ پر رکھی اور دوسری نے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی، جوں نے پیالی میز پر رکھ دی اور غسل خانے کی طرف ٹھٹھک کر آئی۔ ”روزی بیٹا۔ صبح کو دھو بی آئے گا، اپنے کپڑے نکال۔“ وہ اپنا جلد پورا کر سکیں کیونکہ نہ جانے کیوں آپ سے آپ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ نہ جانے کیوں ان کو خیال آیا کہ روزی بھاگ گئی وہ اپنی جگہ پر بند رہ گئیں۔ پھر انہوں نے نوٹس کیا کہ غسل خانہ اندھیرا پڑا ہے۔ اور تیز ہوا اندر آ رہی ہے انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ غسل خانے کا باہر کی رُخ کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

شاید وہ جگنو پکڑنے سبزی باڑی میں اتر گئی ہو۔ سبزی کرسی نے دروازے میں جا کر آواز دی۔ ”روزی۔“
— بعد کی بیٹے۔ پھر وہ چھتری لگا کر اندھیرے اور کچھ میں باہر نکلیں۔ ”روزی سر شام سے جا کر اپنے کونڈے میں سو رہی تھی۔ اُسے کیا معلوم ہو گا۔ انہوں نے پورے کپاؤنڈ کا چکر لگایا۔ سارے کوارٹروں میں سوتا پڑا تھا۔ گرجا کی برساتی میں روشن بل پر سینگے چتر کاٹ رہے تھے۔ سارے میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ بجی۔ ایسکو عینا نک رات میں تو کہاں چلی گئی۔ یہ کیا ہوا؟

وہ گھر میں واپس آئیں۔ کچر میں تپت چلیں پائیدان پرانا کر آہستہ آہستہ جتنی سارے کمروں میں گئے دروازے بند کئے۔ تیاں کجائیں۔ اور پھر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئیں جہاں ان کے شوہر شبنم خوانی کا لبا آ

دو لیٹن کے منتظر غنودگی کے عالم میں سید کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے کو جھک آیا تھا۔
 کی آہٹ پر وہ جھٹکے۔ اور ان کی طرف دیکھ کر بغیر علت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
 ایستھر جرجی نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔ ”پال — ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔“
 پادری بنرجی نے سر جھٹکا، بلیکس ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔
 سے آواز نہیں نکلی۔

ایستھر گری بالا نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دوڑا نو بیٹھ گئیں۔
 باہر بجلی زور سے چمکی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیلو کو روشن کر گئی۔ (مناظر وقت
 معدوم نہیں ہوں گے)

پادری بنرجی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، منجمد بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے لرزاں ہاتھوں
 سینک مٹولی! ایستھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے سینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنرجی نے
 ہلنگ کے سرانے سے انجیل مقدم اٹھائی۔ ایستھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور
 ان سے سڑھانپ ہوا۔

”LET US PRAY“ پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔

ایسی ساری رات پادری بنرجی حضرت ایقوبؑ کی گریہ خذاری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے سارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزار بار برسوں
 نے ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح
 جود ہیں۔

وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

گنگا اور برہمپتر

ڈیک جیر پر دُعا آگے کو جھکا ہوا نو جوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا — ”ہم نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیئے اتنے سند بسے بھجوائے۔ تم نے ایک کا — صد ہے، ایک خط کا جواب نہ دیا۔ ہماری شدید پریشانی کا بھی تمہیں خیال نہ آیا۔ ہمیں طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم پکڑی گئی ہو۔ شاید نچے بابو نے تمہیں گاؤں بھجھک دیا ہو۔ شاید زبردستی تمہاری شادی کر دی گئی ہو، پھر ادنیٰ کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمہارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

”ہماری عقل حیران ہے —“ چند لمحوں کے وقفہ کے بعد نو جوان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ روئے کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی بتلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمہیں لکھا کسی وجہ سے خفا ہو گئی ہو تو بتلا دو۔ اور معاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا؟“

نیم تاریک اور سنان ڈریک کے سرے پر صرف سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھینکا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بیچ پر محو خواب تھا۔

”ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمہیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ سگریٹ ایک جھٹکے سے بدیا میں جا گرا۔

”پچھلے جولائی سے — کھلنا کی اس اندھیری رات سے لے کر نومبر و ستمبر تک ہم ادھر ادھر روپوش رہے۔ سند بن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈوینچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لئے تمہیں کوئی دوسری پیغام بھی نہ بھجوا سکے۔ ادارتیں مصروف رہنے کو غم جاناں کے متعلق سوچنے کی ہمت ہی نہ ملی۔ دیویتی والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی اور ہم — کدھر دیکھ رہی

”کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے؟“

دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزرده لہجہ۔ ”کیا تم اس لئے تھیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آ سکے؟ ہمیں معلوم نہ تھا واللہ کہ تم اس قدر دیوانی لڑکی“

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے مہیب دیبا میں جاگرا۔
 ”اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیجا گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آ سکتے،
 تم — تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو، اس وجہ سے مجھے بغیر ”ٹرائل“ کے ”عاق“ کر دیا۔ یہ کیا
 ناس ہے؟“

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔
 ”کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہیے؟ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی آخری
 ڈیم یو —“

تیسرے سگریٹ کے لئے ماچس جلانے کی کوشش، مگر ماچس سبلی ہوئی تھی۔
 ”کیا تم کو — کسی اور سے — کسی اور — کوئی نور — ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔
 کیڈ بیا بھی دیا برد ہوئی۔

”شٹ اپ۔“ دوسری ڈیک چیر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ایک لمحت تھلا کر جواب دیا۔
 وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ ”شکر ہے؟“
 ”کیا شکر ہے؟“ وہ بلی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سکیر ٹکڑی کے سرکاری کا آنچل جسم سے
 رح لیٹا۔ نوجوان نے کھادی ریشم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔
 ہر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔
 بے چاری بے وقوف، نالائق بچی تھو۔

”آپ کو — آپ کو سردی لگ جائے گی“ لڑکی نے دھیرے سے کہا۔
 ”تم سے مطلب؟ مر گئے تو شہیدِ محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا

غیر نیکل عشق چل رہا ہے۔ لاجل ولاقہ۔

کڑوک، چار سو بیس، دھوکے باز۔

”بی اے پاس کر لیا؟“ نوجوان نے پھر مات کی۔
”گریا۔“

”فرسٹ ڈیٹک۔“

”جی۔“

”ارے ماہ سٹابش۔ مبارک ہو۔ تو اب گویا تمہاری شادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جا رہا
س نے کھنکار کر کہا۔“ بی اے پاس، ماسٹر خانہ داری میں ماہر، سند سنگیت کی استاد، کانسٹیبل کینا۔
”کابری میرو زگار ہیں ہنوز دی ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی۔“
”کیونکہ بے ہودہ، لوفر۔“

”وہ اٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھادیا۔“ آپ اب کہیں بھاگ کر نہ
جاسکتیں۔“

”آپ کا دماغ خراب ہے۔“ لڑکی نے آہستہ سے کہا بعد پھر اٹھنے لگی۔

”یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟“

”عبدالقادر جالی کے ادھر چلے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس۔۔۔ کیا کہنا چاہئے۔۔۔
”کلفی پر ان کی نظر پڑ گئی۔“

”پچھلے سال لگ بھگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔ لیکن زیادہ تر
قسم کا AMNESIA لاحق ہو گیا ہے تو۔۔۔“

”ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ ہمیں ہوگی۔ گڈ گریٹس۔۔۔ خیال آتا ہے تو رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تم واقعی بدل گئی ہو۔“

”جی ہاں۔“

اب وہ خاموش ہو گیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، میں سیکار اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی: ”آپ — آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ — آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا۔“

وہ خوش ہو گیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بدلا۔

”کس طرح پکڑ لیا۔“ اس نے بے شاش لہجے میں جواب دیا۔ ”اس طرح کہ میں ڈھاکے میں بیٹھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنان پڑا تھا۔ چکر لٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے مخبر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں کہ بچے کوئی سترآبا بویں ان کے ہاں لے گئے ہوئے ہیں۔ آپ کسی خاندانی شادی کے لئے عبدالقادر کے ہمراہ فریدپور تشریف لے گئی ہیں اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔ گھوگھو کی بیماری کی وجہ سے۔ چنانچہ میں نے فی الفور فریدپور کالٹ کٹایا۔ میں فریدپور فریدپور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی بستی ہاں کے گھروالوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا کہ آپ کس روز، کس وقت نرائن گنج کے لئے روانہ ہو رہی ہیں چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس ناچیز نے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پرہہ سیمیں پر غور و لحاظ فرمائے۔“

”آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔“

”نہیں کر سکتے تھے، آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔“

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دنیا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چڑ سے کچھ دور لمبی سفید دارھی والا مسلمان بوڑھا پاکستان اپنے کھلے کین کے سامنے جنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے نزدیک لگی ہوئی جیھڑا فتور سرچ لائٹ نے دیا کو حیدر نمک روشن کر رکھا تھا۔

”روزی کیسی ہے؟“ کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

”روزی — محمودا — سب لوگ — آپ کو نہیں معلوم؟“

”ہاں۔ مرتد نے ڈھاکے میں مجھے بتایا — ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جاسکتا۔“ اس نے

گہری سانس لی۔ ”اچھا کہیں سے جس لئے کراؤ؟“

کس مزے سے حکم چلاتے ہیں، میں گیزر ہوا، ان کی زرخیز۔ جہڑوں کی داسی کتنے ہی کامیڈین جایش

— پندت نہرو ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے فاشنزم کے خطرے کو پہچانا تھا۔ ” لڑکی نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بالغ نظری ترقی پر ہے۔“

دریا کی متلاطم لہریں اسٹیمر سے ٹکرایا کیں۔ کبھی کبھی پانی کی جھینٹیں اڑ کر اوپر آ جاتی تھیں۔ لڑکی کے بال بھینگ گئے۔ رات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ دفعتاً لڑکی نے سوال کیا: ”آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا — راز کی بات ہے؟“

”نہیں۔ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں پراونشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

مسلم لیگ — نواب قمر الزماں چودھری — ارجم — جہاں آ —

جہاں آ دریا کی گدلی موجوں پر ڈونے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں بندھے پڑ گئے۔

”جیوتی دا، روزی، محمودا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے، روزی نے تو مجھے غدار اور لٹری

ما — حد ہے —“

”تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا —؟ تم تو دیش بابو کی بھتیجی ہو —“

”آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔“

”کب —؟“

”اپنے پچھلے خط میں۔“

”مائی گڈنس۔“

لڑکی نے اور زیادہ ہڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ ”حالانکہ مجھے اتنی شدید مندگی سی تھی کہ میں کا کا کو

LET DOWN کر رہی ہوں۔“

”مائی گڈنس —“ نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھجک کر پوچھا۔ ”اب بتلا دو ہم

سے کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پُرسکون جہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیس میں آگ لگ رہی ہے۔" اس نے طولی آواز میں اڑکی جاکر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اس کے برابر آگیا۔ "شاید میں بزدل ہو گئی ہوں۔" لڑکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ دیرپا روشنی کا ایک اور دریا بہا رہی تھی۔ "آپ کتنے دن رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی الجھک میں۔ مسلم لیگ ایک عوامی بن چکی ہے، اس کی نئی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔"

بوڑھے ناخالصے کاں کھڑے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہو کر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ "نوجوان گود دیکھا۔ نوجوان نے مسکرا کر اسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ "بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جنتا پروگرامر لیڈر شپ کی منتظر ہے۔"

"نواب لوگ تو پروگرامر لیڈر نہیں ہیں۔"

"پروگرامر لیڈر شپ ہماری ہوگی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی میں آج آگست ۲۲ء کی اس رات کر رہا ہوں۔ گمہ میں باندھ لو!"

نواب قمر الزماں۔۔۔ یہ ارجمند منزل جائے گا۔ ارجمند منزل جائے گا۔۔۔ اس کا دل ذرا فور سے دھڑکنے لگا۔ وہ رینگ پھجک کر نیچے لہروں کو تانے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات مری سدن میں جو وعدہ میں نے اپنے آپ سے کیا تھا اس پر قائم نہ رہی۔ اُسے چمکے سرا آگیا۔ اس نے جنگلہ مضبوط سے پکڑ لیا۔ جنگلہ کا لوہا بالکل سچ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گزار دی۔ اب نہیں اب کچھ نہیں۔ اب اُمندہ بالکل پہچان کرنے میں لگی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سے اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گزر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گزر جائے گی۔ اب نہیں یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔

بوڑھا پیستے پر جھک چکا تھا، اسٹیم تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

”ڈھاکے میں آپ کہاں ٹہرے ہیں۔“ لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔
 ”اُدا کے ہاں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک زمانہ تھا کہ ڈوڈلینڈ میں ہمارے فرشتے تک۔“ بھٹک سکتے
 تھے۔ نہیں خبر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو بھٹکا تھا۔“ اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ قہقہہ لگا کر
 پرے سرک گئی۔ وہ کہتا رہا۔

”اب ہم مزے سے عین سرپری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اُدا سے تم کب
 سے نہیں ملیں؟“
 ”مذمتیں ہو گئیں۔“

”آنا ان سے ملنے۔ وہ دلی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں آج کل ان کے والدین کلکتے گئے ہوئے ہیں اس
 لئے سارے دوستوں کا اڈمبلے فکری سے وہیں ہوتا ہے۔“

”دلی میں آپ اسپرل ہوٹل میں ٹہرے تھے؟“
 ”ہم۔۔۔؟ نہیں تو۔ اُدا وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے، کیوں؟ تم کو کیسے
 معلوم ہوا؟“

”آکاش بانی آئی تھی۔“ لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ زحوان نے اسے غور سے دیکھا۔
 ”تم واقعی بدل گئی ہو۔۔۔ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تعجبی آگئی ہے۔ تم اتنی سیدھی مانتی
 بھولی تھیں، تمہیں کیا ہو گیا۔ کون تمہاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے؟ اس نے بجا جت سے کہا۔
 ماں۔ مجھے مضبوط بنانا مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنانا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے
 لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلا طاری تھا۔

”تم دن بھر گھر پر رہتی ہو؟“

”جی ہاں۔“

”میں کسی وقت تمہارے ہاں آسکتا ہوں؟“

”کسی وقت نہیں۔“

”کیوں؟“

”لیجئے ہی۔ میری مددنی۔“

”اچھا۔“

اسٹیمراب دیا کے موڑ سے گزر چکا تھا۔ ملاح نے بہتہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ ہے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے دیا کی منور لہروں کو تلکتے رہے۔ گہرا سلاطم دیا۔ منور پانی، حد نظر تک روشن۔ چاروں کھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا، اور تاریکی اور خدا کی روح پانیوں پر ڈولی تھی۔ یہ تخلیق کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے، اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔

اور آدم و حوا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (آدم و حوا، اسٹیم کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں، استعائے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے امانات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیر لب مسکرایا)

روحی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور خدا — سسگم تو گواندہ گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنایا دیا — اس کے پانیوں میں گنگا کون سما ہے اور برہم پتر کون ہے؟

لڑکی کو زور کی چھینک آئی۔ وہ اس کی طرف ہڑا۔ وہ سول سول کر رہی تھی۔

”تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چلو اندر چلیں۔“ نوجوان نے سخت کر چو کر کہا۔

”نہیں۔ میں تو ہمیں کھڑی رہوں گی۔“ لڑکی نے صبر سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسرور ہوا۔ اور خود بھی ہنسنے لگا کر ہنسنے لگا پھر اس نے آہستہ سے زینلگ پر رکھے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

ساحلی بتیاں دھندلکے میں ٹمٹما کر گزر چکی تھیں۔ زرائن گنج کی روشنیاں قریب آتی گئیں۔ اسٹیم مصروف بندرگاہ کے اجلے میں داخل ہوا۔ زرائن گنج سامنے جگہ کا رہا تھا۔ زرائن گنج — اس کی گلیوں کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوڑ، اسٹیشن، گہما گہمی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شدہ میغل پل، کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکہ ہمیشہ کی طرح منتظر طے کا شیفٹی، محفوظ، مامون بہرہ دنیا مترزلزل ہو چکی تھی، مگر شاید موجود تھی۔ مسرت کا وجود بھی تھا۔ ملنا ممکن تھا۔ آخر دنیا

وایسے لوگ بھی تو موجود ہوں گے جنہیں چین اور خوشی میسر ہے؛ اور مسرت کے حصول میں خود غرضی گناہ

لڑکے نے ہوا سے پچنے کے لئے کھادی سلک کی دودھری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے روپٹ لی۔

۲۴

چارلس بارلو، بنگال سوئین

”نغماتِ ہند از الفِ حمیم

پیارے بیٹے تم کے لئے۔ انیسویں سالگرہ پر

تمہارا ڈیڈ

میمی عکھ، ۱۸۸۶ء

چارلس بارلو نے میر کا مگ تپائی پر رکھ کر سنہری جلد کتاب کا احتیاط سے ورق الٹا۔ یہ پوری کتاب تھی۔ جو خود مصنف نے جو ”الف، حمیم“ کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی نیٹولائف کے متعلق بید پر لطف اور طنزیہ نظریں لکھا تھا، گریڈ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کا مقبول فن حمیم ”در اصل“ احصار کا کیپٹن یلڈ صمیم تھا۔ گریڈ ڈیڈ کا جگری دوست، گریڈ ڈیڈ ان دنوں ل میں ڈویژنل کمشنر تھے۔ انہوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفورڈ سے بول پر اپنے والدین سے ملا بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال میں بسنے والے تھے۔

ماضی کی وہ افسانوی ہستی ————— بنگال سوئین!

چارلس بارلو نے اداس، زیر لب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے

کراد موجود تھے جو ماضی کے بنگال سولجین کی زندگی کا لازمی جزورہ چسکے تھے۔

پہلی نظم ————— "ریونڈک فرسن کا خیال تھا کہ "انڈین ناچ" شیطانی گود کھدھندا ہے۔ ایک مدد راجہ نے ساری چھاؤنی کو ناچ کے لئے مدعو کیا۔ باغ مقفوں سے سجایا گیا۔ سیم صاحبوں کے لئے خیمے لگے۔ بڑھیا شربیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا۔ "تماشا شانہ بلوٹ اچھا" تھا۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا۔ عجیب عجیب زیورہ ناک میں پہنے ناچ گر لڑائیں اور ٹوم ٹوم کی جنگی تال پر تھرکس۔ سارندوں کے وحشیانہ ساز چینگے۔ ان کے چوہدار عود دہان اور مشعلیں سنھالے پیچھے کھڑے تھے۔ جیت رفاہ رانا ماما کہہ کر ناچنے لگی۔ ریورنڈک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ رانا ایک دیوتہ ہے۔ ورنہ انہیں تعجب نہ ہوتا کہ شیطان کی چلی ایک دیوتا کو پکار رہی ہے۔ ان سحلات سے جواں کے پرچ سے متعلق نہ تھے، ریورنڈک فرسن لاعلم تھے۔"

آج مجدد الوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی ٹکمن کے اسٹیش پر ناچ رہی ہیں۔ بے چارے ان چیمہ تم مجھے اپنے بلیر ڈرم، جڑٹ، تسمارک اور فرنگو جرس دانکی باتیں کرنے والے فوجی افسروں، اپ کٹری، مفصل، بینڈ اسٹینڈ، گزٹ، پامیر، ٹفن اور چھوٹا حاضری کی حکایات سنائے جاؤ۔ کہ اس گشتہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری نظم ————— "چاندنی رات، جب دور سے نیٹوز کے ٹوم ٹوم کی بھیانگ آواز سنائی دیتی ہے، بالندگی کھینوں ایسی بھنھناہٹ۔ چوکر اسکارلاؤ۔ میں برآمدے میں آرام کر رہی ہوں بیٹھا ہوں باہر سرد کے دوختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے۔ چوکر شرب انڈیتا ہے۔ اوہ انڈیا! سہانی شاموں کی سوز منی۔ تہوں پر لرزاں تیری چاندنی، تیری واحد دیوانگی نہیں ہے۔"

چارلس بارلو نے پلی کی پلی کو آنکھیں بند کر لیں۔ پھر پیر کا مگ اٹھا کر ایک صفحہ اور پلٹا۔ "میرا چالاک منشی محمد دین، مددنا نہ مجھے اور دو پڑھانے آنا۔ گپتی۔ وہ انگریزی بولتا۔ "نیٹوبات" بہت کم ہوتی۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لانا اور دو چار آنے چرالیتا۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے، منشی گپتی ہانگتا اور میں چپ چاپ بیٹھا جڑٹ پیا کرتا۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی آوازوں بولی کہ کوئی سالار جنگ بھی گیا بولے گا۔"

ایک اور نظم ————— "سواجر کر شخا باؤ ڈی دو ————— ہند کے اس خطے میں جہاں تیسگو۔"

جاتی ہے۔ راجہ کرشنا مادوڑی ڈورہتا تھا۔ جو اس سال افسوس کہ پرلوک سدھارا، راجہ ان میں سے تھا، اگر جن کا رنگ صاف ہوتا تو وہ سیدھے سیدھے انگریز بن جاتے۔ اس کی عادتیں صاف ہی تھیں۔ نہ بھنگ پیتا تھا، نہ ریحیں کھاتا تھا نہ پان۔ تیلیگو لہجے میں انگریزی خاصی بولی جاتا تھا۔ پانی "پار ولایت ہوا یا تھا۔ بلیر ڈکھیلیا تھا۔ اور اپنے ساتھ ولایت سے تصویریں اور (نقلی) کے بندل لایا تھا۔ جو ان احمق عورتوں نے اس سے دینے تھے جو ایک دولت مند اور نشیل کو دیکھ کر بخواہ جذبہ جاتی ہو جاتی ہیں۔ راجہ پرلوک ناچتا تھا۔ چپل کے بجائے بوٹ اور ٹوئیڈ کا سوٹ، اس ج بھی مثالی تھا۔ اپنی دیاست کو متدن کر چکا تھا۔ ہیلتھ کمیشن، دیکیس نیشن، ایڈمنسٹریشن، ریلوے تعلیم، یہ اور وہ، اس کی ریاست اتنی عمدہ ہو گئی تھی کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کبھی اس کا الحاق نہ کریں۔ لارڈ وائسرائے نے اس سے کہا کہ وہ ہمارا بہترین فرزند و لبند ہے اور ایک ٹھوس ترگوں کی سلامی کا اسے

ارنہا۔

”راجہ گوتاما مغربی ہو چکا تھا۔ مگر دل سے اصلیت میں ایک دم بلیک نیٹو تھا۔ دھوم دھڑکتے سیاہ ہزاروں خوشامدی، حوالی موالی، ناچ گرنز، سازشی مصاحب، بھکاری، پروہت، گھوڑے، اسے ساتھ رکھتا تھا۔ گوفلیوٹ بجانا سیکھ چکا تھا مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری صبح دیتا تھا۔ پلم ہڈنگ کا مدارج تھا مگر کرمی اینڈ رائس پر مرنے لگا تھا۔ ان خفائن سے اس کے کردار کی طبی ظاہر ہوتی ہے کہ راجہ کرشنا ماہ وڈی زوردار اصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا

اررہا۔۔۔۔۔“

اتوار کی صبح تھی، چارلس بارلو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اگلا بیٹا۔ کتاب اسے سجدہ تحسب معلوم ہو رہی تھی۔

ایک اور نظم ————— ”اولڈ ٹائمز لکھتا ہے: فرانس کو معلوم ہونا چاہئے کہ مشرق اولڈ کی ذمہ داری ہے۔ کہ فرانس کے لئے چند لگے اور پانڈیچری ہی کافی ہیں سنا قابل یقین، کہ فرانس اہل کی لالچ کرے۔“

پانچ چھ صفحات کے بعد ایک نظم نے چارسا بار کو متوجہ کیا۔ — صبح کی سترہ سواری، جب
 کے مرنے مانگ دیتے اور گائیں ذکر آتیں، کابل جردا ہے سو رہے ہوتے، تب میں ادا سمجھ مونسوں

کی ہوئی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشیانہ جنگ جبار کی یادگار قلعوں کے کھنڈر، گاڑی بانوں کے ہجوم، بیلوں کی گھنٹیاں، پنگھٹ، کسی نیٹورس کی گاڑی، بکوڑے، برابر سے گزر جاتے، گھنٹی بجاتا ڈاک کا ہر کارہ چڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گزرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آ رہا ہے، صبح کی بندوق دھتی، مندی، نیٹو، ہجوم، رنگین پردوں والی پہلی میں سے بھاگتی ناچ گریز صاحب لوگوں کو دیکھ کر بیک وقت بے لگاتیں۔ پھر ایک صاحب اور اس کی لیڈی گھوڑوں پر گزرتے، دور سے آبادی نظر آتی، ندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر، دھندلا، حسین مناظر اور اسمتھ جو اور ٹیل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا — یہ غلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو —

”صاحب —“ عید الغفور نے اندر آ کر کہا۔ چارلس بارلونے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارلس بارلونے آگے ٹرھٹا شروع کیا۔ ”پولس والا ڈاکٹر —“ کلکٹر تک کال، جو نرناں کا مفروضہ پیشین والا سب، گوتم کنز سول اور سشن جج، نرم دل ڈاکٹر شاربپ سول سرجن جس نے کالا کے دلوں میں جب جیل کا لڑا والوں سے بھر لیا تھا دن رات کام کیا۔ اب ڈاکٹر کے بعد ڈاکٹر گھر رہا ہے۔ رلیونڈ مائیکل دائن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر مجھ پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ مونسون آنے والی ہے جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے، مکال کہتا ہے۔ بارش آنے تو چپے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے، لیکن کپی ٹیشن والا شکار کے بجائے ذرا انٹلیکچول باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیریں اور جگر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے چرٹ سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خراٹے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر سب ”ڈمرٹ گپ“ سے پور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔“

”اجاڑ بنگلہ —“ سر نکا ٹیم ہیں، کا دیری کے کنرے ایک بنگلہ، جس سال ٹیمپو گراؤ سے دیر لیا۔ بڑا ہے۔ باغ میں درخت آبی بھرتے ہیں۔ سنگور شور بجاتے ہیں۔ اٹو لیتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلعہ کی فصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی لسلوں کے لئے ایک سبق، وہ زمانہ جب ہمارے جبری نوجوان شیریں کچھا رنگ پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد اس

ایک اور نظم ————— ”انگلینڈ ہو۔! بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلے
 ٹرپر گھر میاں پر میری رحمت واپس جا رہی ہے۔ گیاہ برس بعد ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جو
 رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھالے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیاریاد رسوت کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔
 ہندوستان نیلا ہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ ہٹاتا ہوں
 ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دو ستو، وباؤں نے تمہیں کھایا۔ انگلستان
 خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع سورج کے دیں، ہماری جلا وطنی ختم ہوئی۔

اگلی نظم ————— ”اوٹی میں شیلے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان مک ڈوس کہتا
 — پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے تمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جا
 تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کر کیا رہے ہیں؟ ہم نٹوز کو کالج جانے کے لئے کہتے ہیں، اور پھر ان کو ایسی نو
 دیتے ہیں، جو کہ لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انہیں شراب نوشی کو منع کرتے ہیں، مگر انہوں کی کاشت کو
 ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم لکڑ لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو، اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خولا
 کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پیٹر اسٹریٹ جب ہمارے لڑکیوں کو یا منڈا لڑکھو جٹلمین سے شاد
 کرنے کی اجازت دیں، جب با اثربا بوفوں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کر دیں
 تب ہی اس ذمہ داری کو نبھاسکیں گے، جو خدا نے ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے۔

”تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا: تمہارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو سہ
 بجو اس معلوم ہوتی ہے تمہا پر نے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے این ہیں۔
 جناب مائی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہو گا ہم اس کو اپنے قبضے میں رکھیں گے۔“
 ”ہمیشہ آگے جاؤ۔“

”ہمیشہ دہشتی فرمٹی چندر عاقل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور تنجیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاس
 میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصلحین ماضی سے مستفزیں۔ اور ذات پات کے بندھن کوٹنا چاہتے
 فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انھیں کیا معلوم ہندو کی ضروریات کیا ہیں؟ ان ہ
 سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لو
 کا راج میں پڑھتے ہیں۔ یہ بات کیشپ چندر سین کہتا ہے۔“

”بابو میل بمیل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگھو ترقی کا جو شیوا حامی۔ وہ اور چند رشام کو دروازہ میں حقہ پیتے اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع، ذات دھرم وغیرہ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا۔ ایک دھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں۔“

”کھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔“ چندر نے کہا۔

”زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہندوستان کا نعرہ ہے۔۔۔ ہمیشہ آگے جاؤ۔ بندر بولا۔

”بکواس۔“ چندر نے چار مچھال کر کہا۔ برہمن ہو تم؟ غدار؟ دھوا سے بیاہ؟ لعنت ہو! اگر اس نے بندر کی چپٹ پر محو کر لگائی تو وہ نیچے ہتی گندی نالی میں جاگری۔ بندر نے چندر۔ دبوچ لی۔ دونوں چیخنے چلاتے ایک دوسرے کو زد و کوب کرنے لگے حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے ان کو چھڑایا اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا ”آگے جاؤ۔“

چارلس بارلو میساختہ ہنس پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن ”سر علی بابا“ نے بابو کے متعلق جو فنی کی تھی وہ بھی آج لفظ، لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے مر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سر اٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی لیکن اسے ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں گزریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفہ دیدیا تھا۔

گریڈ ڈیڈ، ڈیڈ۔ ماد دونوں چچا سڈنی اور کرستوفر۔ پھر گریڈ آئنٹ میس۔ آئنٹ ماڈ آئنٹ۔ آئنٹ میسلڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی بر خود غلط وکٹورین ہستیاں۔ پورا بارلو اسڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ وجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور پر پھٹ رہے تھے۔

گریڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ رکھنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھٹکتے کتبے، قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں پر عین قبرستان ہے اپنی جانیں دے کر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ سی بری سے ٹریننگ لے کر اٹلیہ آئے تھے۔ انہوں نے ایڈمنسٹریشن میں ار سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلاویو، ہسپتالنگ کارٹو اس، ولیم بینشنگ، میکالے —

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پڑھو سولینڈ نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ جلتی دھوپ، لوہا، بارشوں، سیلابوں کی پرول کے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے گھوڑوں، پالیکوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کر کے یہ عظیم آراہنی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سننے ان کو مائی باپ کہتے، کمپنی کے اولین دور میں بے رنگ کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد — — اور اگر اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہل ہند کو احساس ہوا ہے کہ اور صوبائی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور کے لئے قائم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن — — اوکسفرڈ میں وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا اشوک، شیر شاہ، اکبر — — ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ بھی قانون کے تقہ نا آشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تصور سے نا آشنا ہے۔

سلطنت روم کی وارث مسیحی یورپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار ہند کو قانون عطا کیا۔

اولڈ کارٹو اس نے تھانوں اور پولس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیولینڈ نے آدی بارہ کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر نیکل اس قدر شفیق تھا کہ عوام نے اس کی بنا کر اس کی پوجا کی۔ نکلسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نیکل سائیں کہتے تھے۔ جون ہٹن ڈنگن میں دختر کشی کے خلاف ہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھاک محنت کے بعد ایک دیا اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ یہ دو تھو سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں رائیگاں جائیں گی — —؟ اس عظیم کارنامے ”برطانوی ہند“ کو ہم لاقانونیت اور جذباتی حوالے کرویں گے؟ کورٹ انڈیا ان ڈیڈ — —!

انٹیا ہے کہاں؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔ انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔!

(کوشش کی کڑی نگرانی ہو گی) اور اب واقعی اُسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں مقیم بیڑی و سنی نے
 ۱۷ نصف صدی قبل بالکل صحیح لکھا تھا کہ یہ ملک لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ ہر لکڑی چاہتی ہے
 ری کو توڑے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی برہم کے ذریعے قائم ہے۔
 گرینڈ ڈیڈ اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹو گرافر نے ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ
 کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ — ایڈورڈ بارلو، برطانوی
 کی اس شاندار روایت کی ایک مثال تھی جنھوں نے اپنی شدید مصروف زندگی کے باوجود اس
 باب میں ہزار ہا محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ
 بے ہیں۔ ان کی یہ "انڈین کلچر" ان ہی بیچارے وکٹورین بدھتوں نے دریافت کر کے دنیا کے سامنے
 رکھی۔ آج ہم ان وکٹورین بدھتوں کو بددماغ، برخور غلط، سمجھتے ہیں۔ اور غالباً وہ ایسے تھے
 یا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا
 توڑا ہی رہا ہو گا۔ برٹش امپائر — پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ عظیم الشان
 سلطنت پہلے کہیں قائم نہ ہوئی تھی! چنانچہ یہ بدھے۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ اور ان کے ساتھی
 غ اور ذرا خبطی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بددماغ اور بر خود
 بن ہو گیا؟ اور مزید ہوتا جائے گا — جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے؛
 امریکہ — ڈائلٹ — ڈائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ تمہاری صحت
 — چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھنٹے بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر

گرینڈ ڈیڈ، پر کا قلم ہاتھ میں لے، سیاہ روشنی ڈورے والی عینک لگائے شمت کی
 سے کیا لکھ رہے ہو — ؟

گرینڈ ڈیڈ نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گنہ میٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہاتھ
 سے لوٹ کر پھونس کے چھپروالے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر، لمب کی روشنی میں تم یہ سب
 تے ہو گے۔ چو کر ا۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہو گا۔ مجھ پر بھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے
 گنہ میٹر کی جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جڑے رہتے ہو گے۔ اور "آسام کے

ناگابائل "گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابری تصویر میں گرینڈا بھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ سیاہ گہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر ہی گریٹ آئنٹ کی تصویر رکھی ہے۔ (بوڑھا وفادار عبدالغفور جو تلم کینٹ ویل سے ترکے میں ملا ہے، کس اعتبار خیال سے وفادار ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریٹ آئنٹ میبل جو گرینڈ ڈیڈ کے تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی چرب آف انگلینڈ کی "زنائہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں کردی جو ڈیڈ بتاتے تھے۔ ایک روز گواندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دروازہ مغربی صوبائے کے ایک دور افتادہ ضلع میں مشن قائم کرنے کے لئے یسوع کا نام لے کر چل پڑ گواندو سے مونگھیر۔ پٹنہ۔ کجس۔ غازی پور۔ بنارس۔ (ہر نام کا اپنا رومان تھا) بنارس خرفناک صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتاپور پہنچیں۔ وہاں مشن کیا ونڈ میں اسکول اور ہسپتال قائم کیا۔ اور بیماری جوانی کے عالم ہی میں وہاں پہنچے کا شکار ہو گئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم ہندوستانی لڑکیاں آئنٹ میبل جیسی بہادری عورتوں کی شکر گزار ہیں جنہوں نے تعلیم کی روشنی تک پہنچائی ہے۔

کوئٹہ انڈیا! بلای فوئز —

اب چارلس بارلو کا سر بھاری سا بھوہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تندر میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دور سے نیا دہ چڑنے لگے ہیں۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔ ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے معتمد نے ۱۹۰۱ء میں بنایا تھا۔ تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور واسکرو ایڈلڈ اور آبری بیرڈز لے کے دور کے فیشن اسلٹو جو جب فرلو پر لندن جاتے تو اپنا سارا وقت فقیر اور ادبیر اور سیلے میں گزارتے "NINETIES" کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور ہنگال اور اڑلیہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فرائض میں جٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹیکوئیل دوستوں سے خط و کتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانوی صحافیوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انہوں نے بھی گر ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے حلق لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے اور کئی دیگر ان گنت اف

بنائیں اور بنگال اٹلیہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند اور ضخیم کتاب
الی۔

ڈیڈ کتاب لکھتے تھے اور ماحضوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوری سیکھی
، ان پھولوں اور پتوں کے انتہائی سبک اور نفیس اسکیچ بناتیں۔
ماکی تصویر۔ صوفے پر بیٹھی ہیں۔ ڈیڈ کچھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ڈیڈ کی کرزن
کی موچھیں ہیں، ماہیرس کے تازہ ترین فیشن کے گاؤں میں ملبوس ہیں۔
یہ لوگ سب مر گئے۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی، اور سبکلا جانتے تھے۔ ڈیڈ بھی
سے واقف تھے۔ ریشاٹر ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انٹیا آفس لائبریری
مرن کریں گے۔ مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندھ بن میں شیر کا مارا بن گئے۔
ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم غور شیر سے پائیں جو بہت سارے کلڑاں
ار کر چکا تھا۔ ڈیڈ بے غوفی سے بندوق سنبھال کر اُسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ کاپا
۷۔

انہوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی کلڑا اسے زندہ رہیں۔
گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے
لمبی عمر پائی۔ نوجوان وکٹوریہ کی تحت نشینی بکینی کی ملازمت۔ غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخری میں خودکشی
سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ ان کو ہنسن لیتے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ ریشاٹر ہونے کے بعد وطن واپس نہیں لوٹے،
دارجلنگ اور کلکتے میں سید خدو بصورت کوٹھیاں بنوائی تھیں اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں مرن کرتے
کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ یہ اور وہ۔ چند برہمنو مصلحین بھی ان کے دوست
گویدہ واقعہ ہے کہ وہ نیٹوز سے برابری کی سطح پر کھیلنے لے، اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار کاٹ کر رکھی۔
نرکی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔

گرینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وکٹوریہ دستور کے مطابق بہت بڑا کنہ تھا۔ مگر صرف یہ سنا
روستان کے طیر یا اور دوسری بیاریوں سے زندہ بچے تھے اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بری

خصلتیں۔ سیکھ میں، چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ بڑے ہو کر کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسر بن کر ہندوستان موئے، یسک کابل کے مارچ میں کھیت رہے۔ پھیلے نے لٹکائیں چائے کی کاشت شروع کی اور وہاں کے معمولی پلانٹر بنے۔ ڈیڈ جوائن دونوں سے زیادہ ذیہ اندین سول سروس کے مقابلے میں آگئے اور اس کے فوراً بعد ہی ماکو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھکی شخصیت، سفید گاؤن، ہاتھ میں بائبل۔

آنٹ جیرلڈین کی تصویر۔ خوش شکل، متبسم، شرارت آکھیں، فیشن ایس گاؤن، گلے میں موتیوں کا گلا میں کتاب ہاتھ میں پنکھا۔

آنٹ میلڈا کی تصویر۔ متبسم بھولی صورت، یہ قیلوں تصویریں ایک ایک ایک شلف پر رکھ دی تھیں۔ تینوں ماڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں ماڈ کیسے کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈ سب بڑی شادی نہیں کی۔ یہ بھی بھوکھی سبیل بارہو کی مانند اہل مشرق کی رو میں جانے میں جٹی رہیں۔ گریٹ آنٹ سب اس سلسلے میں صرف گواندو گھاٹ سے سینا پور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے جینیوں کی روحانی نوجوان کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کونوئل جنگوں کے پرخطر زمانے میں تنہا کیتھی تک کا سفر کیا۔ برہما وہاں سب میں اور باکس لفافہ کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن کپساؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانوی بلجین اور امریکن مشنری خواتین سمیت جینز سس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرلڈین۔ خوب صورت اور ظہرٹ۔ لندن میں ایک بیرو سٹریٹ شادی کر لی۔ آنٹ میلڈا بھی خوب صورت اور پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی افسر (بنگال لائر) ان پر عاشق ہوا۔ مگر سنگی کے بعد ان کو ذغاف کر بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ میلڈا ابھی مذہب کی طرف راعہ ہوئیں۔ گارڈنرز میں نیا مشن کھولا، گریٹ ڈیڈ کو ناگاکا قبائل سے بہت محبت تھی، انہوں نے آنٹ میلڈا کی ہم افزائی کی۔ آنٹ میلڈا اب پورنسی ہو چکی ہیں اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور ماکے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس۔ چارلس اور جیڈ۔ وہ تینوں بھی بچپن میں جمع دیئے گئے۔

ایلس بارہو عجیب بات ہے۔ دو کورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پر کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں اگر سب پر مذہب کا جوش سوار ہو جاتا تھا غالباً یہاں کے عجیب و غریب لیکن

اہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی درمیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے گریٹ آئنٹ میل اور آئنٹ ماڈ اور آئنٹ میٹلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی ضرورت یا تھی؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایس شادی کر سکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر بھی یقیناً اس کی شکل دسکتی تھی۔ وہ کھیلے میں برس سے گارو کی پہاڑیوں میں، آئنٹ میٹلڈا کا قائم کیا ہوا مشن چلا رہی ہے۔ ناکا قابل اس کی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، صائب، پریشانیوں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت — کیوں؟ ایسا یہ لگ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟ بار تو خواتین کا تہہ ہر حال سینٹ پیٹر استقبال کرتے کرتے بولا جائیں گے۔ میبل۔ ماڈ۔ میٹلڈا۔ ایس۔ چارلس بارلو کرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر مطالعہ کر رہا تھا، مگر ایک گروپ فوٹو جو اس کے ساگوان کے ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اس نے نظریں چرائیں۔ وہ تینوں اسے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بیوی ڈائلٹ۔ اس کے بچے مام۔ بریکر۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میل دور جنگ کے مہیب شعلوں میں گھرے انگلستان موجود تھے۔

بوڑھی اور بیمار آئنٹ میٹلڈا ابھی جو ۱۹۴۰ء کی بلٹزر کے زمانے میں اطینان سے اپنے ہنگ پر سویا رہی تھیں (ڈائلٹ نے لکھا تھا)

آبائی مکان کی تصویر۔ ۱۴۔ اینڈریوز کرلیفٹ — (یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے اور تمام نے اپنے بی بی براڈنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آئنٹ میٹلڈا پورچ کی بیڑھیوں پر بتی گود میں لے کھڑی ہیں۔ گیرل۔ ریب ہی کتے سے کھیل رہی ہے (ڈائلٹ تصویر میں نہیں ہے) یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلاٹنگ پیڈ کے کونے ماڈ سی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے، اس دو سال میں لندن پر کیا قیامت گذر گئی۔

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گریڈ ڈیڈ کے واند نے جو سٹی میں سو لستر تھے ۱۸۱۳ء میں خریدا

ما

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لمبا سانس بھر کر "نغماتِ ہند" دوبارہ اٹھالی۔ کتاب کے پہلے ورقوں میں سے جو پرانی جھک آ رہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یورپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ کتنے جذباتی ہیں اور دوسری بات یہ — اس نے ہوتن سے لگ میں بیر انڈی — کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لا جواب، بے مثال، درخشاں۔ ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانیوں سے پوچھو۔

دہات دی ہل۔

اب مابے طرح یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے دائرہ ڈرائینگ روم میں سچے ہیں۔ بنگال کے دو مناظر — سہری پاٹ سے لدی ہوئی کشتی، دودھند لکے میں مسجد کا مینار اور برگد تلے کھڑا کالا عجیب گھاساٹا سامنے الماری میں ہمارے دائرہ ڈرائینگ کا الہم رکھا ہے اور اس کیج بک — دارجلنگ کے چھٹروں میں ملبوس پہاڑی بچے اور کڑھ کا ایک گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے وفادار ٹیٹو ملازموں کے اس کیج۔ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایتیس عمر پندرہ سال، چالی عمر گیارہ سال، ڈک عمر دو سال۔

ڈک — ونگ کمانڈر چرچڈ بارلو — ڈیلنگ۔ بلاش خوب صحت سہری آر۔ اے، ایف مپکھیں۔ یونیفارم پر تنگوں کی قطار، یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ونگ کمانڈر چرچڈ بارلو — سپرائے بنگال سولین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا پوتا۔ جیمز بارلو مرحوم کا چچو بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بیمار طیاروں کی قیادت کرنے کے لئے گیا اور زندہ واپس نہ آیا۔ پچھلے سال اسٹیشن میں شائع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چاہی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پرامن۔ پرسکون۔ چارلس بارلو سربراہ کرملی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے بک شیلف میں پچھلی جنگوں کے متعلق سہری مجلہ کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں — فرسٹ اینگلو فرنچ وار، کرناٹک وار، پلاسی، فتح معلی پٹم، کجس، فرسٹ میسور وار، ریسلر وار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فورٹ میسور وار، سکنڈ اینگلو مرہٹہ وار، اینگلو گورکھا وار، پنڈاری وار، تھرڈ اینگلو مرہٹہ وار، فرسٹ برہمپور وار، فرسٹ افغان وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سکنڈ

اینگلو سکھ وار، سکندرائنگلو بریزوار، سنہقال بغاوت، سپاہی میوٹی، موکر انبالہ، بھوٹان وار، سکندرائنگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو بریزوار، مئی پور بغاوت، سرحدی بغاوت —
یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں، لاکھوں کرسٹوفر اور رچرڈ بارلوان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ —
”عبد الغفور“ چارلس نے دفعۃً گرج کر آواز دی۔

عبد الغفور چند سکندڑ میں نمودار ہوئے۔

”گوسل کا پانی لگاؤ“

”جی صاحب۔“ عبد الغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آباء نے۔ چارلس نے چیرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر پرانے رومنوں کی مانند انہوں نے علم دفن کو بھی مالا مال کر دیا۔
مارس اور متروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ پرانی کتا میں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال میں بوڑھا ہو چکا ہوں کیونکہ میری عمر اڑتیس سال نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر اڑتیس سو بیالیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یا دشت کی عمر کتنے ہزار سال — ہر سوچنے والے یورپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں، ہر ہندوستانی کی عمر کتنی ہے؟ غالباً لامحدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام بارلو۔ جو ہیں ایک پرانے دھند لکے سے جا ملتا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔
یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے — فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک مکھے کس اپنشد میں ہے؟

ڈیڈ بتاتے تھے کہ موتیرو لیمز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انہوں نے جواب میں صرف غٹو جھگوتے اور ادم لکھ دیا —

”صاحب پانی تیار ہے۔“ عبد الغفور نے اطلاع دی اور غائب ہو گئے۔

چارلس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈ کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گریٹر ڈیڈ اور ڈیڈ کا کتب خانہ۔ ان کتابوں کے مصنف — جان کینی کے افسر، اندین سول سروس کے افسر، فوجی، ہنری، ماہرین تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھونس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے۔

یہ کتابیں — زراعت اور جنگلات، آرکیولوجی، رسل و رسائل اور رسول انجینئرنگ، تعلیم، ایٹنولوجی اور سوسولوجی (آہسام کے ناگ قبائل از ایڈورڈ بارو آئی، سی، ایس) چارلس نے فخر سے سوجایا۔ نام۔ مستقبل کے گرد اود کو نوں کھدروں میں بہر حال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام، قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفر نامے، جغرافیہ۔

کلکتے کا جیمز برنسپ جس نے خروشی میں یونانی نام دیافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی کسٹم۔ جان مارشل، جیمز فرگسن، ہویل، گرانٹ ڈن، کرنل ٹاڈ، ولسنٹ اسمتھ، مورلینڈ، جیمز مل، ولیم ہیشنگز، ولیم جویز، گریم سلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گرنفٹھ، جارج سیل — آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب۔

اور دہلیچسپ ناول جواب مضحکہ خیز لگتے ہیں، اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذر آتش کریں۔ جن کے ہندوستانی کردار "نیٹو اورنگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ "جنگی" (گڈ اولڈ، مینی) میرن کرافٹ، ماڈل ایمر، کرنل میڈوز ٹائیسلر کے ناول — "ایک ٹھگ کے اعترافات" — "سیتا" — "تارا" — "پشوپ سلطان" — "فلور ایسی اسٹیل" — "این ڈبلیو مین" — ہرکیشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے۔

ادریچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں۔ "میل آر تھر اور اس کا بیرہ" — "میل آر تھر کی ہسٹری" — "میل آر تھر"۔

عذر کے متعلق کتابوں کے انبار، اور پھر کپلنگ —

لاہور اور پشاور کی پراسرار گلیاں، چندو جانے، گنگا داس اور سدھو، اور ولی داد اور لال تلوا۔

ہو کر ملاسن طوائف غالباً کپلنگ کا علاقہ کی طرف تھی۔۔۔ مغرب کے لئے علامتی کردار۔۔۔ ایک خطرناک
 رشتہ بے ایمان مومت۔۔۔ ہندوستان۔۔۔ جو انگریز اس جادو گرنی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت
 لدا پنا کردار کو بٹھا۔ پھینچ کر ہو گیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلگ رہو۔ اس تاریک اور بھیانک جنگ میں ایمپائر
 کے اسٹینڈرڈ کو قائم رکھو۔ (اسی وجہ سے گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈ ڈیڈ اور مائٹریہ اور آسام کے ویران ڈاک
 بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سولے میں ڈنر کھانے جا رہے ہوں)
 چارلس بارلو اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈی۔ ایمز باؤس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب
 میریں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو دو سو سال سے اس ملک میں
 باد ہے۔۔۔ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزویات، کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل، اضلاع، صوبے،
 صوبے کا سولین خود کو اس صوبے سے ماٹل کرتا تھا۔ پنجاب سولین، سندھ سولین، بنگال سولین، سندھ
 لب، بنگال کلب۔

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین معاشرہ۔ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انشاپکوشیل نے سچ کہا ہے کہ
 انگریز ہندوستان کو کٹری اسکوائر یا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز حاکموں کی
 اتنی زمینداریاں تھیں جس میں ہم پلہ لوگ یا انسان دوسرے یورپین تھے۔ اہل بھٹانیہ ہندوستان میں ملنے
 نے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین"۔ "انڈین سولین"۔ "یا" انڈین باکس والا"۔ یا "انڈین آفیسر" کہتے تھے
 ہندوستانی محض میوٹھا۔ اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی بہترب سیاق و سباق میں کیا جائے۔
 "پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا۔۔۔ بالکل جس طرح ڈیوک اپنی بیستوں سے
 نل کئے جاتے ہیں اور جس طرح انگلستان کا کٹری اسکوائر اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا۔ اسی شفقت اور
 الہ سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش کئے۔ زیادہ دلسوزی اور محبت سے، کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح
 ق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسل بعد نسل ان سب سولینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم
 لاقی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے۔۔۔ برطانوی ہند کی حکومت! (غدر کے متعلق ہر رٹ میوٹہ

، انیسویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمین کرنے والے انگریزوں کو اینگلو انڈین
 جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہاف کاسٹ" یا یوڈیشین کہلاتا تھا۔

نے کہا تھا کہ یہ خدا نے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں۔
کوٹ انڈیا —

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مٹھی بھر انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کر رہے ہیں۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں پھردانیوں کے اندر سلاتے ہوئے ایک سخت یہ دہشت آدو جتی تھی کہ اندھیرے میں سے خود ارمو کر ٹوم ٹوم جاتے بیٹو حملہ کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے، اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے بادشاہوں کے زیر حکومت خوش تھے، اصول پرست کشنوں کے زیر نگیں خوش نہیں۔

کوٹ انڈیا —

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید سامیریلزم بذاتِ خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی بابرکت امپیریلزم۔، فرانس، الینڈا اور مجسم کی کوٹونیوں کی کیا ناگفتہ بہ حالت ہے، ناقابل یقین۔
بہر حال "الف حیم" والا زمانہ قدمیں ہوئیں، پچھلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز لورڈ مین چرچ اور اسمبلی روز تھے، پولیشن طبقہ اپنی اچھوت حیثیت پہناتا تھا اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی روز "کلب" میں تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بیئرڈ، شو قہ ڈرامے، مگرینڈ ڈیڈ کا ہندوستان، ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں، پاکلیاں، (پاکلی بردار PALANQUIN BEARER) یہ بن گیا، کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو میٹنگ جتا تھا۔ پارسیوں کی دوکانیں۔

اسیشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ میس دن بھر ایک دوسرے کو چسپ بھیج کر تیں۔ بھٹننس، پو پو، شکار، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اتنا دلچسپ ہو چکا تھا کہ ہوم سے اکثر لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے، گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گرسینڈ ڈیڈ دورے پر جاتے۔ جب گرسینڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی فاسر سے پر نکلتے تو عہد رفتہ کے مغل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا۔ (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اس سے حکومت جین کر تریک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ دائرے کی شان و شوکت!) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور دوسرے صوبوں میں سیل گاڑیوں اور اونٹوں پر لڑکر سارا ساز و سامان میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنچیز، تصویریں، چاندی کے ظروف، ہر چیز تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبّہ۔ جب جنگل اور دیہات میں بھی قائم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے بے شمار نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے خیمے قالین تصویروں اور گلداروں سے سجائے جاتے۔ خورد و نوش کی باتیں کے ڈبوں میں بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افرادوں کے خیمے لگتے اور مالے آکر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سال نو پڑھتی کنشکر لا دبار لگتا۔ دبار میں زمیندار اندریں ہرش کرتے، جن کو صاحب مانتھ لگا کر واپس آ۔ بڑے صاحب کے دبار میں کرسی ملنا نیٹو جنٹلمین کے لئے بید عزت کی بات تھی۔

کلکتہ اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی۔ جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی لیکن نو آبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریس بے لگ۱۹۱۷ء کی جنگ کی صورت میں روٹنا ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک تفصیل اینگلو انڈیائی نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی تھی، مگر خود اس تفصیل کے مطابق عیسائی شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے سے متوجہ کرنا تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے بکروہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمائی کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن و امان، ترقی و خوش حالی کا درد وہ تھا۔ اور ایک عام ہندو ملک ٹوریہ "کو دیوی ماما بھنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا:۔

(BE KIND TO MY POOR INDIA)

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پر جا کو درشن دیتا تھا۔ اور پر جا اس سے فریادی پہنچتی تھی۔ بہت سے انگریز ہندوستانی امرا پر اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے مصوہتیں اٹھا کر، اپنے معذموں کی اپیل کے

لے لندن جلتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامراد لوگ تھے یا غریب الوطنی کے عالم میں مر جاتے، جہاں کے حکم کی اطاعت اور صاحبانِ اقتدار کا خوف اس ملک کے عوام کی سرشت میں داخل ہے۔ لہذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گزار رعایا بن گئے اور ملک کو اپنی ماں سمجھنے لگے،

غدر کے بعد انڈین سول سروس قائم ہوئی اور ”کمپنیشن والا“ اینگلینڈ میں منتظر رہا۔ خود پسند، پہلی بری کے بجائے اوس برج کا تعلیم یافتہ، جو ”باکس والا“ یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سولین خاص امپریلسٹ تھا۔ غدر سے پہلے کی یاد: روادار برطانوی روایات اور ہندوستان کی اس دلکش نیٹو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ ڈیڈیہ نئے سولین تھے اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی کی نئی اور شدید کٹر کاسٹ سسٹم کے ایک فرد۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکھ، مغرور، خرد مارغ، لیکن جو حق لکڑا رہی کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لٹھ اچل بن گئے۔ انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد —

چارلس بارلور دیکھے سے ہٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کمشنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے، دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سرسبز کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حبیب اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم ب، ہماری ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور کمینگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جاکر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان، جو ہم نیشن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش، سب برابر، کٹب مایوم ہائے۔ کپڑے دار یوٹور۔ شاندار بوٹ اچھا۔ جڑا کھانا۔ بڑا تماشا۔ ایڈمڈ لیر کی نظیں —

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ مورے نے صبح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں۔ مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز میل جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارے نرہمی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت برا معلوم ہوا۔

اوسفرڈ میں مسعود علی اور رانا ناتھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ صبح سے تازہ اخبار آئے رکھیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈرک رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ باپ جلایا، اب غسل کے لئے جانا چاہئے۔ مسعود آج کل بناب میں کلکٹر ہے۔ رانا ناتھن مراٹھا کنگری میں کہیں تعینات ہے۔ دونوں اپنی میں میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی۔ سی۔ ایمر لے لئے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں۔ اپنے وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمین پر وندم نہیں دھرتے۔

آہ — ہندوستانی کردار —! ہندوستانی کردار! مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار دیکھتے سلام کرتے، مائی، غریب پرور لگتے، کسان اور جاہل اور قابل رحم ہندوستانی اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے دو تین سو سال میں اسے چین، کب اہل مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکے کے بعد ہم انھیں اپنے جیسا نہ سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔

جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر پڑھ چکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جہد" کی اپیل نچلے متوسط طبقے، اور بیکار نوجوانوں میں پہنچ چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹی قائم کیں؟ چارلس نے باپ سلگایا اور پھر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور ان قوم پرست اور یہ اور وہ۔ اس جو اناکھی پر قابو پا کر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا ایڈمنسٹریشن نے جانا سول سروس کا صوبے بڑا کارنامہ ہے۔

اوسفرڈ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جو اسٹریٹ تھا۔ یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گریٹ ٹیڈ اور گرینڈ ٹیڈ، ڈیڈ اور ماما، میں اور آسٹ ماڈ کا بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اسے نباہ ہونے دوں گا، وہ باریسال

اور پھر پچھلی صدی کے بہت سخرے۔ ان کے مارٹونیم اور پیانو۔ ان کی خواتین کی گاؤں نما ساریاں۔
ان کے جوتے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفراء ان عورتوں نے پردہ ترک کر کے زنانہ اور
ہم کے رومان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بے چارہ الف جیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ
، اسی طرح آپس کے کشت و خون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو ان نشان وغیرہ
تہ ہے۔ ٹیگور نے شہلی اور کیٹس نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا

بے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید
تہ ہے۔

رد و سری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی بیا کار ہیں۔ شانتی شانتی رہتے ہیں مگر تشدد
لا گھتی میں چڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے
سے پہلے شیووں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں میں جنگیں بھجائیں، جس عہد کا جو
ہوا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیر پڑ پڑے۔

”عبد الغفور —“

ایک منٹ میں عبد الغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

صاحب۔

کچھ نہیں جاؤ۔

عبد الغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور — ساری مسلم پیر پڑ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان
فخریہ غازی کہتے تھے اور بت شکن، کافروں کو مارو۔ مندر گزار کر مسجدیں بنادیں۔

مطافی دور کو لیجئے — سیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں
ٹکے سوامی دیویکاشنکر کے ساتھی اور چیلے چاہتے جو بنگال کے اولین دہشت پسندوں میں
الغلامیوں کو اپنے مٹھوں میں پناہ دیتے، خود انڈر گراؤ ٹڈ میں کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے

سینا سیوں کی معنوی اولاد — تاریخ کس طرح اس ہلاکت خیز ملک میں متواتر اپنے آپ کو دہرائی اور جو ہندوستانی ہم نہیں پھینکتے انہیں تقریریں کرنے کا مرض ہے۔ ساری قوم اس عا میں مبتلا ہے کمپنگ کو حصہ ۸ء میں پانیر نے الہ آباد سے غلاظت اور لعن اور بھیانک راتوں شہر کلکتے بھیجا۔ وہاں بابہ لوگ جنہیں ہم نے لوکل سیلف گورنمنٹ سونپ دی تھی۔ اپنے شہ صفائی کے بجائے تقریریں کر رہے تھے۔ میونسپل بورڈ اور بنگال لمپلیٹو کونسل کے میٹرومبر سر دھار تقریریں کر رہے تھے۔ نظریات کے بجائے ان حضرات کو کدال اور بچاؤ ڈرے منجھال کمپنگ نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ یہ بات آج تک صبح ہے۔

تقریریں کرتے ہی اور سید زمین ہیں، اس لئے دماغ قانونی موٹسکافیوں میں بھی خوب چلنا کا کوری دیتی۔ صرف دس نوجوانوں نے چلی ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کمال ہے۔ اس ملزمین کے دفاع میں موہنی لال نہرو کی جرح میں نے خود سنی تھی۔ پٹنہ اور الہ آباد کے یہ سارے ملہ قانون دان جو لندن سے قانون پڑھ کر آتے تھے اور اوس برج کے تعلیم یافتہ لیٹروں کے مقد رہے تھے۔ یہ ہماری بابرکت امپیریلزم کا نتیجہ ہوا۔

الغلامیوں کے گیت ————— ”بے گاہند پیچھے کو بے گاہندان آگے۔“
کے طوفانی گانے، ڈرامے، عوامی ناٹک، گریٹڈ ڈیڈ اور ایڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں آواز سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری ونگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف چھٹانک چاول اور ڈو چھٹانک چٹان کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگیز اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔

اشلوک رتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے۔
سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گراکش لگا کر سر پیچھے لکایا کہ آئرش با۔
بھی تو ہمارا ناٹک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گو۔
ستمبر ۱۹۳۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقاب
بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں ہمیں باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گریٹڈ

درخش ہوں گے کہ میں نے اپنی بساط بھر اس قومی کرائس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کئے۔ میں نے اپنے اصناف میں کیونٹون کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ پل کینٹ ویل ایک لیڈر ریجان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اس کی سزائیں اسے دور دراز رنگامانی تبدیل کر دیا گیا۔ کامیڈر ریجان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ بھی ان لوگوں کو مجرموں کی طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔

خدا کرے ایلس خیریت سے ہو۔ گارڈ ہلز میں ہمیشہ سے مشنریوں کا اثر ہے۔ مگر کمیونسٹ وہاں پکڑ چکے ہیں۔ اور وہاں کے جنگی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ سکتے۔

بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قائم کر لی۔ یو۔ پی کی سرطوں پر لڑ کے ”ہمارا بادشاہ کون۔۔۔“ م آزاد!“ کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سبھا ش چند نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر اکر دم

جیز کر اسٹ!

چارلس بارلو نے زور سے انگریزی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کر لی بلیپ کی طرح، ایک کردار، آپ میں تبدیل ہو جاؤں گا؟

اوسفر ڈین ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلے ہوئے جب معمول انڈر نا بکٹ ہو رہی ہے۔ میں ٹوری نو جوان ہوں، فریڈ کارٹر بالشویک ہے۔ مسعود علی اور

ہندوستانی قوم پرست۔

”ہماری قدیم تہذیب۔۔۔ رانا تھن گرج رہا ہے۔

”سر۔۔۔ آپ کی قدیم تہذیب؛ وہ بھی حکمران طبقے اور پروہتوں تک محدود تھی۔ اور شوک پور یا شاہجہاں کے عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹھی بھر طبقہ تک ہی

”میں جواب دیتا ہوں۔

”یادپ میں تسلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اہل ایمان نہ رہ گئے۔“

مسعود علی کہتا ہے۔

”خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں تھے کہ جب گرینڈ ڈیڈ اڑیسہ پہلی بار گئے اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ سو۔ سارے صوبے میں ایک چھپی ہوئی کاغذی کتاب موجود نہ تھی۔ پروہت لوگ تار کے پتوں لکھ دیکھ لیا کرتے تھے۔“

”یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی“ باضو یک فریڈ جواب دیتا ہے۔

”بکواس۔“ میں بات جاری رکھتا ہوں۔ ”اور سنو۔ جب کلکتہ میں ہم نے کتابیں چننا کیں تو ایشیائیوں پر لڑے ہوئے ہندو طلبہ چلا چلا کر ان کتابوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ مکالمے نے کہا یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شلیف ہند اور عربستان کے سارے ٹیولٹریجر پر حاوی ہے۔“ میری سنی ان سنی کر کے رانا ناٹھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے۔ ”انیسویں صدی کے پہا میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس قحط پڑے، جن میں کروڑ انسان مرے۔ پھر سیاہ فام رانا ناٹھن بڑی شیرینی سے مسکرا کر کھجے سے پوچھتا ہے۔ ”ہا ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا۔“

”کبھی نائنہ اور ٹکسلا کا نام سنا ہے؟“ اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں۔

جیت لی۔

ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھے ہیں۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے۔

اب رانا ناٹھن کہہ رہا ہے۔ ”اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم سے رہ جاتا۔ شیو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مداح تھے۔“ ”گاڈ آل ماسٹی۔ شیو صاحب تو سخت اینٹی ہندو تھا۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو سوس ہوئی، تم چالاک لوگوں نے اسے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنالیا۔ دونوں اینٹی ہندو حاف کرنا مسعود۔ اولڈ چیپ۔“

”ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے۔“ رانا ناٹھن غزالتا ہے۔ ”ہم نے تمہیں انگریز کے ذریعے متحد کیا۔“ میں جواب دیتا ہوں۔ ”تم اور مسعود ایک دوسرے سے انگریزی میں بات

— ؟ کنار پر کھڑی ایک حسین لڑکی ہاتھ دلاتی ہے۔ ڈائلٹ ! ہم کشتی کھینچتے، بہتے بولتے کشتی
خ اس کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ ڈائلٹ جو میری بیوی ہے

خدا کرے ڈائلٹ خیریت سے ہو۔

وہ اب آہستہ سے اٹھ کر میز تک گیا اور تصویر دیکھنے لگا۔ ڈارلنگ۔ تم اس وقت
ناریک لندن کے کس پب میں کس فوجی کے ساتھ بیٹھی ہو گی۔ سیر کا باگ تمہارے ہاتھ میں بھی
کا۔ مگر کس کی معیت میں ؟

یہ حسین عورت مجھ سے تین بار بے وفائی کر چکی ہے۔ آؤٹی میں، فلورنس میں، ہیٹ
مڈ میں۔ ڈائٹ مائی ٹو۔ تم یہ بھی جانتی ہو میں نے تم سے کتنی بار بیوفائی کی۔
مادرن میرج۔

اور یہ جنگ کا زمانہ ہے، اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ اس محفوظ دامن ہماری
رگی میں اچانک کیسا زلزلہ آگیا۔ جنگ، بغاوت، تباہی۔

ٹائم۔ ٹائم نو سال کا ہو گیا۔ میرا پیارا بچا۔ کیا میں تم سب کو زندہ دیکھ سکوں گا ؟
امریکی بہت دکھش ہوتے ہیں۔ برطانوی عورتوں کے لئے۔ ڈائلٹ تم ہمیشہ سے فلرٹ رہی ہو
س یور لیشل ہارٹ، WAC کے یونیفارم میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میری بیوی۔ آئن
برٹن کی طرح دلغریب۔

اس وقت کیا کر رہی ہو، ڈارلنگ ؟ سینٹ جانز روڈ کی کوئی میوز ؟ کوئی کنٹری ان۔
ہمارے اپنے گھر کا۔ ۱۲ اینڈریوز کر سینٹ کا بیڈروم۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی تم پر عاشق ہوں، جان میں۔ اور تم بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو۔
اس نے میرا گم زور سے میز پر پٹخ دیا۔ باہر بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔
بنگال کی برسات، طیرا، پھٹھر، کچھو، تعفن، طوفان، سانپ، مینڈک۔ اس برسات کے
ٹینگور اور سانپ بنگالی شاعری کرتے کرتے مرے جاتے ہیں۔

اس وقت میں سجدہ میں اٹھیں ہو رہے ہوں۔

وائلیٹ۔

لاچار غصے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشت ہے یہ آج
تک معلوم نہ تھا۔

کجنت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مرجھا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغ
نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔

ما۔ آنت میٹی

اُس نے آنت میٹلڈا کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔

آنت میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں ریشم ہے۔ ٹھیک ہے۔
قلم نہیں پکڑ سکتیں۔ آنت میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوب صورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔

وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنت میٹی کو کسی ہوم میں ڈال دیا
تاکہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندو عستانی ہوں۔ میں سخت دل انگیز و
کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتہ داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں
کر سکتا۔

اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چڑھا چکا تھا۔

خداوند! اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، ٹام اور کیرل کو، آنت میٹی کو، ایلس کو، ان
سب کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

اولڈ پیپلز ہوم۔

کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی ٹام اور اس کی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال دیں
گے۔ بچا ہڈھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (نرس ایلس میں
کہیں گی)

تم آنت میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری بہو تمہیں ہوم میں پھینک
دے گی۔

اسی برسات میں، میں نے وائلیٹ کے ساتھ اپنی لاپٹ پر پدما کے کیسے روانہ سفر کئے ہیں! اسٹیم
ہم ہنی مون کے لئے سمندر بن گئے تھے۔ اسٹیمر کا کیا نام تھا؟ کنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ یادگ شائر کی تازہ دار دلڑی شروع شروع میں
حاجرت سے یہاں کی ہرجیز کو دیکھتی تھی۔

ساتھ ہماری شادی کا پہلا سال، بار لیسال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دیکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کھڑے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ

اے اوسفر ڈیس میرا ہم جماعت ہوتا۔ کشتی کھیتے ہوئے مجھے بحثیں کرتا۔ مگر وہ کال کو ٹھہری میں جانے سے

بل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جید انٹلیجنٹ ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اس کی اپیل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد۔ کتنا۔ سید دکھ ہوا تھا۔

بول؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا۔

مجھے اس کی اپیل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اُسے پھانسی ہوئی، اسی روز مجھے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔

متوجہ آیا، وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ سیم صاحب۔ ہم ہندو لوگ آد اگون میں

لیو کرتا ہے۔ شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد

یہاں ہوتا تو بیت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدل لینے کے لئے آپ کے گھر میں جنم لیا ہے۔

واٹ اے ہو ربل حقوٹ۔ بے چاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اس عجیب و غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا

مانس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا۔ کرائسٹ اس دیوانے

جی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو

اور ایک اور عجیبانک خیال :-

جف گگ کی بتائی ہوئی خبر تازہ ترین خبر ہے وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ اکنے

بچن افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۳۔ اینڈریوز کرسینٹ میں ایک امریکن کرنل BILLET کو دیا گیا ہے۔ اس میں دیکھ

ایک قصہ ؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جو سیل ہے۔ بہت خوب صورت طرہ دار جوان ہے۔ میں طرہ دار کم ہوں۔ مگر مجھ سے اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، میں ہرگز تمہارا مستحق نہیں تھا۔ مگر تم نے بھی تو میرے عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ ۳۹ء اس پر اس دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرانے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آگئی ہوتی۔

اب میں پھر الف جیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان کو اتنی مہلت ملے کہ وہ ایک سنوٹی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے، اپنے اندر جھانکے۔ اب اُسے نیند سی آرہی تھی۔ مابقی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کاغذ سے لغات ہندا اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹا پلٹ کر نیم والا نگھیں، ذرا سی کھول کر اونگتے اونگتے کتاب کے آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک تفتیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"نیل کی کاشت — ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع۔"

"پرانے کلکتے کی آواز بازگشت" از ڈاکٹر بسنڈ۔ سرورق پریک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین :- فلپ فرانسس کا دور، ن کو مار، فرانس اور سیٹنگز کا ڈومین،

دغیر وغیرہ۔

"انگلش ایٹیکٹ فار انڈین جنٹلمین۔ سوشل اینڈ انیشل" از ڈیوڈ ٹریگوویب۔

بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں" ایک پرانے پلانٹر کے قلم سے۔

”جسٹس اونوکول چندر مکرجی آنجہانی۔“ از۔ ایم مکرجی۔ انڈین انگلشہ یا بابو انگلشہ کا درمزدار نمونہ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس جنتیں کی سوانح حیات جو ان کے بھتیجے نے لکھی ہے، ضرور پڑھ کر تفریح حاصل کریں۔

”آسام میں ایک نئی پلانٹری زندگی“ از جارج بارکر۔

”انڈین ریسنگ کی چند یادیں۔“

”گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس“

”سیونی“ ست پڑہ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

”بنگلے کے چھپے۔“ از ”ایپا“ مزاحیہ کتاب۔

الباب: بولے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائے، مشعلچی، حمال، ہری درزی، بٹلر۔

عبدالغفور۔۔۔ ابھی بنگلے کے چھپے میرا بٹلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، چارکس باولونے ادھکنا شروع کر دیا اور پھر کسی کے ہتھ پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی پوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیکتے حواس باختہ ریورنڈ بنرجی دُور بھاٹک میں دھل ہو رہے تھے، اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور ڈی ایمزدوس کے برآمدے کے ایک درمیں کھڑے عبدالغفور سید چپراسی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

”صاحب چھوٹا حاضری کے بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ میریہ ہیر پے چلا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔“

چپراسی نے متانت سے سنا لیا، اتنے میں اس کی نظریادری صاحب پر پڑی جو برساتی میں بیچ چکے تھے۔

پادری بنرجی نے میسر صیایاں چڑھ کر جلدی جلدی پائیدلان پر جوتے گڑے، اور برآمد

ہیں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرس پر گریں۔ شفاف فرش خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اور دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے پک کر چھتری ان کے ماتھے سے لی، ہیٹ، میک کے کونے میں لٹکا دی اور سلام کیا۔

”صاحب کہاں ہے؟“ پادری ہنرجی نے ہیٹ زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

”صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب۔“

”صاحب کو بلو، مہربانی ہوگی، ایک دم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی۔“

عبدالغفور نے سر ہٹایا اور اندر گئے، لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور کواٹر آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جا کر ذرا سا کھنکھارے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

”صاحب۔ کالا پادری آیا ہے۔“

”کون؟“ چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملے ہوئے پوچھا۔

”کالا پادری۔ ہنرجی بالو۔“

”اوہ۔ کیا کام ہے؟“

”صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھا دوں؟ بے چارہ

بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے۔۔۔“

چارلس نے سراوچا کیا۔ ”ایس۔؟ کیا۔؟ نہیں، ادھر ہی بھجرو۔“

”ادھر صاحب؟“ لائبریری صاحب، کابینہ ذاتی کھوٹھا۔

”یس، یس، ٹو ایڈیٹ۔“ چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہو گئے۔

چارلس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کریں باب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا باپ ہوں، مانی باپ، غریب یرور۔

جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے سکنی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

”وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
”گڈ آفٹرنون مسٹر بارلو۔“

”ہلو۔ پادری۔ گڈ آفٹرنون۔ گڈ ہیونز۔ کیا دوپہر ہو گئی؟“

پادری بنرجی نجابت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً اساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیٹ زدہ نظر آرہے تھے۔

”کیا بات ہے پادری آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈو یو ول ڈرنک، ادہ یو ڈونٹ ڈرنک، ڈو ہیٹ ڈاؤن پادری۔“

”نو، یس، مسٹر بارلو۔ پادری بنرجی ہکلائے اور ایک کرسی پر ٹپک گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارلس نے مگ میں بیرانڈیلی، مگ اٹھا کر کہا ”ٹو وکٹری۔“

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارلس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، ہتھوڑے سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ہا ہا) سیاہ سوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پالی میتھو۔ بنرجی بھی مضحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مضحکہ خیز تھے۔ ریجان الدین احمد مضحکہ خیز ہے۔ میں مضحکہ خیز ہوں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت ساری زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

”مسٹر بارلو۔“

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ نیٹو پادری، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا

ہے۔ ہا ہا۔

”مسٹر بارلو۔“

”اوہ جسٹ ون منٹ پادرے“ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا،
بھاری بھاری، اونچا اونچا، جھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا اور دم سے صوفے پر بیٹھ
گیا۔ ریڈیو کی سیٹنگ لگائی۔

”دس ازنی، بی سی لندن۔“ ایک دم آواز گونجی۔

پادری ہنری چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈکنی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹے بموں جلتے
ہوئے یورپ کے اس پار، جلتی ہوئی آکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ناڈلسرٹائٹ اپر
اپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتح مند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں
کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر نسلین چرچل کے تانہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں
گوڈ سیو دی کرگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً ٹینشن کھڑا ہو گیا۔ پادری ہنری بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں چھنگلی ہلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا
اب جا کر پادری ہنری نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار حیب سے نکالا۔ اخبار بھی بارش میں بھیک
حکا تھا۔ انھوں نے اُسے ذرا احتیاط سے سٹارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک غیر پر سرخ نشان لگا تھا۔
چارلس بارلو نے جھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دکھایا۔ ہونٹ کاٹے۔
”مجھے بڑا شرس ہے، پادرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑائی بھی۔“

”میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو۔“

”آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟“

”میری بچی۔۔۔ میری بچی۔۔۔ گراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اُسے بچا لیجئے۔“ پادری نے اس

کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس
آکر اپنے فرض منصبی پرستار ہو چکا تھا۔ ”آپ کی لڑائی باخ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ
گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس روحان پرستی سے اس کا جی بھر جائے گا یا ممکن ہے وہ

ماری عمر اسی میں لگی رہے۔ آئیڈیلزم، خدمتِ قوم، اور خدمتِ خدا کا جنوں انسان کو عجیب و
ریب طریقوں سے اپنی زندگی تجنّے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری مہین — اب اس نے
تھک پھیلانے۔ "میری مہین لکس پچیس سال سے ناگاہکوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے اور غالباً
ہمت سرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوش رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔"
"سٹر بار لو —"

"پادرے —" چارلس نے دفعۃً سید چڑھ کر کہا۔ "اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ روزی کے ہتھ
رے کسی کی جان لی ہے تو اسے عمر قید ہوگی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"
پادری بنرجی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔
ایستہ اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنرجی ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور۔
"سٹر بار لو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مس بار لو آج کل کسی کام سے تینہ میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو
نکال کر دیں، کہ — کہ وہ جیل کے ہسپتال میں روزی کو جا کر دیکھ لیں۔ اور — اور — میں نے یہ
طبعی ان کو — انہوں نے جیب سے ایک خط نکال کر چارلس کو بھجوا دیا، اور ملتی اور پرامید نگاہوں سے اسے
دیکھنے لگے۔

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیر سسٹر ان کرٹ۔"

اس مصیبت کے وقت میں —

چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"ہیس۔" بار لو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سرخ دردی والے چپراسی کے
تھیں چاندی کی پلیٹ تھی جس میں ایک پیلا الفا درکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چپراسیوں اور سائیسوں کی در دیاں، پگڑیاں اور ٹوپیوں بھلائی
حکومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امرا و شرفاء کی ملبوسات کے نمونے کی کئی کئی تھیں۔ گویا
تہ ہوں، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

چپراسی نے پلیٹ چارلس بار لو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرام کھولا۔ اسے بڑھا۔ اس کا رنگ سفید

پڑ گیا۔ ہونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل سانس بٹھا رہا۔ پھر کندھے سیدھے کرنے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا، ابرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھوکھلی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ ”اک کیوز می پادری میں ابھی آتا ہوں۔“ اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بنزجی حیران پریشان بیٹھ رہے۔ مس ایس بارلو کے نام خط تالین پر گر پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے میٹھ گئے۔
ہند رہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب پادری بنزجی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہوکا عالم طاری تھا۔ وہ سیرھیاں اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک ساسے ملازم ایک عجوبہ کی صورت میں جمع آپس میں کھٹکھٹ کر رہے تھے، عبدالغفور ان کی طرف آئے۔
”کیا بات ہے عبدل۔؟“

”صاحب!“ عبدالغفور نے دھیرے سے کہا اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آگئے۔ خوب صورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹلاتے جا رہی تھی۔ پادری نے کیچنی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

”صاحب۔“ عبدالغفور نے کہا۔ ”میم صاحب گزر گئیں۔“
”گوڈ میورنی۔ کیسے عبدل؟“

”صاحب سید دم میں بت بنا بیٹھلے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آہستہ سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گند گیا۔ ولایت سے تارا آیا ہے۔ جرمین والا بگم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں۔ کیا بولتے ہیں۔“

”وی ٹوراکٹ“

”جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جلنے کے راکھ ہو گیا۔

صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی —“

”مگر اُدھر تو عبدل ایر ریڈ کا بھونچو بچتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے۔“

”معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ سے باہر اسکول کے پور ڈنگ

ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور میٹھی مس صاحب بھی بچ گئی۔ اس کو مسیم صاحب نے پڑھا لوگ

یوم میں ڈال دیا تھا۔“

”شکر ہے۔“

”صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔“

”اچھا۔ تھینک یو عبدل۔“

عبد الغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آکر لا بُریری کے سامنے والے برآمدے میں

سلنے لگے۔

بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی کی طرف بڑھے۔

”مسٹر بارلو۔“

”پلوے بدھ کی رات کو مسٹر بارلو کا ایر ریڈ میں انتقال ہو گیا۔“

”اس کی معنی پوری ہو۔“

”آئیے بیٹھے۔“ اُس نے پھولدار گدیوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود

دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

جدنت تک خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چہچہا۔ ہی تھیں۔ فطرت اسی بے نیازی سے

ندہ رہتی ہے۔

”غم نہ کیجئے مسٹر بارلو۔ مسٹر بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں۔“

”بہتر جگہ —؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس دُفوق سے کس طرح کہتے ہیں؟“ چارلس نے ہنچلا

رکھا۔ ”بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی آپ لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔“

پادری بنرجی خاموش رہے

چارلس بارلو تلمی سے ہنسا۔ "THE LORD HIS INFINITE MERCY"

پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا "خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے"

"ہا ہا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیرکانوار بنا دیا۔ یہ

اور معصوم بھوپتی کو جینیوں سے RAPE کروا کے قتل کر دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جڑ

اندھیرے آسمانوں پر برفچے اڑا دیے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں

طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی جنگل میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ

کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ اویا د رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا نفعی بچو

اپنا بچا اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ سوری پادری سے

پادری بنرجی ذاتی کراسٹس کے مواقع پر اسرار ربانی لا اعم فانی انسانوں کے منہ سے

کے کلمات کفر سننے کے عادی تھے۔ انہوں نے جیب سے بائبل نکالی اور تیسواں مکن پڑھنا شروع کیا

تیسواں مکن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریہ ہے، مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے ہری

چراگا ہوں میں آرام کرواتا ہے، وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے

کنارے لے جاتا ہے۔

پادری بنرجی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گویا موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں

لیکن ان کے ساتھ ساتھ مکن کی تلاوت کرنے کے بجائے چارلس تیموری پر بن ڈالے سرسلائے

رہا تھا اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری بنرجی نے مکن ختم کر کے بائبل کے ورق گردانی شروع کی

کوئی اور سکون بخش حصہ پڑھ کر سنائیں مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں بڑی پریشان

سطروں پر ہی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مصیبتوں پر جو آنے والی ہیں روؤ اور دادیلا کرو،

تمہارا مال بگڑ گیا، تمہاری پوشاکیں کوکھڑا کھا گیا، دیکھو! جن مزدوروں نے

تمہارے کھیت کاٹے ان کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کر کے ضبط کر لی تھی چلائی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد رب الانواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری بنرجی نے گردن آگے بڑھا کر ورق پڑھے۔ یوحنا کا مکاشفہ —
خدا کا بیٹا جس کی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں
خالص پتیل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت اور ایمان
اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی —

اور آگے —

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کبیل کی مانند کالا اور سارا چاند حور نس
ہو گیا اور ستارے انجیر کے درختوں کے کچے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح مہر کی جبرط سے
ملکوت پڑنے سے مرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور —

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا جس میں آگ ملی ہوئی تھی —
شہر بابل گر پڑا۔ زمیں کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے
روحیں گے اور دنیا کے سوداگر اس کے لئے ماتم کریں گے۔ اور سب ناخدا اور مسافر اور تاج دوکر
اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر جس کی دولت سے سمندر کے جہانزوانے دہمتہ ہوئے۔
پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے
وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور —

پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کہ آسمان میں اڑنے والے
سب پرندوں سے کہا کہ خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت
اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت کھاؤ —

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی

اور روح اور دہن ہیں آ، اور سینے والا بھی کہے آ اور جو بیاسا ہو وہ آئے ادب آ حیات لے۔
پادری بیزجی نے گبر سانس نے کرنا عہدنا مر بند کر دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انہیں چونکایا۔

”پادرے! مجھے ایوبؑ کی گریہ دزاری سناؤ۔“

”بہت اچھا۔ اور آپ جی صبر ایوبؑ سے سبق لیجئے۔ مسٹر بلو۔“

”سبق بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پہلے اس عبرانی بدھ سے کی گریہ دزاری۔“

”خاموش مسٹر بلو۔“ پادری نے دفعہ ”ڈانٹ کر کہا۔۔۔۔۔۔“ ”بہت بے ادبی کر لی۔ اب خاموش
”سواری پادرے۔“

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور حیب سے مداری کی طرح پُرانا
عہد نامہ نکالا۔

”جستہ جستہ پڑھ کر سیناؤں گا، بہت طویل باب ہے۔“

”اور پھر ایوبؑ راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین درست پُرسے کو آئے۔ اور انہوں نے خاک مرون

پر ڈالی اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوبؑ
نے کہا، لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا، میرے جسم پر کیرے رینگ رہے ہیں، میری کھال اٹھ
گئی، میرے دن جولا ہے کئی کلیفوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔“

”خدا بے گناہوں کے مصائب پر ہنستا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے

چھپا دیئے۔ میری زندگی تیز رفتار جہاز کی مانند زور رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔“

”میں خدا سے کہوں گا تجھے زیب دیتا ہے خداوند اگر اپنے بندے سے متفر ہو اور ظالموں کا ساتھ

دے گا کیا تو بھی انسان ہے؟“ کو عیش کر رہے ہیں اور خدا ان کو بڑا داد دیتا ہے وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے

اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا۔ اور عقل نے سمجھا۔

ادب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔

”ابن حوا کی مختصر زندگی کھفتوں سے پُر ہے۔ وہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔“

سلے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کے درخت کو از سر نو زندگی بخشی ہے۔ مگر ابن آدم ایک مرتبہ

د جا بے پھر نہیں اٹھتا۔ لے کر تو، جب تک حیراطیش مائل نہ ہو، مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت منتظر ہوں۔

”پانی پتھروں کو بہلے جاتا ہے، تو افسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اس کی شکل بدل لے۔ تو نے مجھے ملکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر حقیریاں ڈال دیں۔ مجھے جابر دہلے کے حوالے دیا۔ میری باگیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرہ روتے روتے بد ہتیت ہو چکا ہے۔ میری پٹکوں پر موت کا سایہ لڑا، لے لے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لیے تیار ہیں۔ میری آنکھیں دفن و غم دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانشمند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر میرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر اُدھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی کلن سے ا۔ تم میرے باپ ہو، کیڑ وند سے کہا تم میری ماں اور بہنیں۔“

”جانو کہ خدا نے مجھے اپنے حال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، ادا راندیہرا پھیلایا۔ ا کے لشکر نے میرے معبود کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں فی بی بی کے لئے ابھی ہوں، دوستو مجھ پر ترس کھاؤ کہ اس قہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے چھو لیا ہے۔

”میں انسان کا شاکی نہیں۔ لیکن اشتیاق بر لبط اور رغنون بجاتے ہیں۔ جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے را نہیں ملتا، پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاضر و ناظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس ے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گداز کر دیا ہے۔

”اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس مہم دی میں ٹھکرتے ہیں۔ کوہستان رش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ اماران بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں، جنہوں نے ان کے ے کو لہو چلائے۔ جو ان کے لئے شراب کشید کر کے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کر رہتے ہیں۔

”میں نے خیر کی آرزو کی اور مجھے شر ملا۔ روشنی کا منتظر رہا اور تاریکی پائی۔

”جب وہ رب کریم میرے شمالی حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی سیڑھیاں کھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا تو نو جوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ میں غریب، کا حامی و تنہا ہوا تھا۔ میری جڑیں ندی کنارے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی۔ میری عظمت و شوکت تروتازہ تھی۔ لیکن اب نو جوان جن

کے پاؤں کو میں اپنے گلے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تعنیک کرتے ہیں۔ اور اندھی کی مانند مجھ پر حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اٹھ کر صبح سے کہا میں آئندہ ہے کا بھائی اور نوبم کا ساتھی ہوں میری کھال جل گئی۔ میرا ریشہ رورہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے، کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں، اگر میری زمینیں میری وجہ سے لوگ کٹا رہے ہیں، تو کاش گیہوں کے بجائے گوگھر دار جو کے بجائے گھاس پھوس ان پر آگیاں۔ ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

”تب جوئے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا۔۔۔“

پادری نے بائبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سڑکائے آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر پادری دیکھا۔

”ان بیتوں دانش مند دوستوں کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھنے آئے تھے؟“

”ایلی ہو، بل۔ داد اور ایلی فائز۔“ پادری نے جواب دیا۔

”ایلی ہو، بل۔ داد اور ایلی فائز۔“ چارلس نے ذرا کٹائی ہوئی آواز میں دوسرا دہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا

ذہن کیسے اور بھٹک رہا تھا۔ کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔۔۔ کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ تمہارا خوب صورت جسم کو کوار بنا کر تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحے الٹے لگا۔ اُسے بھی ”یوحنا کے نکاشے“ نے متوجہ کیا اور سب سے پہلے اس کی نظر پڑی۔ ”اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے برج میں ایک عقاب کواڑتے دکھیا اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے زرسنگوں کی آوازوں کے سبب مجھ جی کا بھونکنا ابھی باقی ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس، افسوس، افسوس۔“

”اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیالے تھے، ایک نے مجھ سے کہا آئیں تجھے اس بڑی کسی کی مزاد کھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے۔“

چارلس بارلو نے زور سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بائبل کے متعلق ہیں۔ لندن کے متعلق نہیں۔

وائلیٹ بارلو۔۔۔ مرحومہ۔۔۔ کے متعلق بھی نہیں۔ بائبل۔۔۔ بائبل۔۔۔ بائبل۔۔۔

اب میں بیارپڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کمانہ چاہیے۔ اب مجھے۔۔۔

کاؤیری کے کنارے اجاڑ بنگلہ — پدیا کے کنارے اجاڑ بنگلہ — اجاڑ —
 ”اس نے زور سے آواز دی۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے۔ وہ بید طول اور پریشان نظر آرہے تھے۔ ”صاحب
 دڑا سا حاضری کھا لیجئے۔ اب تین بج رہا ہے۔“

چارلس بارلو نے انتہائی مشکور نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا۔ ”اچھا۔ تھینک یو عبدل
 — پادرے میرے ساتھ بچ کھا کر جاؤ۔“

”تھینک یو، مسٹر بارلو۔“

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر بیٹھ کر بادی نے گریس پر بھی سوپ کے بعد عبدالغفور
 اوریں خاموشی سے سرو کئے۔ اسی خاموشی سے کھا نا ختم کر کے چارلس اور بادی باہر نکلے۔
 ”پادرے۔ میں ایس کو آج ہی جینز ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی غیرت معلوم کر لیں،
 وہ ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا۔ ماں اگر وہ معافی مانگے لے۔“

”وہ معافی نہیں مانگے گی۔“

”تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا، پادرے۔“ چارلس نے بادی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ماخظ پادرے۔

”خدا حافظ، گوڈ بلیس یو، مسٹر بارلو۔“

چارلس بارلو اندر چلا گیا۔ بادی ہنرجی نے ہیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی۔ اب ان کے
 من بھر کے ہو چکے تھے۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے۔
 مرقید —

وہ مہر جھکائے جوں کی چال چلتے برساتی سے باہر نکلے اور پچانک تاک اس طرح پہنچے جیسے
 لے کے ساتھ جا رہے ہوں۔ پچانک پر کھڑے ہو کر انہوں نے آسمان کو دیکھا۔ پھر سوچا اب
 باؤں بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی۔ وہ پچانک سے باہر آ کر ایک طرف کو چند قدم چلے،
 بذب کے عالم میں ہٹھک گئے، پھر چلنے لگے۔

نواب قمر الزماں چودھری

نواب قمر الزماں چودھری پھل سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھتے چٹری کی لقری موٹہ پر اپنا اپنی سیاہ بیوک میں ارجمند منزل کی طرف چارپے تھے۔ جوڑی ایمزادس سے چند فرلانگ پر واقع تھی۔ وہ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جب ان کو پادری بنرجی کچھوے کی چال چلتے منہ اٹھائے ایک طرف کو حسیہ نظر آئے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہل گیا۔ انہوں نے سوچا کہ کوئی ادارہ پادری کے پاس پہنچے۔

پادری نے ان کو دیکھا اور یک لمختہ اطمینان کی سانس لی۔ نواب قمر الزماں اس وقت ڈوبے کو تینکے کا سہارا معلوم ہو رہے تھے یا فرشتہ رحمت۔ نواب صاحب نے خاموشی سے ان کو اپنے برابر کار میں بٹھایا۔ صبح کا اخبار پڑھ چکے تھے۔

ارجمند منزل پہنچ کر وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پادری کو بٹھایا اور چائے منگوا کر سامنے لان پر آلا۔ نواب الزماں کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے ٹھہل رہی تھی۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا۔ پادری بنرجی نے جیب سے اخبار نکال کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔

”میں پڑھ چکا ہوں۔ بگلا اخبارات میں زیادہ مفصل خبریں ہیں۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ بشیر جا۔ لے کر آیا۔

”میں ابھی ڈی ایم کے پاس گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“

نواب صاحب نے چائے بنائی۔

”ڈی ایم کی بیوی لندن کی بیماری میں ماری گئی اور آبائی مکان بھی جل گیا۔“

نواب صاحب نے آنکھیں پھیلا کر پادری کو دیکھا۔ پادری اس وقت ایک سیاہ پوش پینا میر نظر آ رہا تھا۔ جس کے پاس بری خبروں کے عداوہ اور کچھ نہ تھا۔

”اللہ رحم کرے۔“ نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔

اچانک پادری کھڑا ہو گیا۔ ”نواب صاحب میں ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت نوٹہ صدے کی وجہ سے پادری بول کھڑا گیا ہے۔ بے چارہ۔ بے چارہ۔“

”آپ بیٹھے پادری صاحب۔ میں بنوے بابو کو ابھی بلواتا ہوں۔ کیا وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں گے؟“

”میں ڈاکٹر سرکار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ پادری نے دہرایا۔

نواب نے تالی بیانی۔ ”مہلتی ہوئی مالتا قریب آئی۔“

”ڈرائیور کو بلاؤ۔“

ڈرائیور حاضر ہوا۔

”بنوے بابو کو فوراً ساتھ لے آؤ۔ کہنا ہے حد ضروری کام ہے۔“

پادری اور نواب چپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد موٹر دوبارہ برساتی میں داخل ہوئی۔ چادر لپیٹے ہوئے بابو دقار سے سیڑھیاں

سے نواب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ بنوے بابو نے پادری کو ہنسٹار

در نواب سے پوچھا۔ ”میں ابھی بھی فرید پور سے واپس آیا ہوں۔ ہمارے سفر کے کپڑے بھی نہیں بدلے

کیا بات ہے خیریت؟“

”خیریت؟“ پادری ایک دم برس پڑا۔ ”میں آپ کو بتانا چاہتا تھا، یہ سب کچھ آپ کی نظر کی وجہ

ہوا۔ سب کچھ۔“

بنوے بابو نے خیریت سے پہلے پادری کو دیکھا اور پھر نواب کو۔

”تمہیں نہیں معلوم ہوئے۔“ نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”روزی کل صبح اشترڈی کی بغادت میں

جو کی پرچو کرتی ہوئی قید کرنی گئی۔ پولس فائرنگ سے کئی حمزہ مارے گئے۔ روزی کے سخت زخمی ہونے

ملاع خرمین شامل ہے۔ یہ کل رات کی خبر ہے۔ یہ شاید کل صبح کے اخباروں سے معلوم ہوگا کہ اس کا کیا

ہے اور کس جیل میں بھیجا گیا ہے۔ زخمی قیدیوں کو تو شاید جیل کے اسپتال میں رکھا جاتا ہے۔“

اندر کسی کمرے میں۔ نیز الزماں گراموفون بجا رہے تھے۔ اچانک تدرل کا ریٹارڈیجنا شروع

توڑ۔ بھوڑ۔ مارو۔ آگ لگاؤ۔ آندھی طوفان بن جاؤ۔ میں سرکش ہوں۔ اصول شکن۔

بربادی کا دلیوتا۔ باغی۔ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ اسٹاپ اٹ۔“ نواب نے بے حد آزدگی کے ساتھ زور سے آواز دی۔

گیت ختم ہو گیا۔

پادری نے سراٹھا کر بنوے بابو پر نظر ڈالی۔ اتنی دیر میں شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”بنوے بابو میری فرمانبرداری کو دیپالی نے اس راستہ پر لگایا۔ اسے دیپالی کی صحبت نے برباد کیا۔ بس میں آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ آپ کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا کہ آپ دیپالی کو غنڈوں کی سنگت سے روکتے۔ میں نے اپنے بھرپوری کوشش کی، اپنی سچی کوشش کی۔ مگر اس کے دماغ میں زہر بہت اچھی طرح بھرا جا چکا تھا۔“

”آپ لوگ سب غالباً مجھے ایک رجعت پسند مسلمان زمیندار سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کی آزادی کے یہی سب نتائج ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت نہیں دی کہ گھر سے قدم نکالیں۔“ نواب نے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں کہ دیپالی کس حد تک سیاسی مشاغل میں حصہ لیتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹرمسٹ تحریک میں شامل نہ ہوگی۔ اور میں نے اس کے قول کا اعتبار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجھ سے چھپا کر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہے تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا نہ اسے منع کر سکتا ہوں۔ ہر نئی نسل اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے تھے۔ منموہن بابو۔ آئیے خدا سے امید کریں کہ روزی خیرت سے ہو۔ آپ پر اس قدرت جو بیت رہی ہے وہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ دینش بھی۔“ پھر وہ چپ ہو گئے۔

طارم نے سچوان لاکر نواب کے پاس رکھا۔ پادری نے سراٹھا کر دفعتاً نواب کو مخاطب کیا۔ اور آپ بھی۔ آپ کا انگریز کے چلے جانے سے کیا فائدہ ہوگا، نہرو نے دسیوں بار کہا ہے، رجواڑے ختم کر دیئے جائیں گے۔“

نواب حقہ لڑ لڑا مار مارا سیاست حد سے زیادہ ٹھنک ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ خستہ حال کالا پارک اور یہ خستہ حال ڈاکٹر۔ ان دونوں کو غالباً آزادی سے فائدہ ہوگا۔ مگر واقعی مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ ریاست الہ چلی جائے گی۔ میں نے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ مگر اقتصادی مسائل پر غور کر کے رونے پہلے ہی

فت پجارکھی ہے۔

دو تونے خیال نے انہیں یک نخت بید مضطرب اور طول کر دیا۔ وہ بچوان گڑ گڑایا کئے۔
پھر انہوں نے پادری سے کہا۔ ”منموہن بابو۔ میں بھی سمجھ سکتا ہوں، آپ کے دل پر کیا گور رہی ہوگی۔
اپنے لادے بھانجے کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس نے کس طرح
ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نئی نسل کی بات کرتے ہو بنوے۔ یہ بڑی احسان فراموش
ام نئی نسل ہے۔ پچھلے سال تمہاری بچی مجھ سے بحث کرنے لگی۔ قربانی اور تیاگ۔ یہ اور
بچی سے کیا کہتا کہ سیاست کی قربان گاہ پر میں اپنی سسر توں کی قربانی دے چکا ہوں۔ میرے ہونہار
کو سیاست ہڑپ کر گئی۔“

”تمہارا کون بھانجا کو مر میاں؟“ بنوے بابو نے پوچھا۔

”تم سے بنوے برسوں میری ملاقات نہیں ہوتی۔ تم میرے حالات سے اجنبی ہو چکے ہو۔
اس قصہ کو بھلائے رکھنا اسی میرے لئے بہتر ہے۔ میں اپنی اس ٹریجڈی اور اپنی بیٹی کی قہقہی
ن پردہ پوشی ہی میں ماییت سمجھتا ہوں۔ رہنے دیوں ہی بات سے بات نکل آئی۔“
”سوری کو مر میاں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

مگر اب نواب آہستہ آہستہ بچوان گڑ گڑاتا اور کہتا رہا۔ ”میری آنکھوں کا تارا۔ میری مرحومہ
نشانی۔ میرا لادلا۔ جس پر فخر کرتے کرتے میں پھولانہ سماتا تھا۔ جس کی میں نے زندگی بنادی۔ اور
میرے ساتھ۔ میری لڑ۔ میرے ساتھ کیا کیا؟۔ یہی۔ منموہن بابو۔ یہی۔
جوڑو، آگ لگا دو، اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ منموہن بابو۔ آپ اور میں اور بنوے ہم سب
میں سوار ہیں۔ روٹو۔ روزی۔ دیپالی۔ یہ سب مل کر ہم کو اس چیز کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم نے
یہ ایک محفوظ دنیا تخلیق کی تھی۔ یہ لوگ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس محفوظ دنیا میں دنیا
ن کو نیست و نابود کر دیں۔“

”مگر کس لئے۔؟“ پادری نے پوچھا۔ ”ہیں نیست و نابود کرنے کے بعد یہ کس قسم کی دنیا
؟“

اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ نواب نے افسردگی سے کہا۔

بنوئے بابو صوفے سے اُٹھے، پادری صاحب بھی اُٹھے، ”مجھے معاف کر دینا بنوئے بابو، میں ہوں
 داس کھو بیٹھا ہوں۔“ بنوئے بابو نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 نواب صاحب کرسی ہٹا کر پادری کے نزدیک آئے۔
 ”منموہن بابو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دعا کرتے رہئے۔ روزی یقیناً خیریت سے بہت
 بھر لوٹے گی۔“

پادری نے بے یقینی سے اقرار میں سر ہلایا۔ نواب نے نیچے اتر کر میوک کا دروازہ کھولا۔ پادری
 ڈاکٹر چھپے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا۔ موٹر میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ موٹر آگے بڑھ گئی۔
 رات کو راجندر منزل میں نواب کی پہلو ٹھی کے پوتے منوہر زبیاں کے حقیقے کے سلسلے میں بڑبھار
 تھا۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔

————— بابریہ عیش کو شش ————— ؟

نواب برساتی سے نکل کر پائیں باغ کی سمت چلے گئے۔

ہم تینوں ریش۔ سرکار اور بزرگی۔ ہم تین بنگالی، تین مختلف راستوں پر کھڑے ہیں۔ میں اور
 دوا ایسے کھبے ہیں جن کو گھن لگ چکا ہے۔ مگر پال میٹھیو بزرگی بے چارہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا، اور
 کر بھی کیا کر لے گا۔

پچھلے لان پر بیچ کر ان کو بار لو کی میم کا خیال آیا۔ پادری نے بتایا تھا کہ سناؤنی سن کر بار لو نے
 بہادری اور ضبط سے کام لیا خالص اسٹف اپر لپ۔ بھئی اگر ایسی ہمتیں۔ ہوتیں تو ساری دنیا پر حکومت
 کرتے۔ نواب لان پر ٹپنے لگے۔ کل سارے عمارتیں شہر کمزیریت کے لئے جائیں گے۔ مجھے بھی جانا ہو گا۔ وا
 بار لو جنگل کی یورپین سوسائٹی میں کافی دل پھینک مشہور تھی۔ خاصی آوارہ۔ مچھلی کی طرح پیتی تھی۔ جو
 مرگئی غریب۔ بار لو اس کی وجہ سے بہت دکھی رہتا تھا۔ اب روزی کے لئے کیا کیا جائے۔ کچھ
 ہو سکتا۔ روزی کی ماں پندرہ سالہ گری بالا اسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر برتن مانجھا کرتی
 اور میں اس درخت کے پیچھے چھپ چھپ کر اسے طرح طرح سے چھڑنے کی کوشش کرتا تھا وقت کسٹ
 ہے، کس طرح بدلتا ہے، اللہ غنی،

”نواب صاحب —————“ ایک کلرک نما نوجوان باغ کی سڑک پر بیچ کر سائیکل سے اتر

نزدیک آکر سلام کیا۔ ”کل شام آفس میں یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ
 لے پیش کیا۔ میں نے آپ سے ملاقات کا وقت آج ساڑھے پانچ کا دے دیا ہے۔ کیوں کہ آپ کو اسی

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ نواب کارنگ پرچہ پر کھانا نام پڑھ کر سیلا پڑ چکا تھا۔
 ”تم جاؤ۔ اندر جاؤ۔ متعلقہ کاغذات میز پر لگا دو۔“ انھوں نے خالی خالی آوازیں کہا۔
 ”بہت اچھا۔“ نوجوان سائیکل سنبھال کر کتب خانہ کی طرف بڑھ گیا۔
 نواب چند لمحوں تک گھاس پڑھ ٹھٹھے کھڑے رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر کی منزل کو دیکھا،
 اڑانے کرے کی نیلے شیشوں والی کھڑکی ہوا کے جھونکے نے کھٹ سے بند کر دی۔ وہ اس کھڑکی کو چند
 تک مہموت کرتے رہے۔ پھر اپنی رست و اراج پر نظر ڈالی، اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کتب خانے
 سے روانہ ہو گئے۔

۲۶

ریحان الدین احمد

اس صبح جس وقت چارلس بارلو چھوٹا حاضری کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا کر ”نغماتِ ہند“
 میں مصروف تھا۔ ڈی ایمز ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ووڈ لینڈز میں کریم خانہ نے بریک فاسٹ
 سب معمول تازہ پتہ لگا لاکر رکھا۔ اور چائے دانی لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ او مارا نے ٹوسٹ
 کاتے لگاتے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ درق لٹے اندر کے صفحے پر ایک سرخی نے ان کو متوجہ
 کرنے لگا۔ ”ریحان الدین احمد“۔ جلدی آؤ۔

بریک فاسٹ کی میز پر ڈیکٹینڈ کے پہلو کے برآمدے میں لگی تھی۔ گیسٹ روم کا دروازہ برآمدے کے
 ملتا تھا۔ شیو کے صابن کا جھاگ تو لیہ سے صاف کرتا ریحان الدین احمد کمرے سے نمودار ہوا۔

کیا ہوا _____ ۹

”کریم خاں۔ روزِ منہ کرتی ہوں کہ انداماتِ بائل مت کرو۔“ غصے سے ایک دم ان کا چہرہ سُرخ ہو چکا تھا۔

”اوہ آؤ۔ دوسرا اندامِ بائل۔ ایسی بھی کیا قیامت آگئی۔“

”نہیں۔ تم جانتے نہیں۔ مٹی گھر پر نہ ہوں تو یہ لوگ بالکل بیگناہ بن جاتے ہیں۔ دُشمن۔“

بیرِ غائب ہو چکا تھا۔

”کم آؤ۔ آؤ۔“ ریحان نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی کانگریس سوشلسٹ سُنے گا تو کہے گا کیونٹ

لیڈر اس طرح اپنے نوکر کو ڈانٹتے ہیں۔“

”اوہ شٹ آپ۔“

”آؤ۔ تمہارا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ آملیٹ ختم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سیڑ پر بیٹھیاں پھلانگتا برآمدے میں آیا اور اپنی مالکن کے قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ آؤ۔

ناگواری سے اس پر نظر ڈالی۔

بیرے نے دوسرا اندامِ لا کر آؤ کے سامنے رکھا۔ ریحان نے نظر بچا کر شرارت سے کریم خاں کو آؤ

ماری۔ بوڑھا بیرہ بیدِ خفیف سے مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹ پچکا کر پچھے بٹا اور جا کر میز سے کچھ فاصلہ

پرائی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد یہ جان کر کہ آؤ ابی کا غصہ اب ٹھنڈا ہو گیا ہوگا، ریحان نے کہا۔ آؤ۔

”تم کو ایک ہزدری بات بتانا چاہتا تھا۔“

”کریم خاں۔۔۔ دھوبی سے پوچھو میری ساریاں استری کر دیں۔“

کریم خاں اشارہ سمجھ کر غائب ہو گیا۔

”بال بتا دیا بات ہے۔“

”میں دیپالی سے شادی کر رہا ہوں۔“

آؤ سے کچھ سنہالے آؤ ابی کا ہاتھ ہوا میں معنی ہو کر رہ گیا۔

”اس کے بغیر اگر میں جیتے ہی مر گیا تو مودونٹ نقصان ہوگا۔“ ریحان نے مصنوعی سنجیدگی

وضاحت کی۔

اُدّا اب عینک اتار کر بھونکی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔
 ”کیوں اُدّا؟“

”تم۔ تم ریمان۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے۔ لندن میں رہے ایک ساتھ سیاسی کام
 کرتے آج تک مجھ سے اپنا کوئی ذاتی راز نہیں چھپایا تھا۔ پھر اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں پوشیدہ
 تھی؟“

ریمان فدا سُرخ ہو گیا۔ عورتیں۔ ”اُدّا۔“ اس نے متانت سے کہا۔ ”ماتا ہوں تم میری دوست،
 سفی اور گائیڈ ہو۔ مگر یہ میرا بہت ہی۔ بہت ہی ذاتی معاملہ تھا اور میرا خیال تھا کہ ایک عورت دوسری
 دست کے سلسلے میں کبھی غیر جانبدارانہ رائے نہیں دے سکتی۔“

”یہ تم میرے لئے کہہ رہے ہو؟ میں جو تم کو اپنا۔ اپنا۔“

”اوہ۔ کم آن اُدّا۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری اس رازداری سے دکھ پہنچا۔“

”کیوں۔“ اُدّا نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو تو

پہلے سے دو گنا اس کا خیال کرتی۔ مجھے خود وہ لڑکی بہت پسند ہے۔“

”تمہیں بھی پسند ہے اُدّا؟“ ریمان کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ”وہ نڈفل۔ تو تم میرے

غائب کو مانتی ہو؟“

”مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہی اسے مودمنٹ میں لائی ہوں۔ تم بھولتے ہو کہ ایک لحاظ سے

ری ہی وساطت سے اس سے تمہاری ملاقات ہوئی۔“

”یہ تو غلط ہے اُدّا۔ اس پر تو میں بہت پہلے زہر کھا چکا تھا۔ ٹو ایٹ فرسٹ سائٹ دیکھو۔

نیرہ۔“

”تم جذباتی طور پر ابھی تک بیدار سمجھ رہے ہو۔“

”ابھی تو تم میرے انتخاب کی تعریف کر رہی تھیں، پھر میں ابھی کیسے ہوا؟ اُدّا اپنا ہارڈ ٹیوٹلڈ

لاؤ تو کھاؤ۔ تم کو اس اطلاع سے ایسا۔ ایسی حیرت ہوئی ہے کہ بے چارے محمود ادھر جیوتی کی

ہمدات کا بھی ایسا ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ کمال ہے۔“

اُدّا چہرہ سخت کر کے چاندی کے ننھے چمچے سے انڈے پر کھٹ کھٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ریان کہنیاں میز پر رکھے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ شاید میری زیادتی ہے۔ ایسی مخلص دوست کے
 میں ایسی سخت باتیں کر رہا ہوں۔ ”سوری اوما۔“ واقعی مجھے بہت پہلے تم کو اپنا ہمارا بنانا چاہئے تھا
 مگر حالات بھی تو کیسے ابنا رہے تھے۔ مستقل انڈر گراؤنڈ، مسلسل احتیاط، اور پھر وہ احمق بھی نہ
 کیوں مجھ سے خفا ہو گئی تھی، نہایت محنت سے اب جا کر اسے ذرا راہ راست پر لایا ہوں۔ افوہ نہ
 کرنا بھی خاصی مشفق ہے۔ تم تو کبھی اس چکر میں پڑی نہیں، تمہیں کیا معلوم۔“
 اوما چپ چاپ انڈا کھانے میں مصروف رہی۔

”لو۔ اب تم خفا ہو گئیں۔ یہ کیا مصیبت ہے یار۔“ پھر اس نے دفعتاً بڑی گھبر آواز میں کہا:
 ”اوما۔ تم جانتی ہو، میں مدتوں گاؤں جا کر اپنی بہن سے نہیں مل پاتا۔ ڈھاکے میں اپنے نوار
 رشتہ داروں سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ صرف تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمہارے غلوں کی
 سے یہ گھر تک مجھے اپنا گھر معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ۔“ وہ مسخرا ہنسا۔ ”وڈ لیڈز کو اپنا گھر سمجھتا
 ہے مگر ہر حال اتفاق سے تم اسی محل میں پیدا ہو گئیں۔ کیا کیا جائے۔ تم جہاں رہو گی وہی میرا گھر
 اوما نے ہلکیں جھپکائیں۔ ان کی عینک کا شیشہ دھندلا ہو چکا تھا۔ ریمان جھینپ کر دوسری
 دیکھنے لگا۔ وہ جذباتیت سے بے انتہا گھبراتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خاصا جذباتی ہو رہا
 ہے۔ وہ جلدی سے کرسی چھپے سر کا کراٹھا۔ اور پیک کر اپنے کمرے سے سگریٹ اور ماچس اٹھالایا
 سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھنے ہوئے شبا ش آواز میں اس نے کہا ”لاؤ گرام گرم چائے تو بنا کر دو۔“
 اوما نے آہستہ سے ٹی کوڑی اٹھا کر چائے اس کی پیالی میں انڈیلی۔

”میں۔ میں تو اب چلا جاؤں گا واپس بمبئی۔ دینا پائی تمہارے حوالے۔ تم میری غیر موجودگی میں اس
 خیال رکھنا۔ وہ ذرا بے وقوف سی لڑکی ہے۔ اگر کبھی کوئی حماقت کی بات کرے تو میری خاطر اسے معاف
 دینا۔ وعدہ۔“

”وعدہ“

”گڈ ایلڈ اوما۔“ وہ اطمینان سے چلے پینے میں جٹ گیا۔

”تمہارا خیال ہے بنوئے بلو اس شادی کی اجازت دے دیں گے؟“

”کوشش تو میں ہی کروں گا۔“

”چندر کنج جا کر میری سفارش کر دو۔ جھٹ پٹ۔“

”میں — —؟“

”دیپالی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو رپہلی ملاقات ہی میں تم سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ جب ”کشموم آبا“ کی سازش کے سلسلے میں اسے اپنے ساتھ فرضی طور پر کوٹھیلالے گئی تھیں۔ یوں اسے اگر اپنی کے ہاں دیر لگ جائے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“

”دیپالی کیا کہہ رہی تھی؟“

”کیا — —؟ تمہارے متعلق — —؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کہہ رہی تھی ایسا گستاخاؤادی نے بابا پر جادو کر دیا ہو۔“

”گڈ گاڈ۔“

”قسمیہ۔ ادا تم سچ جا کر زرا ان کے خیالات کا اندازہ تو لگاؤ۔“

”مجھے مڈل کلاس ہندو بنگالیوں کے خیالات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بھدرا لوگ۔“

”مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر میں ہندو بنگالی بورڈر وائی بھدرا لوگ کی نظروں میں کم از کم ”اشترا“ تو ہوں۔ ذرا غور کرو۔ ”ہمارے بنگال کی ہندو بورڈر وائی مسلم بورڈر وائی کو کس سربراہ انداز میں ”اشترا“ کہہ کر گویا tolerate کرتی ہے۔!“

”اگر کوئی تمہارے اس لہجے کو سنے تو سمجھے کہ شاید تم بھی کیونل ہو۔ سچے دل سے کیونل نہیں۔“ اقدانے ہنس کر جواب دیا۔

”ریجن بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”بہر کیف تم اب اپنے دوسرے مشن پر چندر کنج و کوئی ہندو یا مسلمان باپ چاہے وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو اپنی لڑکی کو دوسرے میں شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔“

”تمہارے ڈیڈی بھی؟“

”میرے ڈیڈی کا یہاں کیا ذکر ہے۔“

”کیوں؟“ وہ ہنسا رہا۔ ”فرض کرو تم کسی ”اشترا“ سے بیاہ کرنا چاہو، یا عیسائی، انگریز، یا چینی، جاپانی، روسی سے، تو سر پر تویش اجازت نہ دیں گے، وہ تو بیدار ذوالخیال پڑ

”میسر سیاہ کا کیا ذکر ہے۔“

”اوکے، اوکے آؤما۔ پتھوں کی طرح مشراؤ نہیں۔ ہے کوئی مرغاً نظریں؟ چلوں سر پری تو شری وکالت کر دوں گا۔ تم بنوئے بابو سے میرا پردہ پیگنڈہ کر دو۔ لاؤ ملاؤ ملاؤ۔“ اس نے دستاورد سے آؤما کا ہاتھ کھینچ کر زور سے مصافحہ کیا۔ آؤما نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ”ریحان۔ تمہارا رہن گب جائے گا۔“

”اسی لونڈا رہن کو ختم کرنے کے لئے تو اب گھر بسانے کا ارادہ ہے ہمارا۔“

”کل شام کیا پروپوز۔“

”نہیں۔“

”ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی؟“

”یوں ہی۔ ذرا شاعری داعری بگھارتا رہتا ہوں۔ اس سے کہا تو ہے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عدہ سنجیدگی سے۔ ایسا کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اگر وہ اپنی یار دوست اور کامریڈہ ہوتی، ٹکی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب عجیب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ تم۔ تم میرا مطلب سمجھ نہیں سکتیں۔ formal طور پر کیا کہوں؟ بس ایک روز بھگنا کر لے جاؤں گا۔ بھگنانے کا الٹی میٹم اسے ابالتے رہے۔“

”تم بالکل دیوانے ہو رہو تو۔“

”ہوں تو ہسی۔“

اب ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کا باغ سجدہ تر و تازہ اور دلفریب معلوم ہوا تھا۔ ”اچانک آؤما نے کہا۔“ تم بے چاری جہاں آرا کو اتنی جلدی بھول گئے۔“

وہ ایک دم اس غیر متوقع تذکرے سے ششدر سا رہ گیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہہ سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اتنی جلدی تو نہیں، کافی عرصہ ہو گیا۔“

”او۔۔۔ یو مین (MEN)۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ سیزر اب آؤما ہی کے قدموں سے اٹھ کر گرا باری سے چلتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ لے دیکھی رہی۔ پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا۔ ”دیپاتی کو معلوم ہے؟“

”نہیں۔“

”تم نے اُسے کچھ نہیں بتایا؟“

”بتانے کی کیا خاص بات تھی۔ جہاں آرا بے چاری کی میری موجودہ زندگی میں اب کیا ہے کر میں خواہ مخواہ اس کا تذکرہ پھیرتا۔ اور بات بھی کیا تھی کہ جہاں آرا کے والد مجھے اپنا گھر داماد چاہتے تھے۔ ایسا اکثر مسلمان گھرانوں میں ہوتا ہے۔“

”دیپالی جہاں آرا کی گہری دوست ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے دنوں وہ تم سے خفا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اُسے معلوم ہو گیا۔“

”اس وجہ سے وہ تم سے۔“

”وہ جھنجھلا گیا۔“ اگر اس وجہ سے ناراض تھی تو مجھے با آسانی بتا سکتی تھی۔ وہ بے صاف دل اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔“ وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔ اور تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پتہ لا حول ولا قوۃ۔ عورتوں کے دماغ بھی عجیب انداز سے کام کرتے ہیں۔ اُسے مجھے بتانا تو چاہتا تھا۔ اگر سہی بات ہے۔“ مگر تم کو یہ خیال کیسے آیا؟

”میں بھی عورت ہوں۔“

”لائیک ہیں۔“ وہ ایک لحظہ سید پریشان ہو کر پیالی میں چمچ بجانے لگا۔ ”ادائی؟“ اُدائہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے پارٹی کی طرف سے اس سے بی بات چیت کرنی ہے۔ ارجمند منزل جا کر۔۔۔ ادہ ہل۔۔۔“

”ارجمند منزل کب سے نہیں گئے؟“

”مدین گزر گئیں۔“

”کیوں نہیں جاتے، کیا احساسِ جرم ستاتا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”کبھی جہاں آرا یاد آتی ہے؟“

”اپنی پہلی محبت کو ہنسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے؟“

اتنی۔ اُس نے دفعتاً سسرالتوں میں چھپا کر میز پر ٹکادیا۔

”روٹو۔۔۔۔۔“

صرف اس کی اتنی اتنے پیار سے اسے روٹو پکارتی تھیں۔ روٹو لو چائے آگئی۔ اٹھو۔
”روٹو۔ لو چائے آگئی۔ اٹھو۔“ اوما کہہ رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ اور چوروں کی طرح اوما پر نظر ڈالی۔ مائی لٹل مدر۔
اوما چائے گھولنے میں مصروف رہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی پیالی کا انتظار کرنے لگا۔

”ایک بات سنو۔ مذاق بطرف۔“ اوما نے اسے پیالی دے کر کہا۔ ”تم نے اپنی غیر موجودگی؟
دیپالی میرے حوالے کی ہے۔ فرض کرو وہ تمہارے اس قصے کے بارے میں مجھ سے پوچھے نہیں اُسے
کیا بتاؤں۔“

”کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم خواہ مخواہ اتنی دیر سے لمبا چوڑا میلو ڈرامہ بنا رہی ہو۔“ ریا
پھر جھجکا کر کہا۔

”مگر مجھے پوری تفصیل تو معلوم ہونی چاہئے۔ فرض کرو جہاں آرا اس سے کچھ کہے تو خود آرا
کی پوزیشن کتنی نازک اور awkward ہوگی اور وہ تمہارے متعلق کیا سوچے گی کہ تم نے دو
کو قتل دیا۔ پہلے جہاں آرا کو دغا دی اور پھر اسے دھوکے میں رکھا۔ جبکہ وہ جہاں آرا کی اتنی گ
دوست ہے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے تم سے پرک گئی تھی۔ نواب صاحبہ
گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ مگر تم کو جہاں آرا سے خود کوئی دلچسپی نہ تھی؛ تم بالکل بے قصور ہو۔
”کیا میرا ٹرائل ہو رہا ہے؟ تم کو تو واقعی بیرسٹر ہونا چاہئے تھا۔“

”تمہاری اتنی نواب قمرالزمان کی سگی چچا خادہ ہیں تھیں۔“

میری اتنی۔۔۔۔۔ میری اتنی۔

بارش کی لطیف دھند باغ پر منڈلاتی رہی۔ مہا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

”پھر تمہیں جانکداد میں حصہ کیوں نہیں ملا؟“

”ادہ اوما۔۔۔۔۔ اوما۔۔۔۔۔ ڈونٹ بی سچ لے بور۔ تم کو تیرا چکا ہوں۔“ ریمان

الٹا کر چھائی لیٹے ہوئے کہا۔ ”مگر تم ساری الف لیٹے نہ جانے کیوں پھر سننا چاہتی ہو۔ آل رائٹ

جائداد میں حصہ نہیں ملا۔ جس کی مجھے سطلق پر واہ نہیں۔ میرے نانا نوابزادہ فخر الزماں چودہوی
ب نور الزماں چودہری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آیا خیال میں۔ یاد کرو۔ گرہ میں باندھ لو۔ اور
بار اپنے سوالوں سے مجھے بورہ کرنا۔ میرے نانا فخر الزماں چودہری نواب قمر الزماں کے والد نواب
زماں کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ اب رٹ کر سبق سناؤ۔ چلو۔ تم بھی کیا یاد کرو گئی۔
اوما قہقہہ لگا کر ہنسیں۔ ”آگے بتاؤ۔ بڑا الف سیلوی قصہ ہے۔“

”لایک ہل۔ الف سیلوی قصہ یہ ہے کہ نانا جان اپنے بڑے بھائی کی طرح بے حد رنجین
ج تھے۔ صرف کلکتہ کی گوہر جان پر ایک گاؤں نکھا کر رکھ دیا تھا۔ اور ایک وہ۔ بچپن میں سنا
تھا۔ لکھنؤ کی ننوا پچوا اور دتی کی خیمیا اور بنارس کی بے نظیر۔ فیوڈل ڈیکٹنس کی بات کرتے
آپ لوگ۔“ اس نے پیالی ذرا زور سے طشتری میں رکھی۔

”تم کو پتہ ہے ہم بورنڈالوگوں کو تم فیوڈل لوگ سید فسی ٹیٹ کرتے ہو۔ اومانے مسکرا
بہا۔“

”بکواس۔ بہر حال۔“ ریمان نے ماچس کے لئے پہلے کرتے کی ایک جیب میں پھر دوسری
ب میں ہاتھ ڈالا۔

”سگریٹ پینے بند کر دو۔ ہاں پھر کیا ہوا۔؟“

”پھر یہ ہوا کہ نانا جان نے ایک تھیر کپنی میں روپیہ لگایا۔ مرحوم خود بھی نامک لکھتے تھے۔
بند منزل میں باقاعدہ جلسہ گھر تھا۔ بہر حال۔ تھیر کپنی کا منجر سا روپیہ بن کر کے رنگوں بھاگ گیا۔
جب عین عالم جوانی میں نانا جان کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا
و وقت ان کے حصے کی زمینداری مہاجن کے ہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔“

”امی ان کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ جب نانا جان مرے وہ شاید چھ یا سات سال کی تھیں۔ والد کے
نے کے دوسرے سال کالرا کی وبا پھیلی۔ اور اس میں ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ امی اپنے تایا کے یہاں پلنے
نواب زادہ فخر الزماں کی جو جائداد فضول خرچی اور عیاشی سے باقی بچی تھی نواب نور الزماں نے بہن سے
مرا کر بھتیجی کے قانونی سرپرست کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لے لی۔ قاعدے سے امی کی ستادی
تے ایازاد بھائی یعنی نواب قمر الزماں سے ہوئی چاہئے تھی۔ بیگم نور الزماں اب شوہر کی یتیم اور نادار

تھی۔ دن رات وہ اس کے ارلز کورٹ کے ڈگڑ میں سرمانے بیٹھ کر اس کا ٹیپر کھینچ لیتی۔ اسے دوا پلاتی۔
اس کے لئے کھانا پکاتی۔ اس کے کپڑے تک دھوتی اور استری کرتی۔ صرت اس کی اتنی ہی نے اس کی
یہی دیکھ بھال اور خدمت کی تھی۔ آتما کا یہ بے لوث سلوک وہ عمر بھر نہ بھول سکتا تھا۔

”بھیر کیا ہوا روتو۔۔۔۔۔؟“

”ارے تمہیں بتلایا تو تھا یا۔۔۔۔۔“

”تمہاری اتنی غریب کسان گھر میں کس طرح خوش رہیں؟“

وہ اُدا سی سے مسکرا دیا۔ ”مجھے یاد ہے۔ میں چھوٹا سا تھا اور ایک اندھیری رات برآمدے
بں چٹائی بچھائے لالین سامنے رکھے اسکول کا سبق یاد کرنے میں مصروف تھا۔ جب اندر سے
مئی کے آہستہ آہستہ رونے اور باتا کے چلنے کی آواز آئی۔ میں اتنی کو سیدھا جانتا تھا۔ ان کے رونے کی آواز
سے گھبرا کر میں نے باشا کی دیوار سے کان لگا دیے اور پھر سوراخ میں سے جھانکا۔ اتنی دن بھر کام
اج کی محنت کے بعد تھک کر رونے لگی تھیں۔ وہ چوہے کے پاس پیڑ بھی پر سر جھکائے بیٹھی
تھیں اور میرے آبا۔۔۔۔۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میرے آبا کمرے کے دروازے
بں کھڑے اس منات سے تقریر کر رہے تھے گویا جھگڑ کے منبر پر وعظا کہتے ہوں۔ وہ کہہ رہے
تھے، میں نے تم کو تیس بی بی شادی کے دوسرے دن سمجھا دیا تھا کہ بھول جاؤ کہ تم نواب نذر الزماں مرحوم
کی بیٹی اور نواب نور الزماں چودھری رئیس اعظم فرید پور کی بھتیجی ہو۔۔۔۔۔ اور ہمیشہ یاد رکھو۔
۔۔۔۔۔ انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا۔۔۔۔۔ کہ تم ایک غریب سید کی بیوی اور آل رسول کی بہو
ہو۔۔۔۔۔ اور یاد رکھو حلیمہ بی بی کہ شہنشاہ کائنات کی بیٹی مولانا علیؑ کے گھر میں چکی پیستی تھیں۔
در ایران کی بادشاہ زلوی شہید کر بلا کے گھر میں فاقہ کرتی تھی۔ تم تو ان سب کی خاک پا بھی نہیں ہو۔
نوباہ استغفار کرو اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ وہ بخشش والا اور مہربان ہے۔۔۔۔۔ آبا رسول اللہ
کا نام لینے کے بعد درود پڑھ کر بار بار اڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی سنجیدہ شکل اور ہوا میں لرزتی
ناڑھی پر میری نظر پڑی تو باشا کی دیوار کے ادھر مجھے اپنی پریشانی کے باوجود بے اختیار ہنسی آ گئی۔
در میں اپنی شیتیں پائی پر اوہیں آن بیٹھا۔ اتنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھ کر پھر چوہے پر جھپک
گئیں۔ اور آبا باہر چلے گئے۔

”اس کے بعد مجھے یاد ہے، اُمی نے آتے آتے پھر کوئی شکایت نہیں کی، اور خاموشی سے شوہر، ساس، سسر، دیور، جیسٹھ اور نندوں کی ٹہل میں لگی رہیں۔ انہیں واقعی یہ فخر تھا کہ سید کی بیوی ہیں۔ جو مذہب تھیں۔ پانچ وقت کی نماز، روزے رکھتیں۔ میرے لئے طرح طرح کے وظیفے پڑھتیں، بنتیں مانتیں۔۔۔ ریحان کی آواز بھراگئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”یہ سب لوگ کون تھے؟“ اُمی نے پوچھا۔

”کون۔۔۔۔۔“ ریحان نے چونک کر دریافت کیا۔

”یہ سب جن کی محنت کشی کی مثال تمہارے آبا نے اُن کے سامنے پیش کی۔“

”پر وفت محمد کی بیٹی اور ان کے نواسے کی بیوی۔ وغیرہ۔۔۔۔۔ ارے چھوڑ دو آؤ۔ تم کون باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیا پرانے قصے لے کر بیٹھ گئیں؟“ وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

”تمہارے آبا بڑے بلند کردار کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔“

”آبا۔۔۔۔۔“ وہ ٹہلنے ٹہلنے ٹھٹھک گیا۔ ”آبا حیرت انگیز بڑے مثال شخصیت کے

مالک ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے گھروالے ان کو ذرا سا خبطی گردانتے ہیں۔ مگر گاؤں والے ان کو اچھا خاصا ولی اللہ بھی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ جب اُمی کی شادی ہوئی تو نواب نور الزماں نے ان کو حمیرا دیا۔ نواب نور الزماں کا چھوٹا بھائی تھا اور یہ موجود تھا اور بہر حال اُمی نواب نور الزماں کے سگے بھائی کی اولاد تھیں اور وہ ان کی جائیداد قبضے میں کر کے ان کی کافی حق تلفی کر چکے تھے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ تو اُمی کا تھوڑا بہت حمیرا بنایا گیا جو غریب کسانوں کے لئے تو کسی شاہی خزانے سے کم نہ تھا۔ مگر جب آبا کشتیوں پر لڑے مولویوں اور کاشتکاروں کا قافلہ بارات میں لے کر پہنچے تو انہوں نے حمیرا کا سامان قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُمی بتایا کرتی تھیں کہ کہنے لگے وہ نواب نور الزماں کے ایسے غریب داماد نہیں کہلایا جاتے جنہوں نے بیوی کے روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ لہذا وہ صرف اُمی کے کپڑوں کے صندوق اٹھوا کر اُمی کو رخصت کر لے گئے۔ اُمی کے زیور البتہ جب میری بہن رابعہ پیدا ہوئی تو نواب صاحب نے اس کے نام سے بینک میں محفوظ کر دیئے تھے۔ آبا بہر حال اسی طرح دھان اُگاتے اور جبہ گھر میں نماز پڑھتے رہے۔۔۔۔۔“

”سچے کیونٹسٹ۔“ اوانے کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔

”اصل قصہ تو تم نے اب تک بتایا نہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ وہ عاجز آکر کھڑکی پر بیٹھ گیا۔

”جب میں گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور بقول شخصے میری ذہانت کی دھم مچنے

لی تو نواب قمر الزماں اتنی آبا سے مصر ہو کر مجھے ڈھاکے لے آئے۔ میں جب چھ سات سال کا تھا

یہ نواب قمر الزماں کا جنھیں میں بڑے نانا کہتا تھا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد

ن۔ بالکل پرانے فیشن کے، کار چوٹی چوڑے پہنے ہوئے جفادری زمیندار۔ جیسے پرانی کتابوں کی

سویروں میں ہوتے ہیں۔ بہر حال۔ اب قمر الزماں ریاست کے مالک تھے۔ وہ مجھے ڈھاکے

لے آئے اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں ارجمند منزل میں

رہا تھا اور قمر الزماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ آبا کو ماموں جان نے یقین دلایا تھا

اتنی کار و پیہ جو اتنے شادی کے وقت لینے سے انکار کیا تھا میری تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس کے

وجود بیش از پیہ مہینہ با مبالغہ ہر مہینے آبا کا کچھ سے میرے نام نئی آرڈر کرتے۔ ماموں جان مسکرا کر

روپیہ وصول کرتے۔ اور میرے نام ڈاک خانے میں جتنا کرتے رہتے۔ اصلیت یہ تھی کہ میں ارجمند

زل میں ماموں جان کے لاڈلے نور نظر کی حیثیت سے پردان چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کا بیٹا خواہا کر گھر

نہ تھا۔ ماموں جان اس کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ اور مجھے آئیڈیلایز کر رہے تھے اور اصل بات

اسی یہ تھی کہ وہ جہاں آرا سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ ماموں جان علی گڑھ کے معتقد تھے انہوں

البتہ۔ لے کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں میں مزید لائق اور ہونہار ثابت ہوا۔ ماموں جان لے چاکر

سائے خاندان میں واحد معقول اور ہونہار نوجوان صرف میں تھا۔ ماموں جان میرے لے طرح طرح

خواب دیکھنے لگے۔ یہ سڑکی۔ آئی سی ایس کا مقابلہ ان کے پٹ سن کے کاروبار کی دیکھ بھال۔

”جہاں آرا چھوٹی سی تھی۔ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوگی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ دھڑی

ن اور پتہ چلا کہ ماموں جان اس سے میری شادی کتنا چاہتے ہیں، تو میں بے حد خوش ہوا۔ میرا خیال تھا

کالج سے نکل کر کسی اخبار میں کام کروں گا۔ ————— میں انگریز سرکار کی ملازمت کے سخت خلاف

ہو گیا تھا۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ اور جہاں ارادہ کو لے کر اپنا گھر الگ بناؤں گا۔

”ماموں جان کو واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن میری ذہانت وغیرہ کے علاوہ ماموں جان میرے اتنا خیال رکھتے تھے اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی۔“ ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ان کے والد نوا نور الزماں پرانے ٹائپ کے جابر اور مطلق العنان زمیندار تھے۔ ماموں جان۔۔۔ ستم آئیاں۔ ان کے برعکس ایک جدید انسان ہیں! اور نیک دل۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد نے اپنی بے زبان بھتیجی ساتھ ہر طرح سے بڑی بے انصافی کی۔ وہ مجھے اپنا داماد بنا کر تلافی یافتہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔“ وہ یک لخت چپ ہو گیا۔

”اوما ہم تن گوش اسے دیکھتی رہیں۔“ اس کے علاوہ کیا رونو۔۔۔؟“

ریحان نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ماموں جان امی کو بے حد پسند کرتے تھے انہیں بچپن سے اپنی بنتِ عم ہی سے محبت تھی۔ اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ کشمیر کی ریس زادی کے بجائے امی سے شادی کرتے۔“

”زندگی۔۔۔ واقعی کتنی عجیب چیز ہے۔“ اومانے آہستہ سے کہا۔ ”اور تمہاری اگو بھی نواب قمر الزماں کو پسند کرتی تھیں؟“

”یقیناً۔“

”اور کسی نے ان سے نہ پوچھا کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟“

”نہیں۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ اور نہ انھوں نے کسی کو بتایا۔ وہ مرتے دم تک پتی دستاوی رہیں۔ آخر دم تک شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔“

”بنگالی عورت۔۔۔!“

”ہاں۔ بنگالی عورت! ہندوستانی عورت!!“

”وہ کبھی ارجمند منزل آتی تھیں؟“

”بہت کم۔ کسی خاندانی تقریب کے لئے کبھی کبھار آجاتی تھیں اور ماموں جان ان کی خاطر مارا میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ جاتے وقت دستور سے زیادہ تحفے تحائف ان کے ساتھ کرتے، مگر وہ کچھ نہیں بچوڑ جاتیں۔ کیونکہ آباد دولت مند سسرال کا ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ اور امی نے ساری

”اُن کا یہ حکم مانا۔“

”فشی مسٹ ہیو، میں نے گریٹ وڈی“

”شئی وائز۔“

اب بارش تھم چکی تھی، ادب باغ کی ابرا کو د فضا بید خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ریحان نے ی پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی داستان ختم کرنا چاہی۔

”جب میرے ولایت جانے کا پروگرام بنا تو امی نے چاہا کہ اپنے زیورات جو بینک میں محفوظ روخت کر کے میرے ولایت کے خبا کا انتظام کریں۔ ماموں جان نے ابا کو تو یہ سچی پٹھانی کر مجھے ری وظیفہ مل گیا ہے۔ اور امی سے چپکے سے کہا بی بی تم زیورا اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھو۔ میں اپنے بھانجے مجھے بتر کی طرح عزیز ہے، اپنے روپے سے لندن بھیج رہا ہوں، امی کو معلوم تھا کہ ماموں جان وہ جہاں آنا کو مجھ سے بیاہ دینے کا ہے۔ وہ بیجاری بے حد مسرور تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی ضد کی وجہ ماری عمر تلکدستی میں گزار چکی تھیں۔ انھیں اب خوشی تھی کہ اس رشتے سے ان کے غریب بیٹے کی زندگی نئے گی۔“

”تمہاری امی کے پاس بہت گہنے تھے؟“ اوما نے خالص عورتوں کی سی دلچسپی سے پوچھا۔ ریحان نے ایک بار تعجب سے اس پر نظر ڈالی۔ ”کہہ تو چکا ہوں، ان کی والدہ کے زیور تھے جو تانیا نے بینک میں رکھوا دیئے تھے۔“

”وہ میرے جواہرات جو امی کو ملنے چاہئیں تھے، ان پر ان کی والدہ کے انتقال کے بعد سب گیم ل ان کی تانی پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔“

”چنانچہ میں ماموں جان کے خرچ پر لندن گیا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو یہاں شادی کی ہو رہی تھیں۔ مجھے ہار پھول پہنائے گئے، ارجمند منزل میں زوردار دعوت ہوئی۔ شوہر ابرا سارا گاؤں گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ صرف امی نہیں تھیں۔ جن کو میری آمد سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ سال بھر پہلے مر چکی تھیں۔ ابا نے جوتہ گھر میں جا کر شکرانے کی نماز چوپال میں گانے کی محفل ہوئی۔ بیاتیوں نے فوراً میرے لئے گیت بنائے۔ میں گاؤں والوں ایک عجوبہ روزگار رستی بن چکا تھا۔ جب میں ڈھاکے والپس آیا ——— (تم تو ابھی لندن میں

تھیں۔ یہاں کیا کیا ہنگامے رہے میرے ساتھ تو شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ ماموں جان گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہا کہ شادی کے بعد میں ان کا پاٹ کا کاروبار اپنے ذمہ لے لوں اپنے کتب خانے کی میز پر زمینداری کے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ میری رہائش کے کوٹھی کی دوسری منزل کے کمرے آراستہ کئے جا چکے تھے۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ تھی۔

”تب میں نے ان کو اطلاع دی کہ میں کبونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر ہو چکا ہوں۔ یہ سن کر ان پر سی گر پڑی۔“

”آئی ڈبونت ملیم ہم۔“ آواز نے کہا۔

”مجھے ان کو صدمہ پہنچاتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ مگر میں نے نرمی سے ان سے کہا کہ میں : ڈ مجسٹریٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان کا خاندان داما دین کران کی ریاست سنبھالوں گا۔ بلکہ میں جو کو لے جا کر اپنے پھونس کے مکان میں رکھوں گا۔ آخر آپ کی بہن بھی تو اسی محل سے رخصت میرے باپ کے جونیئر سے میں گئی تھیں۔“

”ماموں جان بھونچکے ہو کر مجھے تنگ لگے۔ پھر غم و غصے سے تھر تھر کانپے۔ انھیں یقین نہ کہ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو پارٹی کارڈ دکھایا ! دررسان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ راستہ اپنے لئے منتخب کیا ہے۔“

”عمر بھر میں پہلی بار میں نے ان کو طیش کے عالم میں دیکھا۔ وہ یک لخت اپنے مرحوم جدادری بار کی تصویر بن گئے، انھوں نے گرتا کر کہا : شک حزام، احسان فراموش، کسان کی اولاد، ملانے کا چھ تیرا مستقبل میں نے سنوارا، درنہ آج ہل چلا رہا ہوتا، دھان کے گٹھے ڈھور رہا ہوتا۔ مکتب میں بچے پڑ رہا ہوتا بد بخت !“

”میں نے دبی زبان سے کہا : ”دھان کے گٹھے تو میں اب ڈھوؤں گا ماموں جان !“

”مگر وہ اسی طرح گرجتے برستے رہے۔ اور مجھے خیال آیا کہ میرے نانا جان مرحوم کے لکھے ہوئے اسی قسم کے میلو ڈرائیٹک نالک، پچاس برس قبل از چند منزل کے جلسہ گھر میں اسٹیج کئے جاتے ہوں کون کہتا ہے ہمارا ہندوستانی تھیٹر زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔“

”تین دن تک گھوم، ہنگامہ مچاتا رہا۔ ماموں جان نے ہر طرح مجھے سمجھایا۔ روئے گائے۔ مگر

اپنی عزت کا، اپنی لڑکی کی زندگی کا واسطہ دیا۔

”آپ اس کے روادار ہیں کہ آپ کی لڑکی گھٹ گھٹ کے مر جائے، مگر آپ اس کا ہاتھ ایک ٹکٹ کے ہاتھ میں نہ دیں گے۔ میں نے کہا۔

”دہریہ، کنکال، باغی، جیلوں میں سڑے گا۔ بار بار پھرے گا۔ روزِ شعی از سرِ نفعام۔ اور وہ — (سچ پوچھو آتما جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو مجھے ان پر پیار آگیا) میں اپنی نازوں پر اتیرے پلے باندھ کر اس کی قسمت بھوڑ دوں۔

”غرضیکہ نہ وہ مانے، نہ میں مانا۔ مانی جان کو اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے۔ گاد دی زچھتے کترنے لگا۔ ماموں جان نہ اس کو حکم دید یا تھا کہ کچھ سے بات نہ کرے، شادی کی تیاریاں نہ ہوئیں۔ ارجمند منزل پر بڑا بھیا نک سناٹا چھا گیا۔

”ماموں جان نے ایسا بندوبست کیا کہ شادی کی تیاریوں کی یا رشتہ ٹوٹنے کی خبر ارجمند سے باہر نہ نکلے۔ ویسے بھی اس وقت تک ماموں جان نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ مانی اور قی کے علاوہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ زمینداروں کے ہاں شادی بیاہ کے معاملات میں بہت رازداری برتی ہے۔ در نہ کنٹیاں اور مشاطائیں اور مخالف زمینداروں کے حالی موالی رشتہ تڑواتے ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے۔ اور یہاں جہاں آزار کے اپنے ماموں یعنی کشتیہ کے رئیس اعظم اپنے بھیل صاحب کو بے تحاشے بیٹھے تھے۔ بہر حال۔ ڈھاکہ میں اس میلوڈرامہ کی خبر زیادہ نہیں پھیلی۔ جہاں آزار خود مر سے شرمیلی اور تھوڑی سی گھٹی لڑکی تھی۔ اس نے بھی اسکول یا کالج میں میرا تذکرہ کسی سے نہ کیا تھا۔ اسی وجہ کو اتنے برسوں اس کے ساتھ پڑھنے اور اس کی دوستی کے باوجود یہ بات معلوم نہ ہوئی۔

”مجھ میں سمجھتا ہوں، اب لےج بھی ہیں منگوالو، میرا تو داستانِ امیر حمزہ سناتے سناتے سوکھ گیا۔“

”کہے جاؤ۔ میں پانی منگواتی ہوں۔“

”بس میں حسب سابق اپنے پرانے کمرے میں ٹہرا ہوا تھا۔ جہاں آزار کا خیال کر کے میرا دل لٹ جاتا۔ وہ میری لندن سے واپسی کے بعد دستور کے مطابق مجھ سے سخت پردہ کر رہی تھی۔ پنہ کمرے میں یوں بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ ٹریجڈی ہوئی۔ اس کی دونوں بہنیں بوکھلائی بوکھلائی میرے

پاس آکر کہیں۔ آپا روتے روتے نیم جان ہو گئی ہیں۔ آپا کی آنکھیں سوچ گئی ہیں۔ آپا ان تین دنوں میں آدمی رہیں۔ کہاں وہ دہن بننے کے لئے مایوں بیٹھی تھیں اور کہاں یہ خوفناک المیہ۔ روتی بھائی۔ خدا کے کو مرنے نہ دیجئے۔ یہ سب سن سن کر میرے حواس باختہ ہو جاتے۔

”چوتھی رات میرا آخری فیصلہ سننے کے بعد کہ میں اپنی سیاسی زندگی ہرگز ترک نہیں کروں گا جان نے مجھ سے کہا، تو آج سے ارجمند منزل کے دروازے تمہارے اوپر بند ہیں، اتنا کہہ کر وہ بھوٹ کر رونے لگے۔

”چند منٹ بعد انہوں نے ————— بڑے چالاک میں میرے قمراموں ————— بلیک میل کے لئے ایک چال چلی۔ اس وقت مجھے ایسا خیال ہوا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہ خلوصا دل سے ایسا کہہ رہے تھے، مگر جوانی کی اگر اڑا اور اپنے اصول پرستی کے زعم میں ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہمارے بزرگوں کے بھی جذبات ہیں۔ ان کی بھی اندرونی جذباتی زندگی ہے، انھوں نے بھی شکستہ دلی کار ہے۔ ————— ماموں جان مجھ سے کہنے لگے: ”میتھ مرگئی، تم اس کی نشانی تھے تم نے مجھ ساتھ یہ کیا، اتنا کہہ کر وہ ذرا دقت سے اپنی کرسی پر سے اٹھے، اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

”امی کے مرنے کا غم تازہ تھا۔ میں بھی بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوں۔ لپٹا پنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اور انجم آرا کو بلا کر امی سے کہا اپنی آپا سے کہو رات کو باہر تالا آجائیں۔ مجھے ان سے بعد ضروری بات کرنی ہے۔ انجم آرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً اوپر دوڑی گئی۔

”رات کو جہاں آرا مجھے تالاب کے کنارے ملی۔ میں نے تین سال بعد اسے دیکھا۔ تین سال اسے لندن سے خط لکھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ مگر زیادہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا وہ ہونے والی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے لئے کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس سے ملنے کوئی جنوں خیز عشق نہیں تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا۔ بچپن سے ہم اکٹھے بڑھے تھے۔

لئے ایک پرسکون سی چیز تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا کہ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، کہ میں ہوں۔ کیسی کٹھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے کنوئیں میری منتظر ہوگی۔ اور اب وہ میرے سامنے موجود تھی۔ میری امی کی طرح حتی دستا کی ایک اور تھم میں اس کے سامنے گونگا سا ہو گیا۔ وہ تالاب کی سیر بھی پر بیٹھ گئی۔ انجم آرا، مہر آرا اور مالا ملازمہ پر

ادھر چوکس تھیں۔ اگر ماموں جان کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو نہ جانے وہ ہم دونوں کا کیا حشر
 -خیر۔ تو میں نے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے ؟
 ”تم لڑکیوں کو بھگا کر لے جانے کی تجویز کرنے میں بہت اکیسپرٹ معلوم ہوتے ہو !“ اوما
 کاٹی ۔

”میں نے اس سے کہا، میرے ساتھ جھونپڑوں میں رہے۔ روکھی سوکھی کھائے اور یہ یاد رکھے
 ب فخر الزماں چودھری کے نو سے کی نہیں بلکہ مولوی برہان الدین احمد کا شکار کے لڑکے کی بیوی ہے“
 ”بالکل ایسی ہی بات تمہارے آبا نے تمہاری امی سے کہی تھی“ اوما نے کہا۔
 ”ہاں۔ عجیب بات ہے نا۔ مگر جہاں آرا میں اپنے والد سے اتنی بڑی بغاوت کی
 تھی۔ وہ بیٹھی ہچکیوں سے روتی رہی، اور میں اسے اسی طرح روتا جھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ارجمند منزل
 آگیا۔“

”چند روز بعد ہی مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اور وہ سارا قصہ خواب و خیال ہو گیا۔“
 ”اور اس کے فوراً بعد تم نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ رے مرد کی ذات“
 ”اب اجازت ہے؟ دوپہر ہو گئی“

”ابھی نہیں۔ تمہاری بہن پڑھ رہی ہے؟“
 ”نہیں، میں کتنا چاہتا ہوں، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ مگر رات بوقت امی کے انتقال کے
 بھالنے میں جٹ گئی۔ اگر مجھے کبھی ڈھاکے آنا ملا تو مکان لے کر اسے یہاں بلا لوں گا۔ اگر میں آبا
 ، دلا دلوں کو وہاں پر دے کا مکمل انتظام ہے تو آبا شاید علی گڑھ گزرا کالج بھی بھیجے کو تیار ہو جائیں۔“
 وہ ہنس پڑا۔ ”آبا کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں دہریہ — دہریہ ہو گیا ہوں تو ان پر آسمان گر پڑے۔
 جب بھی گاؤں جاتا ہوں، تو باقاعدہ آبا کے ساتھ جمہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں۔“
 ”اوہ ————— ہاؤ فنی —————“ اوما نے زور سے تہقہہ لگایا۔

نہ جانے کیوں ریمان کو اوما کا یہ تہقہہ ناگوار گزرا، وہ نظریں اٹھا کر باغ کو دیکھنے لگا۔
 اوما نے اس کی طویل خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔ ”تمہارا گھر تو بڑا خوب صورت ہو گا۔ آرٹسٹک۔“
 ”ہاں بے حد خوبصورت ہے۔ تمہارے دو ڈیلینڈز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ اس کی پھوس کی چھت

زرد پھولوں کی سیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سامنے سبزی باڑی ہے۔ اور گھنی، سرسبز بنسلی۔ پیچھے ہا کنول کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے کنارے سپاری اور ناریل کے سڈول درخت کھڑے ہیں گاڑیاں رکتی ہیں۔ پچھلے برآمدے میں پانگی رکھی ہے۔ ندی پر آبائی ناؤ بندھی رہتی ہے۔ اسی کو کچھ آبپار کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے جاتے ہیں۔ ناؤ ہی میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ان کی اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں جانتے۔ اُمّی بتاتی تھیں کہ یہی نوکا کھیٹے وہ ار زاد بھائیوں کو پڑھانے اپنے گاؤں سے نواب نور الزماں کی دیہاتی حویلی جایا کرتے تھے۔ کیسا نہ تھ لوگ۔ آبپاری میں عربی حرفتیں چار مرتبہ ہی موڑ میں بیٹھے ہیں۔ جب میرا داخلہ سکول میں کرانے ڈھ تھے اور ساموں جان کی ٹوک ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔

”اور پھر ہمارا گاؤں۔ کسانوں کے خوب صورت جھونپڑے۔ گاؤں کا قول۔ کالی باڑا مند۔ مجمع گھر۔ چوپال۔ بازار۔ منڈی۔ برگد کے تلے گھاٹ۔ درگاہ۔ میرا گاؤں ترین گاؤں ہے اور میرا گھر دنیا کا حسین ترین گھر۔ کبھی میں تم کو اپنا گھر لے جا کر دکھا اور دیہالی کو۔“

”اور قبرستان جہاں اُمّی کی قبر ہے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اُمّی اتنی کم عمر تھیں۔ وہ مجھ سے صرف سترہ برس بڑی تھیں، اور یہ بہن معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج زندہ ہوتی تو تم سے بھی زیادہ بڑی نہ لگتیں۔۔۔ یعنی مرتبہ تم جھلک سی دکھائی پڑتی ہے۔ خصوصاً جب ڈانسی ہو۔۔۔ تو بالکل اُمّی جیسی لگتی ہو۔“

اُمّی کے چہرے پر کرب اور ناگواری کا بادل گزر گیا۔ جسے ریمان نے نہیں دیکھا۔ وہ اُمّی تو مری گئیں، اب کبیس تم نہ مرجانا اُمّی۔“

”ریمان۔“ اُمّی نے درشتی اور تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب اٹھنا چاہئے۔ تم جا“

”ہاں۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”ابھی جاتا ہوں۔“

”کھانا کھاتے جانا۔“

”نہیں۔ کھانا سر پتہ کے ساتھ کھاؤں گا، اور اس کے بعد۔“ اس نے اٹھ کر طویل ہوئے کہا۔ ”ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری سے سیاسی گفت و شنید۔ کل شام لیگ آ

ی سے ان کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے کا پوائنٹمنٹ کروایا تھا۔ ابھی سرسید کے ہاں بیگم بازار
- بھاگتا ہوں۔ -

وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

”ارجمند منزل جاتے ہوئے گرد تو نہیں لگ رہا؟“ ادا نے پیچھے سے آواز دی۔ ”اگر وہاں ٹھکانا
نہ بچھے فون کر دینا۔ تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گی۔“

”یو آر نوٹ مینگ ویری فنی ادا۔۔۔“ ریکان نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
ادا کھوکھلی سی ہنسی ہنسیں ادرمیز پر بیٹھی کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہیں۔ پھر سیزر کو بلانے کے لئے
اتر گئیں۔

۲۷

جہاں آرا بیگم

اس وقت ارجمند منزل پر ایک سخت ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے ماگو ان کے جھرمٹ میں چھپے
ادوگر نے چپکے سے کوئی منتر پھونک دیا ہو۔ اور چرند پرند، شجر حجر، انسان سب سکے میں
ماتیں۔

جہاں آرا اوپر کی منزل پر پچھلے برآمدے میں حق کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھی نوزائیدہ بھتیجے کے
سے بن رہی تھی۔ اور اپنے پاؤں جنگلے کی بھلی جالی میں اٹکار رکھے تھے۔ جنگلے کی سلاخوں میں سے اس نے
بلک دیکھی جو سوچ میں ڈوبے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر لیگ آفس کا بہاری کلرک
نزدیک پہنچا اور آرا اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

بادرچی خانے میں جا کر دعوت کی دلیوں کا معائنہ کرنا ہے۔ پلاؤ دم کروانا ہے۔ شاہی ٹکڑے تیار
ہیں۔۔۔ دلہن بھابی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہیں۔ امی حسبِ معمول اپنے کمرے میں صاحب
ہیں۔ جانے ان کو اختلاج کے درد سے اتنے کیوں پڑتے ہیں۔ آبا تو ان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ امی

”دونوں — کیا کہہ رہی ہے؟“

”اللہ قسم۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باہر بیٹھے ہیں۔“

”باہر تو روزی اور دیپالی کے بابا آئے تھے۔“

”وہ تو کبھی کے چلے گئے۔ ابھی بشیر چائے کی تریں لے کر باہر گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا، تو میں ماگی گئی۔ باغ والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ سرکار اور روٹو میاں دونوں دفتر میں بیٹھے ہیں۔ دروازے دونوں جنوں میں مسکوت ہو رہی ہے۔“

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

”جھوٹ مت بول، مالا کی بچی۔“

”اللہ رسول کی قسم، چن کے دیکھ لیجئے۔“

”دونوں میں بڑی سنجیدگی سے باتیں ہو رہی ہیں؟“

”ہاں بی بی۔“

کیا دعائیں کامیاب ہو گئیں؟ دعائیں۔ غازیں، وظیفے، اللہ اللہ۔

وہ آؤں اور سلامیاں میز پر ڈال کر جلدی سے اٹھی۔

”ٹھہر۔ مالا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟“

”نیرمیاں سوٹ لے کر باہر گئے ہیں۔ چلے۔“

وہ مالا کے ساتھ زیر اثر کرکھانے کے کمرے میں پہنچی، جو کتب خانے سے ملحق تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ عموماً بند رہتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر زیر آنکھ جادی۔

وہ عین سامنے بیٹھا تھا۔ بڑی میز کے اس طرف، بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہی شکل، وہی آنکھیں، وہی بات کرنے کا انداز۔ مقابل میں آبا پیٹھے تھے چہرہ چٹان کی طرح سخت، درمیان میں نا اور چائے کی کشتی۔ خالی پیالیاں۔ اے اللہ۔ مجھے معلوم ہوتا تو کشتی سجا کر بھیجتی۔ اس سے کان لگا دیتے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جی ہاں۔ میں کامیڈ جوشی کو مفصل بتا دوں گا۔“

آپا نے عینک ماتھے پر چڑھائی اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ”جلد صاب

کے نکات :-

اس پر بجلی سی گری۔ وہ اس کے متعلق نہیں اس نامراد سیاست کے متعلق "مسکوٹ" کر رہے ہوئے بولتے آبا نے سراٹھا کر سامنے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہو مالا نزدیک ہی گیسری کے صدر دروازہ پر چوکس کھڑی تھی۔ اس نے وہاں سے اشارہ کیا "بیٹھی رہ۔"

وہ پھر کواڑ سے لگ گئی۔

اب آبا کا غڈ سمیٹ رہے تھے، وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"اندر جا کر اپنی مانی کو دیکھ آؤ، بہت علیل ہیں۔ آبا ذرا رکھائی سے کہہ رہے تھے مجھے ہے، مجھے معلوم ہے۔ آبا کی یہ سردہری مصنوعی ہے۔ آبا کی خود داری کی وجہ سے ہے۔ آبا انھیں چاہتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

اللہ، اب بھی ان کا دل نرم کر دے۔ آبا کا دل بھی نرم کر دے۔ اللہ۔ آبا ان سے میرے لئے بات کر لیں۔ مولا معجزہ دکھا دے۔

"نیرامیل کہاں ہیں؟" ریمان پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔" نواب نے جواب دیا۔

آبا انھیں رات کی دعوت کے لئے ہی روک لیجئے۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس نہ چہ دیکھئے۔ آبا پلیر۔

"مانی جان ————— اپنے کمرے میں ہوں گی؟"

"ہاں ہاں۔ وہیں ہوں گی۔"

"اچھا ماموں جان۔ خدا حافظ۔" اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور بڑ

دب سے جھک کر آبا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "میں دلی سنجے ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں کو ٹھیکٹ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

”آداب عرض مامول جان“

”بچتے رہو۔“

وہ فائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں سے مالا نے اشارہ کیا جہاں آرا سرعت سے ڈائینگ روم کے پھلے دروازے سے باغ میں اتر گئی۔ اگر کہیں بڑھ بیڑ ہو جاتی۔ گیلری میں سے جانا چاہئے تھا۔ ضرور بڑھ بیڑ ہوتی، اور پیچھے سے آتا آتے۔ تو کیا ہوتا؟ آتا کا حکم ہے کہ اگر کبھی بھی دو اور جہند منزل آئے تو جہاں آرا کا اس سے سخت پردہ کر لیا جائے۔ وہ تیر کی طرح پھوٹا پے پہنچی۔ اور لمبائی کا پتی سنان تالاب کے کنارے شکستہ ”راج سنگھاسن“ پر دھم سے جا کر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد مالا دبے پاؤں درخت کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ ”میں نے اندر جا کر تھانکا تھا۔ رو تو میاں بیگم صاحب کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ بے سدھ، وہ باہر نکلے۔ اب جانے کدھر سے۔“ ایک تخت وہ چُپ ہو گئی۔

وہ پھلے برآمدے سے اتر کر باہر جانے کے ارادے سے تالاب کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس کا چکر ہٹ کر باغ کی سڑک سامنے کے پھانک کی طرف جاتی تھی۔

پھر وہ عین اس کے مقابل میں آن کھڑا ہوا۔ رنگین تخت کے پاس۔ بالکل اسی طرح، جیسے اس روز خواب میں آیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا۔

بارش شروع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سیمل کے نیچے آگیا۔

اور تب اس نے جہاں آرا کو دیکھا۔

”ادھ ہلو۔ ہلو جہاں آرا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”آداب رو تو بھائی۔“

کوئی بھونچال نہیں آیا۔ زمین نہیں ہٹی۔ قیامت نہیں آئی۔ وہ اس کے سامنے موجود ہے۔ س رات، چار سال قبل وہ اسی جگہ سے اسے خدا حافظ کہہ کر گئے۔ روتا بلکتا جھوڑ کر گیا تھا۔ اب سامنے وجود ہے۔ اور اس سے بات کر رہا ہے۔

مالا چپکے سے کھسک کر درخت کی ادٹ میں ہو گئی۔

”آپ کب آئے رو تو بھائی۔“ مضبوط، پرسکون آواز۔

”ابھی تھوڑے دن ہوئے۔“

”آج کل کہاں رہتے ہیں۔“

”بمبئی — تم۔ تم اب کس کلاس میں ہو؟“

”میں نے کالج چھوڑ دیا۔ کافی دن ہوئے — بھو بھاجان کیسے ہیں۔ آپ شو ناپور گئے تھے؟“

”ہاں۔ ٹھیک ہیں۔“

”اور رالہ؟“

”وہ بھی خیریت سے ہے۔ اچھا جہاں آرا اب ہم چلیں۔ بارش تیز ہو گئی تو مشکل ہو جائے

گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔“ اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ آیا، اتنے برسوں، اتنی رات دن کی دعاؤں کے بعد، اور دو منٹ میں چلا گیا۔ مگر دنیا وی

ہی موجود تھی۔ درخت، پرندے، آسمان، زمین، بادل۔

مالا پیڑ کے پیچھے سے نکلی۔

وہ ہونقوں کی طرح مالا کی شکل نکلے لگی۔

”بی بی اندر چلے۔“

اور تب جہاں آرا نے تخت پر زور کا مٹکا مارا اور دہری ہو گئی۔ ”کیوں آئے تھے مالا۔ کیوں

آئے تھے، جب میں ادھر بیٹھی تھی، تو کیوں آئے تھے۔ یہ صے کیوں نہیں چلے گئے۔ تجھے معلوم ہے مالا

کیوں آئے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟“

”اٹھو بی بی۔ اٹھو۔“

”کیوں آئے تھے۔“

”بی بی پاگل مت بنو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ توبہ۔ توبہ۔“

اس نے جلدی سے آپکل سے اپنا چہرہ لو پٹھا۔ شاید مجھے ہسٹریا ہو جائے گا، اس نے لرز کر سوچا۔

اتنی کی طرح ————— اختلاجِ قلب کی مریضہ کہلاؤں گی ————— لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔

————— ہنسیں گے ————— اللہ ————— اللہ —————

مالا نے اس کا ہاتھ تھام کر ”راج سنگھاسن“ کے نیچے سے پیٹے ایک منٹ برساتی

لے کو پھلانگتے میں مدد کی۔ پھر بارش کی تیز لہجہ چار میں وہ دونوں، سر پر انچل ڈال کر جھکی جھکی تیزی سے کوٹھی کی طرف بھاگیں۔

۲۸

رونک لانا تیرا نجھی

ستمبر ۱۹۲۲ء کی ابر آلود شام کی نیم تاریکی میں دو آوازیں چین رکھ کے پھاٹک کے ترچھے، نیم لکڑے ستون کے قریب۔

”اچھا بھائی۔ یہ لوتیوں کتابیں۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔ اس پر ہم نے سروجنی دیہی سے دستخط ہیں۔ دیکھو انہوں نے تمہارے لئے کیا لکھا ہے۔“

”کہاں۔ کہاں۔ ۹۔“

”ماچس جلانے کی آواز۔“

”یہ دیکھو۔“

”اوماں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے۔ ہاؤ۔ ان کریڈیٹل۔ آپ کو

ن ملیں؟“

”یہ سب تفصیلات نہ پوچھا کرو۔“

”نہیں بتائیے۔“

”دہلی میں۔“

”اور آپ نے ان سے میرے متعلق کیا بتایا؟“

”کچھ نہیں۔ صرف یہی کہا تھا کہ ایک باؤلی سی لڑکی ہے۔ اس کے لئے اپنی طرف سے اس

ع پر کچھ لکھ دیکئے۔“

”اوماں۔“

”اور یہ لو۔“

”اوہ۔ نوکشی کا تارا ٹھہ! اور یہ۔“

”رونگیہ لانا تیرا بھی۔!“

”اواں۔!“

”مولوی جشیم الدین سے بھی دستخط کروائے بھائی۔ دونوں کتابوں پر۔ اور یہ لو۔“

مولوی منصور الدین کی نئی جلد۔“

”ہیرامونی۔؟ دوسری جلد آگئی؟“

”ہاں۔ مع مصنف کے دستخط۔ اب تم بھی کیا یاد کرو گی۔ کس سوپر انٹلیکچول چاہنے والے

سے واسطہ پڑا ہے۔“

”یاسمین ایک دن کہہ رہی تھی۔ ایک روز وہ اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور نوکشی کا تارا ٹھہ کا

بیلے تخلیق کرے گی۔“

”وہ بھی تمہاری جیسی ہے؟“

”یاسمین؟ نہیں۔ دراصل وہ روزی بیاری کی چلی تھی۔ پھر میری چلی بھی بن گئی۔“

”بس تو پھر اب اللہ اس پر رحم کرے۔ روزی کا حشر دیکھو تمہاری چلی بن کر کیا ہوا۔ اچھا بھی

اب ہم بھاگتے ہیں۔ تمہارے بابا آہی نہیں چلتے۔“

”وہ شاید مترابا لو کی طرف چلے گئے۔ اب پھر کب آئیں گے؟“

”جب بھی تم بلاؤ گی۔ فوراً۔ اچھا۔ اب چلتے چلتے یہ بتا دو کہ کیوں خفا تھیں۔“

”افوہ۔ دن ٹریک مائنڈ۔“

”ہرگز نہیں بتلاؤ گی وجہ؟“

”نہیں۔“

”میں آدھا سے کہے جا رہا ہوں کہ معلوم کر رکھیں۔ ان کو بتا دو گی؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ دہلی میں ڈھاکہ صاف سنائی دیتا ہے؟“

”ہمیں بالکل صاف سنائی دے گا۔ ۲۹ تاریخ شام کے ساڑھے چھ بجے۔ پھر ساڑھے ساڑھے

پھر سوادس، تمہارا ہندوستانی پروگرام کس وقت ہے؟

”سارٹھے سات“

”کیا کیا گا رہی ہو؟“

”ہندوستانی پروگرام میں؟ ‘مائی ری میں تو’ دالا کھین۔“

”سناؤ۔ سناؤ۔“

”یہاں شرک پر۔؟“

”یہ شرک ہے؟ سننا، جنگل بیابان، ہوکا عالم، آہستہ سے گننا۔۔۔“
خاموشی۔

”مائی ری میں تو لیور میو مول۔“

”ہاں۔ ہاں اور آگے۔“

”کوئی کہے چھانے، کوئی کہے چوڑے۔ لیو ہے جنتاڑھول۔“
خاموشی۔

”بھر رک گئیں، ارے گاؤ بھائی۔“

”کوئی کہے کارو، کوئی کہے گورو۔ لیو ہے انکھیاں کھول۔“

”شاہاش بالکل ٹھیک کہتی ہو۔“

”جائیے ہم نہیں گاتے۔“

”کیری آون۔ کیری آون۔ ایڈریٹ۔“

”کوئی کہے ہلکو، کوئی کہے بھارو۔ لیو ہے تراجو تول۔“

تن کا گہنا میں سب کچھ دینا

دیو ہے باجو بند کھول۔“

”اور تین عدد بالو چرماڑیاں بھی۔“

”دل پو شٹ آپ۔“

”آگے۔“

مگر جہاں میرے رنج و راحت کا سوال پیدا ہو وہ سماجی قوانین کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پہلے
ی انھیں اپنے سماج سے کیا سروکار ہے۔ برسوں سے گوشہ نشین بیٹھے ہیں۔

”قواب میں اطمینان سے پردیس جاؤں؟“

”بالکل اطمینان سے۔“

”بھئی واہ۔ کیا چرخ چوں گاڑی چلی آرہی ہے۔“

”کہاں —؟ ارے، ارے بھاگئے۔ پشی ماں آرہی ہیں۔“

”اس وقت کہاں گئی تھیں؟“

”رئیس کو رس کے قریب جو پرانا مندر ہے نا، وہاں ہر منگل کی شام کو کیرتن ہوتا ہے۔“

”تمہارے عبد القادر میاں کس قدر چرخ چوں گاڑی لٹکتے ہیں۔“

”بھاگئے۔“

”ہشت۔ میں ڈرتا ہوں تمہاری پشی ماں سے؟ مگر یہ گاڑی تو ادھر نہیں آرہی۔“

”پشی ماں سیدھی جا کر ڈپوڑھی پراتر جائیں گی۔ تھینک گوڈ۔“

”قواب میں اطمینان سے کھڑا رہوں۔؟“

”نہیں۔ اب بھاگئے۔ تینوں روکے آتے ہوں گے۔ اور بعد میں طرح طرح کے سوال کریں گے۔ نہیں

ن مت جائیے۔“

”بھائی فیصلہ کر لو۔“

”کیا آپ کو فیصلے کرنے مشکل نہیں لگتے؟“

”قطعاً نہیں۔“

”مجھے بھی نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی ہوں۔“

”اب گئی بار میں تم کو شو نا پور لے جاؤں گا۔“

تبسم۔

”کیوں کیا خیال ہے۔“

”سادھو! میں تمہارے گھر ہرگز نہ آؤں گی۔“

”اے اے! — گوری! میں نے تمہارے لئے تالاب کھودا ہے۔ سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندر کی ڈبیا اور پیشوری ساری لاؤں گا۔ ڈھاکے سے سینک کی چوٹیا میں راجہ کا ملازم ہوں۔ تمہارے بالوں سے کھینچتا ہوا لے جاتا۔ مگر کیا کروں عورت کی عزت کرتا ہوں۔“

”بشاش ہنسی۔“

”اچھا سنو۔ روزی کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو مجھے ضرور لکھنا۔“

”بہت اچھا۔“

”اب واقعی چلوں۔ دہنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔ دیکھو میں آدما سے کہے جا رہا ہوں کہ وہ مسیحا غیر موجودگی میں تمہاری دیکھ بھل رکھیں۔ اور تمہارے بابا سے بھی ذرا میری خوب تعریف واریں کر دیں راستہ ہموار کرنے کے لئے۔ اور یہ یاد رکھو۔ آدما فرشتہ خلعت بے مثال لڑکی ہے۔ اس سے بڑھ کر پُرجو دوست تمہیں اور کوئی نہ ملے گا۔ یہ بات میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اچھا اب چلے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کلکتہ۔ دلی۔ بمبئی۔“

”اپنا خیال رکھئے گا۔“

خاموشی، کیلے کی ڈالیوں کی سرسراہٹ — دور ایک کتاب دے جا رہا ہے۔
دور رسوائی گھر میں روشنی جل گئی۔

”سکراؤ — تو ہم روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھیں۔“

ماچس جلانے کی آواز

”اے لودہ لب پائی ہنسی۔ اے لودہ سکرا لے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ سوں سوں؟“

”ہم نے اردو کا ایک حسب موقع مصرع پڑھا تھا۔ بے وقوف۔“

”آپ نے اتنی فر فرار دو کہاں سے سیکھ لی۔“

”بہت لڑکے گیت۔“

”علی گڑھ میں بے وقوف :-
 ”مجھے بھی سکھلا دیجئے ؟ سوں سوں۔“
 ”ضرور سکھلا دیں گے۔“
 ”دور گھنٹے کی آواز۔“
 ”ارے آٹھ بج گئے۔ اب چلوں۔ بائی۔ بائی۔“

آواز باز گشت
 آواز باز گشت
 آواز باز گشت

شرمیلی رادھیکا سانیاں

ڈیر لیٹ دیپالی

میں تم سے دلی معافی چاہتی ہوں۔ اُسے کی اس طوفانی رات اپنی مہم پر جانے سے
 تمہارے گھر آکر میں نے تمہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ مگر ہم سب ایک زبردست قومی کرائس
 گذرے ہیں۔ اور اتنی قربانیاں دے کر محمود انویری آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بنے جیوتی را
 بس نے اتنا مارا کہ انہوں نے حوالات میں ہی دم توڑ دیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے پولس چوکی پر حملہ
 کیا بالکل ہنسی تھی۔ اور صحت جیسے کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے میرے اوپر کوئی فرد جرم نوچا
 نہ گیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تھلے پر سبھ گولے پھینکے پولس نے فوراً گولی چلا
 دی۔ ہجوم پر اشک اور گیس چھڑکا اور بری کوڑی چارج کیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری بائیں
 س میں سخت تکلیف تھی۔ اور میں ہتھکڑی پہنے زنانہ حوالات کے فرش پر پڑی تھی۔ اور باہر شام ہو
 تھی۔ بالکل سناٹا۔ کچھ دیر بعد کچھ سپاہی اندر آئے۔ مجھے پولس کی لاری میں بٹھال کر جیل لے گئے

اور فنانہ وارڈ میں ڈال دیا۔ جہاں پھرتی پھرتی تھی۔ ایک نائٹن میرے پاس رکھ دی گئی۔ باہر کھٹ سے جب میں زور زور سے کراہنے لگی تو ایک بڑھیا دارڈ راندر آئی اور بڑبڑاتی ہوئی پھر باہر نکل گئی۔ بعد حیلر آیا۔ اس نے گنداسا اسٹریچر منگوایا۔ مجھے پھر لوہے کی لاری میں لاد اگیا۔ دو مسلح سپاہی ساتھ بیٹھے۔ لاری چمکولے کھاتی اندھیرے شہر میں سے گذرتی سول ہسپتال پہنچی۔ مجھے اتار کر زمانہ دارڈ کے ایک میسلے سے لوہے کے پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہتھکڑیوں سمیت دارڈ دیکھ کر تنگامر سا ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت زور زور سے مین کرنے لگی۔ اس کا لڑکا بھی چند در قبل اس شہید ہو گیا تھا۔ خیر ڈاکٹر آیا۔ میری مرہم پٹی ہوتی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سپاہی دروازے پر پہرے پر بیٹھے۔ تین دن تک جنرل وارڈ میں رہی۔ مریض عورتیں ہمدردی سے ہر وقت میرے پاس گھری رہتا حکام نے میرا پلنگ ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔

خوش قسمتی سے میری ٹانگ کی ہڈی پر ضرب نہیں آئی تھی۔ مریض البتہ زیادہ چوٹ لگی تھی۔ ہر ڈاکٹر بڑی توجہ سے میرا علاج کرتے رہے۔ رات کو جنرل وارڈ کی عورتیں سپاہیوں کی نظر کا کچھ مجھے بھل دے جاتیں اور ہر طرح میری خدمت کو تیار رہتیں۔ اور میں سوچتی رہتی اس لائق نہیں ہوں کہ میری قوم کے افرو پر اتنا خیال کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ تب ایک روز صبح صبح کمرے میں ایک سیم صاحب داخل ہوئے۔ انگریز اور چھکین اور آہستہ سے کہا۔ ”روزی با“ ادھیڑ عمر کی خاتون۔ چھوٹا سا جوڑا باندھے۔ بھورے بالوں رنگ کا فراک۔ پاؤں میں بھدے بوٹے۔ مس آئیس بارو تھیں۔ اور ان کو دیکھتے ہی باہر بیٹھے سپاہی نے انھیں فوراً اندر آنے دیا۔ مس بارو چارلس بارو کی بڑی بہن ہیں۔ مشنری۔ انہوں نے نرمی سے کہ میرے پاپا پریشان حال مسٹر بارو کے پاس پہنچے تھے۔ اور مسٹر بارو نے فوراً پہنہ کے انگریز بڑے پادری ٹرنک کال کیا تھا۔ جن کے ہاں مس بارو گھر و ملز سے آئی ہوئی تھیں۔ میں چپ چاپ بیٹھی۔ عجیب و غریب کی تفصیل سنائی۔ مس بارو نے اسٹول پر بیٹھ کر مجھے سمجھانا بھانا شروع کیا۔ جیسے جس کے رحم و کرم کی تبلیغ کیا کہ وہ اپنی کشیدہ جھیروں کی ویسی کا منتظر ہے اور یہ کہ اگر میں معافی مانے پر دستخط کر دوں تو مجھے فوراً رہا کر دیا۔ اور جیل کے ڈسٹرکٹ جیسٹرٹ سربکاری حفاظت میں ڈھاکے پہنچا دیا گئے (پینے کے ڈی۔ ایم مسٹر بارو جیساں) میں نے صاف انکار کر دیا۔ مس بارو اٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے روز صبح پھر آئیں۔ ایک بھل،

افلاسک اٹھائے چیرا سی ساتھ (میری یہ نئی شان و شوکت دیکھ کر ہسپتال کے عملے اور پہرے کے سپاہی بہت
بہ ہوئے اور ان کا رویہ بدل گیا) سس بارو نے پھر مجھے اس نرمی سے لیکچر دینا شروع کیا گویا میں کوئی کم عقل لڑکا
ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئیں۔

اس رات زناہ جنرل دارو کی ایک مریضی لڑکی خدیجہ چپکے سے میرے پاس آئی (اس کا باپ کچیری کا مہولی
ر تھا) اور کہنے لگی دیدی ہم سب عورتیں برابر آپ کی صحت سے لئے دو مائیں مانگ رہے ہیں۔ لیکن آپ نے
مائی نام پر دستخط کر دیئے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہ کریں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ خدیجہ۔ تم سب اطمینان رکھو۔ میں ہرگز معافی نہ مانگوں گی۔ اسی وقت باہر پہرے
سپاہی نے ڈنڈا بجایا اور وہ چپکے سے کھسک گئی۔

ایلیس بارو تیسرے روز شام کو آئیں۔ اب کے سے ایک بنگالی افسران کے ساتھ تھے۔ انہوں نے
رفت کرایا۔ مسٹر سین گپتا کے اسٹنٹ، مشر رتی کمار سانیال۔ یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے
جواب نہ دیا۔ مسٹر سانیال نے بھی سس بارو کے الفاظ دہرائے۔ معافو نامے پر دستخط کر دیجئے۔ میں نے
سری طون کروٹ بدلی۔ مسٹر سانیال نے کہا۔ میں کل معافی نامے لے کر آؤں گا۔ کل تک اچھی طرح سچ
کہا۔ ایلیس بارو کو شاید امید ہو چلی تھی کہ میں نرم پڑ جاؤں گی۔ چند منٹ بعد وہ اور مسٹر سانیال واپس چلے گئے۔
چوتھے روز صبح مسٹر سانیال پھر آن موجود ہوئے۔ لیکن ان کے ہمراہ سس بارو کے بجائے ان ہی کے منسلک
اور صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے کون بہنت کمار سانیال ہیں۔ کلکتہ کے ایڈوکیٹ اور جنرل سٹ
انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انٹروی کے معرکے کے بعد کے حالات "کور" کرنے کے لئے کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں۔

یہ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ ایک سرکاری افسر اس قسم کے انٹرویو کی اجازت کس
باز سے ملے ہے۔ مگر یہ اندولن کا بنار مل نہا تھا۔ ہر چیز ممکن تھی۔ کچھ بت نہیں کون ہمارا ساتھی ہے کون دشمن۔
رتی کمار سانیال مسکرا رہے تھے۔ مسٹر بہنت کمار سانیال اب تک بت کی طرح بیٹھے مجھے تلکے جارہے تھے۔
ایک دم گھبرا گئی۔ میرا حلیہ بھی کیا رہا ہو گا۔ اس وقت مانتے پر پٹی بندھی۔ سر جھکاؤ نہ پھاڑ۔ جیسے برسوں کی ردگی
ت آٹھ دن سے آئینہ تک نہ دیکھا تھا۔ بھنے بڑا غصہ آیا۔ یہ انٹرویو کی کیا تک ہے اور میں کون سی اتنی بڑی
بہروں ہوں۔ میری جیسی ان گنت لڑکیوں نے کیس زیادہ بھاری سے یہ اندولن چلایا ہے۔ میں تو پولیس کی
لاٹھی سے ہی چکر لڑ کر رہی۔

خیر۔ تو بسنت کمار سانیاں نے مجھ سے چند عام سے سوالات کئے۔ کہاں پڑھا ہے۔ تحریک می سے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منشا کر کے دونوں باہر میں نے چونکہ معافی مانگنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اور میری ٹانگ اور سر کے زخم ٹھیک ہو اس لئے دس روز بعد مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولس گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور دوبارہ جیل پہنچا دیا گیا۔ اس روز رات بھر زندہ وارڈ میں رت جگا رہا۔ مرضی لڑکیاں چپکے چپکے قاضی نذر الاسلام کے گئے رہیں صبح کو جب میں اپنے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی بہت ساری مرضی عورتیں برآمدے میں کھڑی رہی تھیں۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اگر مقدمہ گئے پھینکے گا جرم مجھ پر ثابت ہو گیا تو عمر قید ہو سکتی ہے پلنگ سے لٹا کھٹکتی تھیں وہ بھی زسوں کے چلانے کی پرواہ کئے بغیر کھسکتی کھسکتی وارڈ کے دروازے میں آگئی تھیں۔

چنانچہ میں ڈسٹرکٹ جیل کے زندہ وارڈ میں پہنچی دی گئی۔ کوٹھری میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احسا اس میں داخل قیامی ہوں۔

تھوڑے عرصے کے وقت بسنت کمار سانیاں آن پہنچیں۔ انہوں نے کہا کہ میں قطعی فکر نہ کر دوں گے جسے جہاں لکھتے نامور بیرسٹر ہیں۔ اگر مجھ پر مقدمہ چلا تو وہ پیروی کریں گے۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے اتنی پریشانی کیوں اٹھا رہے ہیں۔ وہ ایک دم ہنسے لگے۔
تھوڑے مختصر کرتی ہوں دیپالی بسنت کمار سانیاں روزانہ شام کو جیل آکر مجھے قانونی صورت حال بتا کرتے رہے۔ اشترو دی کے سر کے کے بعد ہم بیٹالیس لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا۔ سندھ اور دوسری لڑکیاں کشتیہ جیل بھیجی جا چکی تھیں۔

اب دیپالی غور سے سنو۔ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ بسنت کمار مجھے بیدار پسند کرنے لگے ہیں۔ اسی سے وہ جو صرف دو روز کے لئے پینہ آئے تھے آج ایک مہینے سے یہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ صبح تھا کہ قومی میری مدد کرنا چاہتے تھے مگر اور بھی تو اتنی لڑکیاں جیلوں میں بھردی گئی تھیں صرف میری مدد کیوں؟ اس جواب میں انہوں نے کہا۔ کہ ان سب لڑکیوں کے گھر والے ان کے لئے دوڑ دھوپ کوں گے میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ (میں ان کو باپ کے متعلق بتا چکی تھی) مگر مجھے لگتا ہے یہ بھی گپ تھی۔ دراصل ان کو مجھ سے عشق ہ تھا۔ نوائٹ فرسٹ سائٹ گپ نہیں ہے۔

ایک روز وہ خوش خوش آئے اور کہنے لگے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کیا جاسکتا ہے میری ضمانت کون دے گا۔ میں نے کہا۔ اس کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ دراصل دیپالی میں نے اپنے تیار کر لیا تھا کہ ایک نامعلوم مدت تک جیل میں پڑی رہوں گی اور پاپا میرے غم میں روتے روتے اندھے بن گئے یا مر جائیں گے۔ (ایس بارو ہسپتال کے بعد ایک مرتبہ جلی بھی آئیں تھیں۔ مگر میرے ارادہ کی مضبوطی یہ لگا کر دوبارہ نہ آئیں۔ گارو ہلز واپس چلی گئیں)

دوسری صبح دروازہ کھلا۔ جیلر نے اندر آ کر کہا آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ ضمانت سٹر لٹنٹ لکار سانیال ابھی۔ میں بالکل ہی بھونچکی رہ گئی۔

جیل کے پھاٹک پر لٹنٹ لکار اپنے بھائی بھادج رتی اور رنجنا سانیال کے ساتھ موٹر لے کر منتظر تھے۔ اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ رتی لکار سانیال کی کوٹھی سول لائنز میں تھی۔ وہاں پیچ کر افوہ دیپالی۔ مجھے ایسا لگا۔ زنانہ جیل اور ہسپتال کے زنانہ جنرل وارڈ کے بھینانک، افسردہ ماحول کے بعد یہ دوسری دنیا معلوم۔ میں نے سوچا۔ میں خوش قسمت ہوں۔ میں جو اکثر اپنی اپنی کالج کی محدود سی زندگی سے شاکم رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسی دنیا میں بیشتر انسان کتنی تکلیفوں میں زندہ رہتے ہیں۔ کیسی کیسی ذلتیں۔ ذلتیں اٹھاتے ہیں۔ مجھے وہ سب زنانہ جنرل وارڈ کی غریب، میلی کچیلی لیکن باہمت عورتیں یاد آئیں۔ مجھے یہ چلا کہ ہماری جنتا، ہماری عورتیں واقعی کتنی پیاد رہیں۔ کیسی پیاد رہی سے زندہ رہتی ہیں۔ سی پیاد رہی سے مرنے ہیں۔

اتنے دنوں بعد اچھے سے غسل کرنے میں اچھی طرح نہائی۔ صاف ساری پہنی۔ میز پر بیٹھ کر کھانا یا۔ اور برابر یہ احساس رہا کہ وہ دنوں کو زندگی کی یہ بنیادی آسائشیں ہی میسر نہیں۔ یہ احساس پچ پچ پہلی بار ہوا۔

شام کو ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ لٹنٹ نے مجھ سے کہا۔ کل روانگی ہے سنا۔ (میرے پاس سامان ہی کہاں تھا، جو ساری پہن کر میں ہم پر گئی تھی وہ خون میں تر ہو چکی تھی۔)۔ ل میں انہوں نے ایک جگہ اسار دپ پہننے کو دیدیا تھا۔ مجھے وہ روبر بہت چبھتا تھا بے چاری خدیجہ مجھے اپنی ساری اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننے کو دیدیا تھا۔ روزانہ وہ اپنی ایک ساری دھو کر سکھا کر مجھے کو دیتی۔ وہ خود بہت غریب لڑکی تھی۔ ایک سماج چیر اسی کی بیٹی۔ دوسری عورتوں نے بھی مجھے اپنی ساریا

پہننے کو دیں۔ یہ سب مجلس عورتیں تھیں۔ دیپالی۔

”سامان میرے پاس کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ”بالکل عادتاً منہ سے نکل گیا۔“

”میں روزی کو کل بازار لے جاؤں گی۔“ رنجنا بولیں۔

”میں ان کے بازار میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے گی تو —“ بسنت بابو نے کہا شروع کیا۔

”کلکتہ کیوں —؟“ میں نے ان کی بات کاٹی۔

”کلکتہ اس لئے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔“ بسنت بابو نے جواب دیا۔

اسے ویمنز میگزین رومانس، طوفانی محبت، سنڈیلا اسٹوری وغیرہ وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ اپنا تاج

تو بہر حال یہ بتا رہے کہ اس طرح کے واقعات زندگی میں یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے پایا کا غیظ و غضب، یہ انوکھی، پرخطر صورت، ہر چیز نظر انداز کر دی۔

سول میرج کے لئے عدالت جانا پڑتا۔ اور نئے قصبے اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ دوسرے روزات کو چپکے۔

پینڈت کو بلایا گیا۔ ٹیکل ٹھکانا تازہ برہمن۔ ڈرائنگ روم میں بھیرے پڑے۔ باقاعدہ۔ میرا نام رادھیکا رکھا

گیا۔ بسنت نے مجھے بتایا کہ بنگالی دشمنی موت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کا تھوڑا ہے۔ کوئی ایسا

مذہب دوزہب سب میرے لئے معنی بات ہے۔ چرچ کا پادری چند الفاظ دہراتا۔ پینڈت نے بھی

اسی طرح کچھ ممبوجمبو کہہ دیا۔ اصلی چیز محبت ہے۔

تین روز بعد ہم لوگ کلکتہ آ گئے۔ بسنت کی کوٹھی بالی گنج میں ہے۔ بیچرا علی خاندان۔ ان کے بابا کلکتہ

کے مشہور سرجن ہیں۔ بڑے بھائی بیرسٹر۔ بسنت کی بھابھی بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری نند۔ بر بورن کالج میں کیمسٹر

کی لیکچرر ہے۔ بڑا روشن خیال اور کلچرڈ خاندان ہے۔ میرے سسر اور جیتھ نے جو بڑے جو شیلے قوم پرست

ہیں فخر سے میرا سواگت کیا۔ لیکن ساس اور کہنے کی دوسری بڑی اہلیاں اس شادی سے خوش نہیں ہیں

کیونکہ بہر حال میں عیسائی ہوں۔ اور ایک گناہم غریب پادری کی لڑکی۔ مگر یہ لوگ اتنی شائستہ ہیں کہ اپنے کسی

رویت سے اپنی ناخوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بسنت کمار مجھے کتن چاہتے ہیں۔ یہ ایک

سید Sophisticated خاندان ہے۔ امارت کے خاندان جیسا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میری

ساس اور دوسری بوڑھی خواتین میرے برتاؤ سے خوش ہو جائیں گی۔

ہماری کوٹھی سرپری توش رائے کے بیسے کی کوٹھی کے پڑوس ہی میں ہے۔ میرے جیٹھ ادا بست کی سڑ
بہت دوستی ہے۔ چنانچہ دیپالی اب میں چاں آرا اور ادا رائے والے اس اونچے طبقہ میں شامل ہو چکی
پر مجھے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے اتنا رشک آیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں میں اس سچائی سے تم کو لکھ رہی
اور کو نہیں لکھ سکتی۔

سانیاں بہت دولت مند خاندان ہے اور دیپالی میری ساری عمر سرت میں کٹی۔ اب میں خوش ہوں کہ اس
کی زندگی گزاروں گی۔ روپے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے ہمیشہ تنگی و ترشی سے بسر کی ہو۔ ہماری بلی
زندگی تمہیں یاد ہے ؟

پاپا اکثر اسرار ربانی کی بات کیا کرتے تھے۔ اور ذرا سوچو تو مجھے بست کس ذریعے سے ملے اپنے پرانے
پارس بارلو کے ذریعے ! اگر چارلس بارلو اپنی پسین کو ٹرنک کال نہ کرنا، وہ مجھ سے ملنے نہ آتیں۔ وہ اپنے
ربی بابو کو لے کر آئیں اور ربی بابو کے ساتھ بست کمار لے !

پاپا ظاہر ہے کہ ہندو سے شادی کرنے کی وجہ سے مجھے قطعی معاف نہ کریں گے۔ میں نے بھی ایک
رایک ان کو کتنے عظیم صدمے پہنچائے ہیں۔ کلکتے پہنچتے ہی میں نے اور بست نے اکٹھے پاپا کو خط لکھا۔
اسے ان کی BLESSINGS کی درخواست کی۔ آج صبح ان کا چند سطروں میں جواب آیا ہے لکھا
کہ وہ خداوند خدا کے شکر گزار ہیں کہ میں زندہ بچ گئی اور خیریت سے ہوں۔ مگر میں نے مسوع کا دامن چھوڑ
بہت پرست کافر سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے وہ عمر بھر میری شکل نہ دیکھیں گے۔ اور بلی کا گچ کے دروازے
پر ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ اور یہ کہ وہ میری روحانی نجات اور بخشش کے لئے برابر دعا کرتے رہیں گے۔

اب ختم کرتی ہوں۔ دیپالی۔ بہت لمبا خط ہو گیا۔ ڈائینگ روم میں لچ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب
دن۔ سسرال کا معاملہ ہے بھائی ! پی۔ ایس۔ بست نے تم کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور تم سے ملنے
فت مشتاق ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے پاس کلکتہ آؤ۔

تمہاری

رادھیکا موری سانیاں

بالی گنج۔ کلکتہ۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر بنوئے چند سرکار

بھوتارنی دی نے کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کالے رنگ کی لمبی پھانک پر کھڑی تھی۔ یہ مس صاحب کل بھی آئی تھیں۔ بنوئے گھر پہنچا تھا۔ باہر سے باہر چلی گئی۔ اب آج پھر آئی بیٹھی ہیں۔ بھوتارنی دی نے بیٹھک خانے کے دروازے میں جا کر پردے کے پیچے سے نظر ڈالی۔ ہمان خاتون کو تیوری پر بل ڈال کر غور سے دیکھا اور کھڑا دس پہننے کھٹ کھٹ کرتی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔

ٹوٹو نے جا کر ڈاکٹر سرکار کو ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ”اچھا۔ بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔“ مریض اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سرکار نے چیمپی میں ہاتھ دھوئے اور تولیہ سے کلاسیاں پونچھ بیٹھ گئے۔ اس وقت ہمان بی بی مسز سرکار مرحومہ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”نو مشکار۔ اومادی۔“

”نو مشکار۔ بنوئے بابو۔“ انہوں نے چونک کر کہا۔

”دیپالی تو بولپور جا چکی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

شریں مسکرائیں۔ ڈاکٹر سرکار صوفے پر چپکے بیٹھے رہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ بھوتارنی کے مرنے کے بعد سے آج تک، اس گھر میں، اس کمرے میں، دیپالی اور بھوتارنی کے علاوہ اور کسی عورت کے ہی نہیں آئے تھے۔

اُمانے باتیں شروع کیں۔ سوئل ”اسمال ٹاک۔“ ٹوٹو اندر سے سلامتی بید کی کشتی میں چاہ لے کر آیا۔ بھوتارنی دی نے باقاعدہ چاندی کا سیٹ مقفل الماری سے نکال کر نئی پیالیوں کے ساتھ چائے بھی تھی۔ عمدہ ٹرے کلا تھے۔ جلدی میں ٹی کوزی کا غلات تبدیل کرنا البتہ بھول گئیں۔

”دیپالی تو اسی اتوار کو بولپور گئی ہے۔ اگر آپ جب آگئی ہوتیں تو اس سے ملاقات ہو جاتی۔“

”کیوں بنوئے بالو۔ کیا میں آپ سے ملاقات کرنے نہیں آسکتی؟“
 بنوئے بالو جھینپ گئے۔ ”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں؟“ وہ ذرا سیلف کوئٹھس سے ہو کر میز
 انگلیاں بجانے لگے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے انہیں خواتین سے غیر ضروری ”اسمال ٹاک“
 کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

اُمانے اُن پر ایک محفوظ نظر ڈال کر دیش چندرا آنجانی کے پورٹریٹ کو دیکھا۔ واقعی
 لوں بھائیوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ بنوئے بالو بھی خاصے دلکش تھے۔ یہ آج غور سے
 دیکھنے پر سب سے چلا۔ دیپالی نے اس روز پہلے روز دو دو لینڈز کے مورنگ روم میں ان کے متعلق غلط
 باتیں کہا تھا۔ بنوئے بالو واقعی بہت جاذب نظر تھے۔ اور سید تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بنوئے بالو ان کو پہچاننے کے لئے پچھانک تک گئے۔ واپس
 رخصر مطب میں جا بیٹھے۔

چند روز بعد اُمانا پھر چندر کنج آئیں۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ کوئی پندرہ منٹ تک مطب میں بیٹھیں
 رکھا کل شام آؤں گی۔

دوسری شام وہ دیر تک دیش چندرا آنجانی کی باتیں کرتی رہیں جن کی وہ عقیدتمند اور پرتار
 ہیں۔ پھر شبانی کا تذکرہ چھڑا۔ ڈاکٹر سرکار مرحوم شبانی کے متعلق کسی سے باتیں نہ کرتے تھے وہ
 ان کے نہاں خانہ دل کا ایک ایسا انمول خزانہ تھا کسی دوسرے سے اس کا ذکر کرنا ہی اس کی توہین
 تھی۔ مگر اُمانا نے ایسے خلوص اور محبت سے شبانی کے متعلق پوچھا کہ وہ بے اختیار اس کا تذکرہ کرنے
 لگے۔ اس عورت کو وہ اپنا ہمارا بنا سکتے تھے۔ یہ عورت شاید جانتی تھی کہ مرد دراصل کتنا

HELPLESS ہوتا ہے اور ہر عورت میں شاید اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہے۔

اب وہ شام کے وقت اُمانا کا انتظار سا کرنے لگے تھے۔ تینوں لڑکے اس وقت کھیلنے کے
 باہر چلے جاتے تھے ورنہ اپنے بابا کو براہِ رے میں ذرا اکھن کے ساتھ ٹھٹھا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتے
 رہتارنی دیپالی ان کو بخشنے والی نہ تھیں۔ وہ تو ایسے کسی موقع کے لئے برسوں سے ادھار کھائے
 بیٹھیں تھیں۔ ایک روز انہوں نے بنوئے بالو سے کہا۔ ”سر پر تو ش رائے کی دلایت پلٹ لڑکی میری
 باند سے بھی پرتو ہو گئی ہے۔ اب اسے زیادہ دبدبے میں نہ رکھو۔ بڑھیا ہوئی جا رہی ہے

لاکھوں کا جہیز لائے گی۔ کیوں کھوکھا۔“

”دیدہ۔“ بتوئے بابو نے یک سخت سجدہ سمجھلا کر کہا۔ ”آئندہ ایسی لچر حماقت کی بات نہ کہنا؛ وہ ہونٹ پچکا کر مسکراتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔“

مگر کہاں رہنے والی تھیں۔ دوسری شام جب اودا دیسی آئیں بھوتارنی دیسی نے چھپاک سے اندر پہنچ کر پان پیش کیا۔ اودا دیسی کھڑکی کے پاس بیٹھی ڈاکٹر مرکار کا وہ ذاتی البم دیکھ رہی تھیں جس میں ان کی لڑکپن کا لٹچ کے زمانے، سیاسی دور، شادی اور سنی مون کی تصویریں تھیں۔ اُن کی فرمائش اور اصرار پر بنوئے بابو نے فوراً یہ البم لا کر ان کو دیدیا تھا اور خود کسی کام سے اپنے مطب کی طرف چلے گئے تھے۔

اودا کی بھوتارنی دیسی سے اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان سے بھی بہت گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے پھٹ سے کہا۔ ”اے تم سیاہ کب کر دو گی بٹیا؟“ اسی لمحے ڈاکٹر مرکار کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے انتہائی کوفت اور مذمت سے بڑی بہن کو دیکھا۔ ”دیدہ۔“

اودا بھی صاف جھینپ گئی تھیں۔ لیکن بھوتارنی دیسی نے اطمینان سے جواب دیا ”اے کیوں؟ تمہیں تو اپنی بیٹی تک کی شادی کی فکر نہیں۔ تم کو ان معاملات سے کیا غرض۔ جاؤ۔ تم باہر جا کر اپنے حقے مر لیضوں کا ٹمپر کچر لیتے رہو۔“

اودا دیسی جھجکا کر سر کرنے لگیں۔ اس ہینڈ سٹم، ہٹرمیلے، تارک الدینا ڈاکٹر سے ہلکا ہلکا فٹ کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ بڑی بی نے لے کے پیار سے کہا بالکل ہی شرم سے لال بھبو کا کر دیا۔ بھوتارنی دیسی انھیں اور فاتحہ انداز سے قدم اٹھاتی کر سے سے باہر چلی گئیں۔

”آپ۔ دیدہ کی حماقت کا برا نہ مانئے گا اودا دیسی۔“

”قطعا نہیں۔ میں پرانی نسل کی خواتین کو کیا جانتی نہیں ہوں!“ انہوں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

لیکن اسی رات جب سب لوگ سو گئے۔ نو بھوتارنی دیسی نے سر پٹے کی کارنس سے قدم دوات اتار دیجوں کے کمرے میں رہے پاؤں گئیں اور کھوکھو کی کاپی بگ میں سے چند سائے کا غنڈ بھاڑے اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر اتنی پانتی مار کر بیٹھیں اور بھتیجی کو خط لکھنا شروع کیا۔ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ حرم و عین کر لیں۔ نے لکھا۔ بیٹی۔ بھگوتی اما نے میری برصوں کی پرارتھنا میں سن لیں۔ شاید تمہارے باپ کا گھر بس۔

وادی کے آنے کی تفصیل۔ اودا دی کی محبت اور خلوص۔ (اتنے بڑے باپ کی بیٹی۔ مگر غرور نام کو نہیں)۔
 ٹھوکا کو پسند کرنے لگی ہے۔ کھو کا کا بھی عورت کے معاملے میں میں سمجھتی ہوں اب جا کر شاید دل نرم پڑا۔
 برشتہ مجھے لگتا ہے بہت مبارک ثابت ہوگا۔ کھو کا کے اور تم سب کے دن بدل جائیں گے۔ اب تم ہی سوچو۔
 بھری شادی ہو جائے گی۔ (مات سے پرارتنا ہے تم کو کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ ملے۔ رانی بن کر رہو۔ تم نے میری
 بی بہت مصیبتیں بھوگئیں) لڑکے کا دل چلے جائیں گے۔ رہ گئی ہیں۔ کسی روز بھی میری آنکھ بند ہوگئی تو میرے
 ٹھوکا کا پرسان حال کون ہوگا۔ تو بیٹی خوش ہو جاؤ کہ اودا جیسی امیر اور سمجھ دار ماں ملے گی۔ باقی اس خط
 کھو کا سے ذکر نہ کرنا۔ میں تمہیں بڑے راز سے لکھ رہی ہوں۔

تمہاری بیوی

بھو مارنی دی

ڈاکٹر مسکار کے ایک مریض مترابو مسری قوش رائے کے موکل تھے۔ اور اکثر مطب آتے رہتے تھے۔
 ادہ تراڈے کی خاطر۔ انہوں نے کئی بار مسری قوش رائے کی کار بار دیکھی اور اودا دی کو آتے جاتے
 بھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دیپالی گھر پر موجود نہیں ہے۔ پھر انہوں نے ذرا کرید سے بنوئے بالو سے
 چھا کر کیا آج کل اودا دی اُن سے اپنے درد سر کا علاج کروا رہی ہیں۔ بنوئے بالو صاف گواہ بھولے آدمی
 نے۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسے ہی ملنے کے لئے جلی آتی ہیں۔

مترابو نے فوراً گھر پر جا کر انجی بی بی کو یہ قصہ سنایا۔ مسر مترادوسرے ہی روز دودھ لینے نہ پہنچیں۔
 بی رائے کچھلے برآمدے میں بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں اور اسٹیٹسٹین پڑھتی جا رہی تھیں۔ جب مسر
 ترا سچ چلتی آکر نزدیک کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور نسکا کر لیا۔

”ادہ ہلو اورن دھتی۔“ لیڈی رائے نے مسکرا کر اخبار رکھ دیا۔ اور ان کے لئے کافی بنائے گئیں۔
 ڈی سی رمی گفتگو کے بعد مسر مترادو اس خوبصورتی اور فنکاری سے جو اس قسم کے معاملات میں صرف
 اتین کا حصہ ہے، اصل مقصد کی طرف آئیں۔ ”اودا کی بیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے کافی کا گھونٹ
 رتے ہوئے دریافت کیا۔

”اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ تو جانتی ہیں وہ ہمیشہ سے کتنی زود رنج اور چڑچڑی رہی

ہے۔ لیڈی رائے نے جواب دیا۔

”جیسی تو میں نے پوچھا۔“

”نہیں۔ اب تو شکر ہے کچھ دنوں سے کافی شگفتہ نظر آرہی ہے۔“

”یہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں کوڈاکٹر سرکار کا علاج بالکل جادو کا اثر رکھتا ہے۔“

”ڈاکٹر سرکار۔۔۔؟“

”یہ بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے دے کا علاج کروا رہے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے

ہی کئی مرتباً کوڈاکٹر صاحب کے مطب میں دیکھا تو مجھ سے آکر بولے کہ یہ بڑا اچھا ہوا۔“

”اچھا۔ اُمانے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“

مسز متراب باقاعدہ GLOAT کر رہی تھیں۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ”آپ نے اُن

کا نام تو سنا ہوگا۔ بنوئے چند سرکار۔ وہی جن کی لڑکی دیپالی سرکار ریڈیو پر گاتی ہے۔“

”ادہ۔۔۔۔۔“

”بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ بی بی نوعرہ سہا بر لوک سندھاریں۔ چار بچے ہیں۔ لڑکی بس

دیپالی ہی ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ ان کے بابا سمن سنگھ کے زمیندار تھے۔“

لیڈی رائے قطعاً یوتوت نہیں تھیں۔ وہ مسز متراب اور عندیہ دونوں بھانپ گئیں اور فوراً

ذرا رکھائی اور ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ لیکن مسز متراب کہیں گئیں۔ ”یہ تو بنوئے بابو کو بالکل

دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایسے خاندانی اور وضعدار لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں اور ہمارے پیسے تو وہ تو ہاتھ

کا میں ہے۔“ اس نکتے تک پہنچ کر مسز متراب نے کوئی بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے دس منٹ

بعد کھانا بھر کر بات کو پھر وہیں لے آئیں۔ ”لڑکیوں کی شادی آج کل ایسا کٹھن مرحلہ بنتی جا رہی ہے آخر

کیا کیا جائے۔ میری ماشی ماں کے دیور کی لڑکی بچلی داس گیتا تو آپ کو یاد ہوگی اُمانا کی ہیلی تھی اس کی غمراں

گئی بال سفید ہو گئے وہ تنگ آکر بھاؤان جانے لٹکا یا برمایا کہاں چلی گئی۔ اسکو لڑھکانے۔ اب خیال آنا

ہے۔ بنوئے بابو جیسا کوئی مل جاتا تو بیچاری کی قسمت بن جاتی۔ بنوئے بابو بے چارے اب جا کر کوئی چوہا

پیتا اسی سال کے ہوئے ہوں گے۔ زمیندار کے لاڈ لے بیٹے تھے۔ باپ ماں نے نوعمری ہی میں بیاہ کر دیا تھا۔

یہاں تک پہنچ کر مسز متراب نے سوچا کہ اتنا آج بھر کے لئے کافی ہے۔ اور پھر دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

یڈی رائے سسر مترا کی گفتگو سے کافی پریشان ہو چکی تھیں۔ رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے سر
ری توش سے اس کا ذکر کیا۔ ڈھاکہ بہت چھوٹا اور پرورش قسم کا شہر تھا۔ اودا کی چند رکن جانے
نا خبر اڑتی اڑتی سرری توش تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکار سے واقف تھے۔ اس وقت انہوں نے یڈی
رائے سے کہا: "شکر کو کراتا نے کسی میں دلچسپی لینی شروع تو کی۔"

"اس کا مجھے احساس کھائے جا رہا ہے کہ وہ اکتیس^۳ سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر ایسا بھی کیا۔" یڈی
رائے نے آند دگی سے کہا۔ وہ اب تک اس لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید کوئی ہم رقبہ راماد مل جائے۔ حالانکہ لڑکی اردو
روز زیادہ چڑچڑی اور موٹی اور بھڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ہماری قسمت میں نہ جانے یہ دکھ کیوں لکھا تھا۔ معمولی معمولی
لوگوں کی لڑکیاں ایک سے ایک حسین، نازک، دلچسپ۔ ہماری بیٹی شکل و صورت اور چلنے سے استانی
لمتی ہے۔ باتیں شروع کرتی ہے تو سوائے اس کے ان بے تکے کامریڈز کے، سمجھ دار نوجوان ڈرگور دہاگ جاتے
ہیں۔ کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور یہ اور وہ۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہمارے مصلحین کی شاید ہدایہ
سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بالی گنج کلکتہ میں سرری توش اور یڈی رائے کے اکلوتے فرزند زمیں دیکھ کر رائے کے پڑوس
میں ایک سید دو لقمہ رسائیال خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بیٹے بسنت کمار سے زمیں دیکھ کی بڑی
دوستی تھی۔ پچھلے دنوں جب اودا کلکتہ اپنے بھائی کے پاس جا کر رہی تو وہ نوجوان اس سے بھی ملنے آیا کرتا تھا اور
یڈی رائے کو امید بندھی تھی کہ شاید بسنت اودا میں کچھ دلچسپی لے۔ مگر اس نے بھی ابد اکر اودا کو دیدی کہنا شروع
کر دیا اور پھر وہی کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اودا رائے بھی ذرا سی بھی جو اس میں دلچسپی لی ہو۔ بس وہی
کج بحث ہوگئی اور مارکس اور بسنت نے اس غریب کالے پادری کی حسین لڑکی روز کی سے بیاہ کر لیا۔ غضب خندا کا۔
اور اب ساری دنیا دیکھنے کے بعد یہ بے چارہ بونے چند سرکار اودا کو بھایا ہے۔ چلو۔ واقعی
شکر ہے۔ کوئی تو پسند آیا۔ سرکاری افسر سے شادی کرے گی انہیں۔ کمپوٹ ہوگئی ہے۔ تو ظاہر ہے کسی ایسے
بی نادار آدمی کو چھانٹنے۔

"مگر بنوئے بالو بہر حال خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے باپ زمیندار رویش چندر کو لوگ آج بھی ڈھاکہ
میں بھولے نہیں ہیں۔" سرری توش کہہ رہے تھے۔ یڈی رائے نے گہرا سانس بھرا۔
"ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے۔" یڈی رائے نے سوچ کر کہا۔

”دیپالی — اس کے گانے تو تم بڑے شوق سے سنتی ہو۔ اور ہمارا ترنل اس کے ریکارڈ بڑی لگن سے بکنا لگتا ہے۔ سرسری قوش نے نہیں کر کہا۔

لیڈی رائے خاموش ہو گئیں۔ اور سوچنے لگیں۔ دیپالی کچھ عرصہ بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ مگر کے اپنی ذراہ لیڈنگ ٹھیک ہے۔ بجائے مجبوری اُٹا کے لئے بنوئے بالو ہی بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر وہ آج ہی اپنا عندیہ اظہار کر دے تو بات آگے بڑھائی جائے۔

صبح کو لیڈی رائے نے اُٹا سے ڈاکٹر مرکار کے متعلق گولی گولی الفاظ میں استفسار کیا تو وہ مسکرا کر چپ نہیں۔ لیڈی رائے نے فوراً چپکے چپکے بنوئے بالو کے متعلق مزید معلومات شروع کرادیں۔

ایک روز اُٹا چند رکن گئیں تو ڈاکٹر مرکار سے کہنے لگیں۔ ”دیپالی کے لئے اب آپ کا کیا پروگرام ہے دیپالی — ابھی تو وہ اپنے میوزک ڈپلوے کے لئے ٹھہر رہی ہے۔“

”اس کے بعد؟“

”پتہ نہیں۔“

”آپ کے خیال میں ہے کوئی لڑکا؟“

”نہیں۔ آپ اتنے لوگوں کو جانتی ہیں آپ ہی کوئی تجویز کیجئے مگر آپ کو معلوم ہے میں لمبا چوڑا چیز نہیں دے سکتا۔“

”مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کا اچھی جگہ بیاہ ہو جائے۔“

”جلد از جلد — ابھی دو سال تو اس کے میوزک ڈپلوے میں باقی ہیں۔ پھر اس کی ضد ہے کہ ایم۔ اے کرے۔“

”ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔“

”نہیں۔ جلد ہی وہ اپنے گھر چلی جائے تو بہتر ہے آج کل زمانہ —“

”بڑا غریب ہے؟ بنوئے بالو نہیں پڑے۔“ آپ جیسی ترقی پسند یہ کہہ رہی ہیں؟

”میں آپ کو قدامت پرست سمجھتی تھی مگر آپ شاید کچھ سے بھی زیادہ ترقی پسند ہیں!“

”نہیں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ مگر میں دیپالی کی خلاف مرضی اس کا بیاہ ہرگز نہ کروں گا۔“

”اگر وہ آپ کی خلافت مرضی کرے تو؟“

”وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ بڑی معصوم، سیدھی بچی ہے۔“

آدما ذرا سکرائیں۔ بنوے بابو نے ان کو تعجب سے دیکھا۔

”ہر باب اپنی مٹی کو معصوم سیدھی بچی ہی سمجھتا ہے۔“

”آپ کے والد بھی آپ کو یہی سمجھتے ہوں گے۔“ بنوے بابو نے ہنس کر جواب دیا۔ آدما رلے لاجواب ہو

نیں چند سیکنڈ بعد انھوں نے کہا۔ ”غرض کیجئے۔ دیپالی غیر فرقتے میں شادی کرنا چاہیے۔“

”غیر فرقتے میں؟ آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟“

”بنوے بابو۔ وہ ایک مسلمان لڑکا نہیں ہے۔ کامریڈ ریمان۔ وہ شاید آپ کے ہاں بھی کئی بار آچکا ہے۔“

نے کچھ یونی افواہ سن لی تھی کہ —

”افواہ —؟“ بنوے بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

”بنوے بابو۔ دھاک اتنا چھوٹی سی جگہ ہے۔ افواہیں اڑتے کیا دیر لگتی ہے۔“

”لیکن آپ نے کیا سنا؟“

”کچھ نہیں۔“ آدما نے اطمینان سے صوفے پر پہلو بدل کر عینک اتاری۔ لگائی۔ اور ذرا لمبے پردہ آواز

ماہنے لگیں۔ ”دیپالی پچھلے سال جون میں جب بولسور سے گھر آنے کے بجائے سندربن چلی گئی تھی نا۔“

”سنتھال پر گئے۔“ بنوے بابو نے تصحیح کرنا چاہی مگر آدما دیپالی کے گیس ”وہ سندربن گئی تھی نا۔“

پچھلے سال جون میں۔ ریمان سے ملنے۔ آپ کو تو خیر معلوم ہی ہوگا۔ تب ڈیڑی کے کسی موکل نے صنم کھٹنا کے ایک

لوہے اسٹیشن پر، شاید باگھڑا روٹ پر ریمان کو اسے ٹرین پر سوار کراتے دیکھا تھا۔ ”اچانک وہ سربراہی کے ساتھ

تھ۔ ادھوری جھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ کیونکہ ان کو لگا جیسے بنوے بابو پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ بھونچکے سے

نیں نکلے جا رہے تھے۔

”اوہ — آئی ایم سو سوری۔ بنوے بابو۔ میرا خیال تھا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ آئی ایم سندی —

بز — اوہ —“

بنوے بابو نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہے کا اشارہ کیا۔ ذرا کرب سے ان پر نظر ڈالی اور صوفے کی

نت سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور تیوری پر مل ڈال کر کھڑکی سے باہر

دیکھنے لگے۔

”مجھے افسوس ہے بنوے بابو“ اوما نے پھر کتنا شروع کیا۔ ”میرا خیال تھا آپ خود جانتے ہوں!“
دیپالی بڑی مستانہ بچی ہے۔ وہ آپ سے جھوٹ نہیں ہوتی ہوگی۔

”اُسے جھوٹ بولنا آپ نے سکھایا ہے اوما دی۔ بنوے بابو نے مدھم آواز میں کہا۔
”میں نے۔۔۔ میں نے بنوے بابو۔“ اوما نے نینک اتار کر حیرت سے پوچھا۔

”جس طرح آپ اسے ایک بھتے کے لئے اپنے ساتھ گویا کوتیلے گئی تھیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں
دراصل وہ کہاں گئی تھی۔ یہ سب آپ کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے اوما دی۔“

”مجھے افسوس ہے بنوے بابو۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں۔“ اوما اب ہڑ ہڑا کر کھڑی ہو گئیں
”میں آپ کو پانی لا دوں؟“ بنوے بابو خاموش رہے۔ اوما جلدی سے کھانے کے کمرے میں گئیں۔ ڈولی
رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے سے قبل ایک نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔

شام کا وقت تھا اور درسوئی گھر سے کڑا ہی کی چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکی
باہر عبدالقادر کے سر، گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ اوما گلاس لے کر میٹھک خانے میں واپس پہنچیں۔
بنوے بابو اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اوما تذبذب کے عالم میں دروازہ
کے پاس کھڑی رہیں۔ اتنے میں بھوتارنی دیسی کھڑا ہ میں پہنے کھٹ کھٹ کرنی اندر آئیں۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ انہوں نے بھروسہ جھڑک کر دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ شاید بنوے بابو کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لیجئے۔“ گلاس بڑی بی کو تھما کر
جلدی سے باہر کمرے میں جا بیٹھیں۔ اور گھر روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح اوما پھر چند رکھ پنہیں۔ مطلب کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ بچے اسکول جا چکے
تھے۔ بھوتارنی دیسی عبدالقادر کی گاڑی میں بیٹھ کر بسنے کی جنس لانے بازار گئی ہوئی تھیں۔ اوما نے اندر جا کر
بابو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنوے بابو نے اخبار ہاتھ میں لئے لئے کواڑ کھولا۔

”اوہ۔۔۔ تھینک گوڈ۔۔۔“ اوما نے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“

”رات بھر مجھے فکر کے مارے نیند نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ صدمہ پہنچایا۔“

”میں زندگی میں بڑے سے بڑے دھچکے کو سہارا لینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ مگر میں آپ کا مشکور ہوں کہ
نے مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔“ وہ باہر بیٹھک خانے میں آنے لگے مگر اوما ان کے کمرے میں داخل
ہوئیں۔ انہوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

”آپ تو واقعی بالکل سادہ صوبن چکے ہیں۔“

بنوئے بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اوما نے عینک اتار کر آنکھیں پتھیلیوں سے ملنے رہنے کے بعد کہا: ”بنوئے بابو آپ سے اب صرف

درخواست ہے۔“

”کہئے۔“

”آپ دیپالی پر ہرگز ہرگز یہ دظاہر کیجئے کہ میں نے آپ کو اس کے سنبھرن جانے کا واقعہ بتایا ہے۔“

”آپ کو یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ سمجھ نہیں کر سکتا۔“

”کچھ بھی نہیں کہیں گے؟“ اوما نے حیرت سے دُہرایا۔

”نہیں۔“ بنوئے بابو آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے۔ ”آئیے باہر چل کر بیٹھیں۔“

الی سمجھ دار اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں اس طرح کی کوئی بات کہہ کر اُسے غرور مندہ

ن گاہ؟

اوما ان کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

بنوئے بابو آہستہ آہستہ کہتے رہے۔ ”اوما دیمی۔ شاید۔ شاید ایک غیرت مند باپ کی حیثیت سے

دیپالی کو کال کوٹھری میں بند کر دینا چاہئے۔ اور شاید فوراً کوئی ہندو لڑکا تلاش کر کے اس کی

ی کر دینی چاہئے۔ لیکن اوما دیمی۔“ انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔“

اس اشارہ میں وہ تھکے تھکے سے ہکڑے کا ایک چکر لگا کر شکستہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ ”میں یہ بھی جانتا

اگر وہ اپنی نو عمری کی روایت، آئیڈیلزم، انس سلیمان لڑکے سے محبت، جو کچھ بھی ہو، اس کی وجہ

مجھ سے بہانہ بنا کر ریمان سے ملنے اکیلی وہاں چلی گئی اور غالباً اس کے ساتھ ایک ہی جگہ رہی مگر اس نے

بھی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔“

”کس طرح۔؟“

”آپ اودامی۔ آپ ولایت میں تین چار سال ایسی رہیں۔ آپ کے والد کو کس طرح ہے کہ آپ نے وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو آپ کو نہ کرنا چاہئے۔“

اودا پھر جواب ہو گئیں۔ انھوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا ”اب آپ کیا کریں گے؟“ وہ اور — اور ریحان کو بیاہ کی اجازت دیدیں گے؟ میں ریحان کو عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ کافی آبائی اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کزن کو let down کر چکا ہے۔ اودا بولا بھی، وہ بالکل hand to mouth زندگی گزارتا ہے۔ دیپالی ایک ہول ٹائم کے لادنس پر کس طرح گذر کرے گی۔؟ علاوہ ازیں وہ مسلم سماج میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی؟ خود اس خادمی سے آپ کی اپنی پریکٹس پر بڑا اثر نہیں پڑے گا؟ آپ کے زیادہ تر مریض کٹر ہندو بھدرالوگ ہیں — معاف کیجئے گا بنوئے بالو آپ تو ایک لامذہب رشی ثابت ہوئے مگر میں آپ کی ایک پُرخصص کی حیثیت سے دیپالی کی بھلائی کے خیال سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ it is none of my business!

بنوئے بالو سر پیچھے ڈالے چھت کو تک رہے تھے۔ وہ ذرا سا مسکرائے۔ ”اودامی۔ آپ یقیناً میری اور دیپالی کی بھلائی کے لئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر بات یہ ہے۔ انہوں نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ ”میرے نزدیک انسانی زندگی ایک انتہائی انمول شے ہے۔ اپنی نو جوان بیوی، اور اپنے نو جوان بھائی کو کھودینے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی انمول شے ہے۔ انسان کا دل — انسان کا دل — ”ایک دم ان کی آواز میں جوش سا آگیا۔ ”اودامی آپ کو کیا اتنا بھی علم نہیں۔ آپ اتنا پڑھ لکھ گئیں۔ دنیا گھوم آئیں۔ آنا نہیں جانتیں کہ انسان کا دل کتنی قیمتی چیز ہے۔ جوان دل اور جوان زندگی بچد — بچد بیش قیمت چیز میں ہیں۔ اودا۔ اور اس ایک مختصر سی انسانی زندگی کو دکھی بنانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ انسان صرف ایک بار جنم لیتا۔ میں پندرہ جنم میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ایک نفوتصور ہے۔ انسان کا دنیا سے، دوسرے انسانوں سے صرف بار رشتہ بندھتا ہے اور موت آتی ہے تو یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر — اگر — اگر بچہ یقیناً ہو جائے کہ دیپالی اس لڑکے کو اتنا چاہتی ہے۔ ”وہ لڑکا دیپالی کو اتنا چاہتا ہے، کہ ان کے راستے میں ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیوں ہمیشہ کے لئے خزاں آلود ہو جائیں گی۔ تو میں یقیناً اسے شادی کی اجازت

لگا۔ ہندو سماج اور مسلم سماج اور میری پرنکٹس، میری پچی کی مسرت سے زیادہ اہم نہیں۔“
 ”شادی کی اجازت دے دیں گے۔“ اوما نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔
 ”یقیناً!“ وہ بہت محفوظ ہو کر اوما کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ”تعب ہے! کمر بڑھائیو
 باتیں۔ آپ کو میرے ان پروگراموں کی سو خیالات پر بہت خوش ہونا چاہئے۔“
 اوما۔ کرسی سے اٹھیں۔

”جاری ہیں۔“ بیٹھے۔ چار دوائے پی کر جائے گا۔ دیدی ابھی بازار سے آئی ہوں گی۔“
 ”نہیں اب میں چلوں“ اوما نے جواب دیا۔

بنوے بالو صوفے پر سے اٹھے اور انھیں کار میں سوار کرانے کے لئے باہر آگئے۔ جب اوما کار میں بیٹھ
 ، تو انھوں نے ہاتھ اونچا کر کے مسکراتے ہوئے مسکار کیا۔ اور فوراً دو مریضوں سے بات چیت میں تنہک
 ے جو اسی وقت پھاٹک پر پہنچے تھے۔

دو ڈیٹنڈ واپس پہنچ کر اومارائے نے سر پر ہی توش کے سکرٹری کو حکم دیا کہ جلد از جلد بولپور جانے کے
 ٹیمز اور ٹرین میں ان کا ریزرویشن کروادے۔ وہ دیپالی سے ملنے شانتی نکیتن جا رہی تھیں۔

۳۱ دلہن کی پالکی

دیپالی دیدی آداب

بیسویں یعنی جمعے کے روز جہاں آرا آپا کی شادی ہو گئی۔ آپ کو معلوم کر کے ضرور تعجب ہوگا
 بیکے چپکے بات چیت چلائی جا رہی تھی تاکہ بقول شمسہ خاں کوئی باہر والا اڑنگا نہ لگا دے۔ خود
 آرا آپا کو تاریخ طے کرنے سے چند روز قبل ہی اطلاع دی گئی۔ یہ شادی بھی شمسہ خاں ہی نے
 ہے۔ نواب اجمل حسین مرشدزادہ نیر بھائی کی دلہن کے سکے خالو ہیں۔ دلہن بھابی کی خالہ
 ہوا انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ بقول شمسہ خاں جہاں آرا آپا کی عمر بڑھ رہی تھی اور
 کم عمر و کامل نہیں رہا تھا۔ خصوصاً جبکہ جہاں آرا آپا کی صورت شکل بھی معمولی ہے۔ نواب اجمل حسین

مرشد زادہ آپسے عمر میں دو گئے بڑے ہیں۔ وہ بھی دیناج پور کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میٹرک پاس ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بقول شمشہ خاں وہ اپنے سسر نواب قمر الزماں جودھری کے توڑ کے رئیس تین موٹریں اور تین چارم تھی رکھتے ہیں۔ آپا کے لئے میروں زیور چڑھاوے میں آیا۔ شمشہ خاں اسی کہہ رہی تھیں بڑا کامیاب پاس ہے تو کیا ہوا کون سا جہاں آرا کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شیکسپیر ڈ کرنا ہے۔ لیکن امی نے مجھ سے کہا کہ بے چاری جہاں آرا کی قسمت بھوٹ گئی۔ سنا ہے اچھل حسین صاحبہ عیاش ہیں شراب بھی پیتے ہیں۔ امی نے شمشہ خاں سے ان کی عیاشی کی خبر پر پوچھ گچھ کی تو وہ بولیں۔ ہاں بس اب چکی رہو۔ جب لڑکی والوں نے سب طرح سے اطمینان کر دیا ہے تو ہم غیر لوگ کیوں فکر میں گھلیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکا ایک زمانہ میں ذرا رنگیں مزاج ضرور تھا۔ کلکتے جا کر ریس کھیلتا تھا اور ذرا پٹانے اور گانا دانا سننے کا شوقین تھا۔ مگر غریب کیا کرتا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اکیلا دم۔ اللہ کا دیا پیسہ بہت اٹھاتا تھا۔ مگر اب پھر سے گھر گرمست میں لگ کر ٹھیک ہو جائے گا۔ جہاں آرا بڑی نیک بخت ہے اس کی اصلاح کر لے گی۔

صبح کھتی ہوں دیدی مجھے شمشہ خاں اور نیر بھائی کی دلہن دونوں پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے مل کر آپا کو کہاں جھونک دیا۔ نواب صاحب اس رشتے سے قطعی خوش نہیں ہیں مگر سب گھروالوں نے مل کر اُن کا بھالے لیا۔ اُوتی کیا لڑکی کا کوا کوٹ چٹنا ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے گی انہم آرا، اختار کے لئے بھی پیغام نہیں آسکتے۔ نواب صاحب لے پھر بھی حامی نہ بھری تو جہاں آرا کی امی پر فوراً اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ (اختلاج قلب نہیں دیدی۔ اب میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں تو دنیا کے بہت سی باتیں سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔ بیگم قمر الزماں کو دراصل مہٹریا کا مرض ہے اور نواب صاحب چائے اسن پسند آتی ہیں بیوی کے ان دوروں سے ان کی روح فنا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بچا ہے۔ نے ساری عمر اپنے اس ڈیمپر سینگ کتب خانے میں بیٹھے بیٹھے گزار دی) بہر حال تو بیگم قمر الزماں۔ الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی کا رشتہ اس جگہ ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ نواب صاحب ترے بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اور تب ان کی بیوی نے ایک تَرپ چال چلی۔ یہ مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوا اور بڑی سخت حیرت ہوئی۔ ایک موزیس ارجمند منزلی گئی ہوئی تھی۔ جہاں آرا آپا باورچی خانے کی طرف جہ

تھیں۔ میں نیز بھائی کے بچے منور کو گود میں لے کر پیچھے والے برآمدے میں بیٹھ لی کہ اندر بیگم قمرانہ کمرے سے آواز آئی۔ نواب صاحب بے چارے اپنی بیوی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ میں اس آواز کو جان بوجھ کر کنوئیں میں نہیں ڈھکیلوں گا۔ "تو وہ چمک کر بولیں۔ "اور کیا کرو گے؟" جتنے ہو کر وہ تمہاری جتنی ملیحہ کے لہسنکے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے؟" نواب صاحب نے تانت سے کہا۔ زری بیگم خاموش رہی۔ خاموش رہی۔ "وہ بھلا کہاں خاموش رہتیں۔ بولیں۔" معلوم بھی ہے ہنگامہ جیل سے چھوٹ گیا۔ پھر ڈھاکے کے چکر لگا رہا ہے، ابھی پرلے روز یہاں آیا تھا۔ میں سو رہی۔ وہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ جاتے ہوئے اس کی جھلک دیکھی تو گھبرا کر کی میں گئی۔ باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں۔ باہر تالاب کے کنارے دونوں کھسکے سر کر رہے ہیں۔ ہمیں سنت کی خبر بھی ہے نواب صاحب۔ تم اپنی اسٹڈی میں بیٹھے پاکستان زندہ باد کرتے رہو۔ تمہیں یہ سن کر ہلکا کر گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم ہی چاہتے ہو کہ صاحبزادی تنہا ہے، ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر اس نے اٹھائی گیرے کے ساتھ گھر سے نکل جائیں؟ اور فرض کرو وہ نہ بھی بھاگ سکے تو یہ خبر کرو تو میاں نا آگئے ہیں کم بدنامی کی بات ہے؟ بے چاری ختمہ بن اور اللہ رکھے نیر کی دلہن نے جو تلوڑ کر کے ایک لنگا یا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ رو تو میاں کا قصہ اب تک چھپا ہوا تھا۔ مگر اب بات پھیل گئی تو آرا تو خیر ہیں ہی بد نصیب۔ چھوٹی دونوں کے بھار شے نہیں آئیں گے۔"

نواب صاحب چپ چاپ بیگم کی یہ تقریر سنتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ "انوری بیگم۔ رو تو اگر ہی کے لئے اپنے کچے تو میں اسے اجازت دے دوں گا۔ چار برس قبل میں نے حماقت کی تھی۔ اب اجازت دوں گا۔" یہ سنتا تھا کہ انوری بیگم پر دوبارہ ساڑ گیا۔ کہنے لگیں۔ "میں مرنی مر جاؤں گی یہ شادی نہ ہو گی۔ اور یاد رکھو وہ اب تمہاری لڑکی سے بیاہ کرے گا بھی نہیں۔ میں اس روز کے بعد شرمہ بن کے اس کے رتی رتی حالات معلوم کر رہی ہوں۔ وہ اس ہندو پیرسٹر کی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہے۔ سریش کی لڑکی۔ یوں کہو کہ پیرسٹر کی لڑکی نے اسے رکھا ہوا ہے۔ تو بہ تو بہ تو بہ۔ اس خاندان میں ایسا بے آدمی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرے۔ ہے بھی تو بات کو ٹھننے والے دو ٹکے کے کسان کی اولاد۔ اجمی وہ نواب کا بن کر بھی آئے تو میں اس دہلیز کو نہ بھلا نکلنے دوں۔ آوارہ۔ دو کوڑی کی اوقات۔ میری شہزادی کو گاہ اور اجمی تم بھی سمجھا گئے ہو کیا۔ یا مرحومہ ملیحہ بیگم کی محبت نے جوش مارا ہے؟ بلواؤ تو اس کو۔"

ذرا دیکھوں کیسے شادی کرتے ہو جہاں آرا سے اس کی "اتنا کہہ کر وہ تو سوسے بہانے لگیں اور نو صاحب کمرے سے باہر چلے گئے۔

جب اندر یہ باتیں ہو رہی تھیں تو انجم آرا بھی برآمدے میں آگئی تھی اور کان لگا کر والدین مکالمہ سن رہی تھی جب باپ باہر چلے گئے تو وہ لمبا سانس بھر کر مجھ سے بولی۔ "اب دیکھو کیا کیا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا۔ انجم کہنے لگی ابھی آپا سے کچھ ذکر نہ کرنا۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو اور آپا پھر غلط آس لگا کر بیٹھ جائیں۔ مگر دیدی بے چاری انجم کو ٹوہ لگ گئی کہ اب آپا کیا کرتے ہیں۔ اور وہ اور مالادونوں جاس پرستہ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی جاسوسی کے ذریعے معلوم کیا کہ نواب صاحب نے شمسہ خاں کو بلا کر سے پوچھا۔ "رو تو میاں اور اُمرا رے کا قصہ کیا ہے؟" شمسہ خاں ہاتھ کانوں پر رکھ کر بولیں۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی اڑتی اڑتی سنی تھی۔ وہی میں نے انوری بہن کو بتلادیا۔" اب نو صاحب نے جلد از جلد اپنے روزمریاں کو کوئٹہ لٹ کرنے کی کوشش کی۔ ان کو دہلی خط لکھا کہ فوراً آکر اُمرا رے کو فون کر کے پوچھا کہ رو تو اس وقت کہاں ہیں۔ انہوں نے کچھ گول سا جواب دیدیا۔

ادھر دیناج پور سے عقد کی تاریخ جلد طے کرنے کے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے۔ ادھر سگیم تو کے اختتامِ قلب میں زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ جس روز نواب صاحب نے ان سے کہا کہ وہ جب تک میاں سے بات نہ کریں نکاح کی تاریخ طے نہ کریں گے۔ تو ان کی سگیم نے قیامت برپا کر دی۔ نواب نے دلی۔ بمبئی۔ کلکتہ جانے کہاں کہاں ہر ممکن پتے پر رو نو میاں کو تار دیئے ٹرنک کال کئے مگر وہ حضرت جا کہاں غائب ہو چکے تھے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ادھر انوری سگیم پر اتنا زبردست دل کا دردہ پڑا کہ لینے کے د پڑ گئے۔ نواب مسترزمل نے ہارمان لی۔ نواب اجمل حسین سے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

مجھے امن زند میں دیدی نواب صاحب پر اتنا ترس آیا کہ کیا بتاؤں۔ ایسے ٹوٹے ہوئے اور دکھ اور غمزدہ لگتے تھے کہ دیکھنا نہ جاتا تھا۔ آپا کو مایوں بٹھایا گیا۔ ان کو بس چپ سی لگ گئی تھی۔ بڑی دھوم کی مشادی ہوئی۔ روزی آپا کی اور آپ کی عدم موجودگی کا ہم سب کو افسوس تھا۔ روزی آپا کا اب کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک خبر ہے کہ معافی مانگ کر جیل سے نکل آئیں دوسری خبر ہے کہ کالے پانی بھیج دیا۔ اور ایک خبر ہے کہ کسی انگریز سے بیاہ کر لیا۔ اور ایک خبر ہے کہ ہتھکڑیوں سمیت جیل سے فرار ہو گئیں

وں کی کوئی حد نہیں!) اس بلا منی کے زمانے میں بھی بڑی شان و شوکت کی تقریب رہی۔ نواب قمرالنبی کی بیٹی کا خادی تھی کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا دیدی۔ دنیا ج پور سے برات آئی۔ جو دراصل سب مائی کے سسرال والے ہی تھے۔ ایک سے ایک دقیانوسی زمیندار نرائن گنج میں مستحکم سے اترا۔ سال ہم لوگ اسی برسات کے زمانے میں نیر بھائی کی بارات لے کر دنیا ج پور گئے تھے (خیر صاحب بارات اور جہد منزل کے دروازے پر آئی اور دولہا مانتھی سے اترا تو ہم سب دھک سے رہ گئے۔ بھنگ۔ تمباکو کا پیٹھا۔ منہ پان سے رچا ہوا۔ بس شکل قصبائی زمیندار۔ نواب اجمل حسین نواب واں کے ہم عمر ہیں بلکہ ایک آدھ برس نواب صاحب سے بڑے ہی لگتے ہیں۔ اور ان کے گھر کی عورتیں قصبائی ان پڑھ بنگالیں۔ جن کے نزدیک ڈھا کہ بھی لندن سے زیادہ آزاد ہے۔ یا اللہ۔ یہ آپا کی سسرال ہے۔ اور یہ آپا کے شوہر ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔

اب اللہ کی ایک اور شان کا قصہ بھی سنئے اور غور کیجئے کہ بڑی بوڑھیاں جو "قسمت کا کھیل" مت کا کھیل" رشتی ہیں تو کچھ غلط نہیں کہتیں۔

شادی میں رخصتی کے وقت، روتو میاں بحیثیت ہمان آن موجود ہوئے، نکاح ہو چکا تھا۔ نیچے اردوں کی ٹٹس مچی تھی، تپتے لگ رہے تھے۔ میں نے فرید پور سے آئے ہوئے کسی نوجوان رشتے دار از سنی "رونو بھائی۔ آپ بھی کھا لیجئے۔ جلدی سے دو کیلے ہو جائیں گے۔" میں نے پلٹ کر انگریزوں میں اتنی بکھر تھی کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں انجم میرے پاس بھائی بھائی آئی۔ اور کہنے "غضب ہو گیا یا مبین۔ رونو بھائی آپ نیچے۔ ان کو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ان کو متار نہیں ملے؟ اور اگر مل گئے تو ان کا جواب کیوں نہ دیا۔ پہلے کیوں نہ آئے؟ اب کیوں میں زخموں پر ہنک چھڑکنے؟" اتنے میں شور مچا۔ دولہا آ رہا ہے۔ دولہا آ رہا ہے۔

آپا جو بالکل بے جان سی ہو گئی تھیں۔ ان کو زینے سے اتار کر زنانہ دیوانخانے میں لایا گیا اور پر بٹھال دیا گیا۔ دولہا میاں مسکراتے ہوئے آئے۔ آرسی مصحف ہوا۔ ساری رسمیں ادا کی۔ ہم لوگوں کا (انجم، اختر آرا اور میرا) جی جوتا چرانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً چرایا۔ اس وقت مجھے پہلی بار رونو میاں نظر آئے جو دیوانخانے کے دروازے میں کھڑے اطمینان بر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔

اب دیدی اللہ کی تیسری شان سینے — یہ دونوں آپ کے مشہور و معزز مربیان احمد ہیں۔ جن کو آپ بھی شاید جانتی ہوں۔ کمال ہو گیا۔ یہ آپا کے کچھ بھی زاد بھائی ہیں۔ ان کی سنگتی آپ سے کیسے ٹوٹی ایک اور لمبا قصہ ہے جو مجھے انجم آرائے بعد میں بتایا یاد رکھیں اس خط میں لکھوں تو خط ہی طویل ہو جائے گا۔ زبانی بتاؤں گی۔ بہر حال تو دیوانخانے میں عورتوں کی وہ بھیر جمع تھی کہ دم گھٹا تھا۔ اسی وقت میں نے آپا کے خاندان کی چند بڑھیلیوں کی کھسک سہرے فرید پور سے آئی ہوئی ایک بڑی بولیں۔ اے ہے یہ تو اللہ بخشنے فرمک بھائی کا نواسہ ہے۔ دوسری نے کہا۔ ”وہ تو روپوش تھائیں نے سننا۔ تیسری بولیں۔“ نکلی آیا جیل سے گھوڑا۔ یہ بھی خدائی خوار پھر رہا ہے۔“ چوتھی نے فرمایا۔ ”اے جنت مکانی! کاٹوت۔“ ہاں۔ ہاں وہی۔ اچھا ہوا جہاں آرا سے بیاہ نہ ہوا۔ بے چاری کی قسمت پھوٹ جاتی۔ خود دکھاتا۔ کیا نواب کی بیٹی کو کھلاتا گھوڑا دہریہ گیونٹ۔“

اب رخصتی کا وقت آیا۔ نیر بھائی نے لکھا۔ ”مگرہ خالی کرو۔ بھڑک کر دو۔ دلہن کے بزرگ آ رہے ہیں۔ بزرگ آ رہے ہیں۔“ خیر بہت سارے بزرگ آئے آپا کو دعائیں دینے (ہاں دیدی آپ کے بابا پٹھی ماں بیٹوں بھائی بھی آئے تھے شادی میں) آپ کے بابا آپا کے لئے ایک بنا رسی ساری لائے تھے۔ دوسرے بزرگوں ساتھ جب وہ آئے سر پر ہاتھ رکھنے تو وہ آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے چپ سے کھڑے رہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ ”بیٹی تمہارے ڈاکو بچا آئے ہیں۔ نواب صاحب دراصل رخصتی کے وقت دیوانخانے کے ایک گوشے میں گم سم کھڑے تھے۔ (میں نے کسی فرد کو روتے زندگی میں پہلی بار بھی دیکھا۔ مگر سندھ کے ریٹیو کی شادی پر سب باپ لوگ روتے ہیں) جب دیدی آپ کے بابا آپا کے قریب آئے تو نواب صاحب سے کہنے لگے۔ ”بنوئے! ایک دن دیپائی بھی اسی طرح رخصت ہو جائے گی۔ تم بہت کچھ لہجہ کرا۔“ دداع کرنا۔ میں مسند کے پیچھے دلے درتے میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی پھر پادری بنرجی روزی کے پاپا آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اور آیتِ وائف ”قسم کے عنوان کی ایک مذہبی و اخلاقی پسند و نفع کی مجملہ کتاب رہن سے بندھی ان کے رکھ دی۔ پھر نواب صاحب سے کہا خدا باپ کا شکر ہے۔ آپ نے اپنی لڑکی اپنے ہاتھوں سے عزت ساتھ اپنے گھر سے رخصت کی۔ خدا کا شکر ہے۔ اور سر جھکائے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے باہر چلے گئے۔ وہ تو اکوہارچی تھی کہ کیا بتاؤں اور انجم بار بار جب موقع ملتا کچھ سے اگر کان میں کہہ جاتی۔“

نی کو نہ آنا چاہئے تھا۔ ایسی بے رحمی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہاں کی جدلیاں تھیں، اگر کسیت ہے کیا آدمی
بست بن کر جذبات سے عاری ہو جاتا ہے؟

رونو میاں اومادی کے ساتھ آئے تھے۔ بہانوں میں سرسری توجہ اور لیڈی رائے بھی شامل تھیں۔
رونو میاں اومادی کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ رخصتی کے وقت وہ دروازے میں کھڑے نیر بھائی سے یہاں
رہے تھے۔ نیر بھائی نے کہا: آقا۔ رونو بھائی یہ عید کا چاند کہاں سے نکلا۔ آپ سے تو آج چار ساڑھے
رہیں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بھئی۔ ذرا ادھر خاصا مصروف رہا۔ (یہ بھی کس قدر زبردست
راسٹینٹ تھا!) میں ابھی کچھلے مینے ڈھاکا آیا تھا۔ تب تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

انجم تو اس موقع کی تاک میں تھی کہ ان سے ٹھیک کر سکے۔ وہ بچپن سے ان کی کافی منہ چڑھلی کر رہی تھی
ایک کراگے بڑھی اور لہنی۔ رونو بھائی آپ ڈھاکے سے کہاں گئے تھے۔ دتی؟ کہنے لگے۔ نہیں بی بی میں
لے کے بجائے پارٹی کے ایک ضروری کام سے سیدھا لاہور چلا گیا تھا اور وہاں سے پشاور۔ یہ کچھلا مینہ
باب اور مرحد کے دورے میں گذرا۔ پشاور میں مجھے پارٹی ہیڈ کو آرٹریز کی طرف سے حکم پہنچا کہ فلاں کا
لے لئے پھر فوراً ڈھاکے واپس جاؤ۔ تو دوبارہ سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا تو اُٹھانے
لایا کہ شام کو جیاں آر کی شادی ہے۔ کیوں بھئی۔ اب تم کب شادی کر رہی ہو۔ کم از کم تم
راگے پڑھ ڈالو۔ بے چاری جیاں آر کو اُموں جان نے کالج سے نہ جانے کیوں اٹھالیا تھا۔

انجم مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جب وہ اس قدر سادگی سے یہ سب کہہ رہے تھے تو میرا جی چاہا کہ
ھاٹیں مارا کر روؤں اور پھر ان کو قتل کر ڈالوں۔ آپا ان کے دکھ میں رو رہے تھے کہ زندہ درگور ہو گئیں اور یہ
ان کی شادی میں کس قدر مطمئن اور بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

ساتھ ہی اُٹا کھڑی تھیں۔ دیوار سے لگی۔ اور عینک کے پیچھے سے آنکھیں چمکا چمکا کر رخصتی کا نظارہ
لاحظہ کر رہی تھیں۔

اب دواغ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ آپا کو گود میں اٹھا کر صدر دروازے تک لایا گیا۔ پھر رونا
مینا بھا۔ نیر بھائی آپا کو پالکی میں بٹھانے لگے۔ اس وقت رونو میاں بھی قریب کھڑے تھے۔ شب خاں بھی
اب ہی خزانہ میں چمک کر بولیں۔ "اے رونو میاں۔ تم بھی تو بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرو۔"
اس وقت دیدی مجھے ایسا لگا جیسے سرخ گھری بنی آپا سے پیر تک لرز کر رہ گئیں۔ چنانچہ رونو میاں نے

اگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ALL THE BEST بی بی۔ اور جلدی
ہٹ گئے۔ نواب صاحب قریب کھڑے تھے۔ وہ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دراصل اس و
وہ زار و قطار دروہے تھے۔ اور اسی بھڑکھڑاتے میں ایک بڑی بی دوسری بڑی بی سے پولیس "اے ہے!
طرح دکھایا تم کو بھائی کی حیثیت سے تمہاریاں نے رخصت کیا تھا۔"

ظاہر بینہ طبع رہا تھا۔ ہاں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں انجم اور اختر اس شادی سے اس
ڈیپریسڈ تھے جن دنوں شادی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ دل خوش کرنے کے لئے کچھ تو
جائے چنانچہ سروجنی دیسی کی وہ نظم "پالکی بردار" ہے نا۔ کالج کی چند لڑکیوں کے ساتھ مل کر میں نے اس
سیلے بنایا اور اسے رخصتی سے کچھ دیر پہلے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں پیش کیا۔ آپا کی پالکی سامنے ہی رکھی
تھی۔ اور دیناج پور پہنچ کر بھی آپا اٹھ کر گھاٹ سے بیس میل دروہائی سسرال پالکی میں جائیں گی۔
ہمارا سیلے دیکھنے کے لئے سات ماہان مرد عورتیں جلسہ گھر پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے اوپر جا کر روئند
میں سے جھانکنے لگے۔ جو پسند کیا گی۔ دیدی یہ گویا میری پہلی پبلک پیش کش تھی۔ آبا بہت خفا ہوتے مگر وہ
خوش قسمتی سے جل پائے گوری گئے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے نا آبا بڑے قدامت پسند پکے مولوی ہیں۔

بھڑکھڑاتے ہیں۔ دونوں بھی جلسہ گھر کی ایک دیوار سے لگے "پالکی بردار" دیکھ رہے تھے۔ امارا
ان کے ساتھ کھڑے تھیں۔ وہ بڑے سوچ میں ڈوبے ہمارے قصہ دیکھا کئے۔ جب سیلے ختم ہوا تو وہ بھڑکھڑاتے
میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ بھئی تم تو کروگرانی کا خوب صلاحیت رکھتی ہو۔ شاہاش کہاں سیکھ رہی
ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہیں بھی نہیں۔ کہنے لگے مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ تم کو باقاعدہ یہ فن سیکھنا چاہئے
میں نے کہا آپا کی اجازت نہیں۔ حالانکہ میں شانتی کلیتہا جانا چاہتی تھی۔ وہاں ہماری دیپالی دیدی بھی ہیں
دیپالی کے نام پر دیدی وہ سکرا لے لگے۔ بولے اچھا تمہاری دیپالی دیدی وہاں ہیں۔ بہت
خوب۔ کوشش کر کے تم وہاں منور جاؤ۔ اور ان کے چہرے پر ایک دم آپ کا نام سننے ہی روشنی سی آگئی۔
کیوں دیدی؟ کیا قصہ ہے؟ پچھپی رستم؟

جس وقت، دونو بھائی مجھ سے باتیں کر رہے تھے امارا بے عینک کے ٹول ٹول شیشوں کے
پچھے سے کھڑی مجھے گھورے جا رہی تھیں۔ میں تو بھتی فوراً وہاں سے کھسک گئی۔ ارے بھئی آپ ہی
سوچئے روئو میاں سے کچھ مطالب؟

دیدنی سر دجی دیسی کے "پالکی والوں کا گیت" کتنا دل دوز ہے۔ پالکی چلے ہو ہو۔ پالکی ہو ہو۔ گیتوں کی تھاپ پر پھولوں سی جھومتی۔ ندیا کے جھاگ پر چڑیا سی ڈولتی۔ پالکی چلے ہو۔ ہنس ہنس ہم گاتے چلیں، تیز تیز، جلدی جلدی، گیتوں کی شبنم میں تارا سی پالکی، ٹاکی سو جوں پر کرنوں کی لہریں۔ یاد لہن کے آنسو۔ سچ سچ پالکی چلے۔ پالکی چلے۔ دیدنی اس گیت پر بہت ہی موثر سیلے بنا۔ خوب تالیں بچیں۔ اس کے بعد آپا کو پالکی میں بٹھا لایا۔ ہلے چاری روٹی بھکتی سسرال سدھاریں۔ جب ان کی پالکی ارجمند منزل کے پھاٹک سے باہر نکلی رونو اں اس وقت لان پر ایک طرف کھڑے دوستوں کے ساتھ خوش گیتوں میں مصروف تھے۔ ایسوں تو بس پیسے پر رکھ کے مات۔

اچھا دیدنی بائی بائی فقط

یا سمین مجید
سگن گپیہ - ڈھاکہ
۲۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء

۳۳

کھل اور اکھل

اکتوبر ۱۹۴۲ء - تیسرا پہر۔ ارجمند منزل کا پھلا برآمدہ۔ جہاں آرا، روزی، یا سمین، انجم آرا اور مترا اڑے تخت پر بیٹھی ہیں۔ جہاں آرا، روزی کے تین ماہ کے بچے کو گود میں لئے کھلا رہے۔ روزی، ماں آرا کے ڈھائی ماہ کے بچے کی گاڑی پر جھکی "بلے بی ٹاک" میں مشغول ہے۔ پھر وہ دونوں لڑکیوں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ "نکلنے میں میں قسمت سے کہا۔ جہاں آرا کے بیٹے کا نام اس کے باپ اجمل حسین، نام کے وزن پر اکھل رکھا گیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام اکھل کے وزن پر رکھ رکھوں گی۔ بسنت منے۔ بولے۔ سسکرت میں کسی شبد کا مخالف شبد بنانا ہو تو اس کے شروع میں ا لگادیتے ہیں۔
یہ کہیں تمہارا اکھل کھل کا مخالف نہ ہو جائے!"

جہاں اماغوزی کے بچے کو اس کے گدیے پر لٹا کر کہتی ہے۔ ”کیوں ماسٹر کل! تم بڑے ہو کر اکٹل سے لڑو گے؟“

نیر الزماں کا سوسا رات کا منور الزماں اپنے گلو دلنے کو برآمدے میں دھکیلتا پھر رہا ہے۔ تینوں کی آئیں گٹ بنائے سامنے تالاب کی بیڑھیوں پر بیٹھی پان چار ہی ہیں، روزی سانیال اپنے شوہر، بچے اور کے ہمراہ چند روز قبل کلکتہ سے ڈھاکہ آئی ہے۔

”روزی آپا اپنی ہم کافقہ تو سنائیے جب آپ کل بلی کالج پہنچیں تو کیا ہوا؟“ اختر آپا چھٹی۔ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں کل کو لے کر بلی کالج گئی تھی۔ ماما کو کلکتہ سے خط لکھ دیا تھا کہ پاپا کے ڈر کے سیدھی گھر نہیں آؤں گی۔ وڈ لیڈر زولے بسنت کے خاندانی دوست ہیں۔ زولے دوارے نے اصرار کیا تھا ڈھاکہ کے جاؤ تو ہمارے ہاں ہی اترنا۔ ڈھاکہ کے پہنچ کر اسی شام وڈ لیڈر زولے سے میں بلی کالج گئی۔ ماما نے چار صبح سے راہ دیکھ رہی تھیں۔ سارا مشن کمپاؤنڈ بھاٹک پر جمع تھا۔ میں کل کو لے کر لیڈی رائے کی کار سے بسنت بابو ساتھ گئے تھے؟“ یاسمین جمید نے پوچھا۔

”نہیں۔ ماما تو روٹی ہوئی آکر لیٹ گئیں۔ سیدھی نے پھولوں سے سارا گھر سجا یا تھا۔ ڈاکہ انتظام کیا تھا۔ میں اندر گئی تو بولیں تمہارے پاپا اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ چلی جاؤ کچھ نہیں کہیں گے میں سہمی سہمی اندر گئی۔ پاپا کھڑکی میں کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ماما نے کہا ’پال۔‘“

”وہ کچھ نہ بولے۔ معلوم تھا میں دبیز پر کھڑی ہوں۔ ماما نے پھر کہا۔ پال! خدا باپ کے ناشکر۔ نہ تو۔ ایک سال ہوا تمہاری لڑکی اس طوفانی رات موت کے منہ میں جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ خ۔ باپ نے اسے زندہ سلامت رکھا۔ اسے برکت دو۔ دیکھو اس کے ساتھ ایک ننھا فرشتہ تمہارے گھر ماما آیا ہے۔ (گڑا دل لٹا ماما۔) میں نے دل میں کہا غرضیکہ پاپا شاید کیو CUE کے انتظار میں کھڑے تھے ذرا چہرہ سخت کر کے میری طرف مڑے۔ بینک مانتھے پر سر کاٹی۔ ذرا جھجک کر آگے بڑھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کل اپنی غوغاں کرنے لگا۔ پاپا بولے۔ خدا باپ لمبی عمر کرے۔ اور پڑمکلف لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ کیا نام رکھا ہے؟ کل میں نے جواب دیا۔“

”بسنت بابو کے لئے کچھ نہ پوچھا؟“ جہاں آرانے دریافت کیا۔

”نہیں۔“

”چلو۔ خیر کچھ تو برت بگھلی۔“ اختر آرا بولی

”بالکل بگھل گئی۔ کچھ دیر بعد پاپائے کل کو گود میں لیا۔ اس سے لاڈ پیار کرنے لگے۔ اس نے
ن کا سوٹ بھی خراب کر دیا۔ مگر پھر وہ اسے اپنے سے الگ ہی کر بی۔ جب میں چلنے لگی پوچھا کہاں
جاؤ؟ میں نے کہا میں دو ڈیڑھ گز میں ٹھہری ہوں۔ کہنے لگے۔ کیوں؟ کیا یہ گھر تمہارا نہیں ہے؟
کہا۔ کل آجاؤں گی۔ چنانچہ دوسرے روز جو میں گئی تو وہ جیسے کل کے انتظار میں باہر ہی بیٹھ رہے تھے۔
یکھ کر کھل اٹھے۔ مامنے چپکے سے پوچھا۔ بسنت بابو کو نہ بتی آئیں؟ میں نے جواب دیا۔ کل لاؤں گی آپ
سہ ہمارا کر رکھئے۔“

”پھر لے کر گئیں بسنت بابو کو؟“ یاسمین نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ کل تو نہیں جاسکی۔ پرسوں پرسوں کسی روز لے جاؤں گی۔“

”اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو روزی آیا؟ میں تمہاری جگہ ہوں تو فوراً لے جاؤں۔“ یاسمین نے اپنی سابق
نی سے کہا۔

روزی چپ ہو گئی۔ اتنے میں ماسٹر اکل حسین مرشد زادہ نے زور زور سے دعا شروع کر دیا۔ ہانچوں
اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں آرا نے روزی سے کہا۔ ”بسنت بابو کو آج ہی لیلی کا منج لے جاؤ۔“

—

”کل شام تو ہم لوگ سرپری توش سے باتوں میں لگ گئے تھے۔ میرے سر بسنت کو دتی بھیجنے
رہیں ہیں کہ وہ دہاں رہ کر قانون کی پریکٹس شروع کریں۔ نئی دلی میں ان کی کوٹھی بھی ہے۔ اس کے کرائے
جانے کا انتظار ہے۔ اسی سلسلے میں مزدوری باتیں ہونے لگیں۔ اور آج شام کو سرپری توش اور لیٹی
نے ہم دونوں کے اعزاز میں ڈنر کیا ہے۔ اس لئے آج بھی نہ جاسکیں گے۔“

”سرپری توش اور ان کے ڈنر کی وجہ سے روزی تم اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئیں؟“ جہاں آرا نے کہا۔
”جہاں آرا۔“ روزی نے اہستہ سے ذرا کوفت کے ساتھ جواب دیا۔ ”اب میں بسنت کو وہ بھٹیچر
دکھانا نہیں چاہتی۔“

’جہاں آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔“ روزی۔ تم کو اب اپنے گھر سے شرم آتی ہے اپنے
لو اپنے posh شوہر سے ملاتے بھی شرم آتی ہے۔ تم جھینپی ہو کہ پادری ہنرچی کی لڑکی ہو۔“

اسی وقت سلیم قمر الزماں اپنے کمرے سے نکلیں۔ ڈھاکے کی سڑخ پاڑ والی سفید ساری بنگالی طرز سے باندھے، بعد نازک اندام اگر تخت کے کنارے پر ٹپک گئیں۔ مکں کو گودس لے کر قریب آئی مالا کو ابروئے اشارہ کیا۔ وہ اندر سے صندوق نکال کر لائی۔ سلیم صاحبہ نے صندوق کھول کر دسوا ایک روپے کے نوٹ نکالے اور مکں کے گدیے کے نیچے چھپکے سے سرکادیئے۔

”اور سناؤ روزی۔ ماں باپ سے صلح صفائی ہو گئی؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔“

”اچھا ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔“ لڑکیوں سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد سلیم قمر الزماں اندر واپس چلی گئیں۔

روزی نے قیمتی جواہر کی ساری پہن رکھی تھی اور نوٹنگے کا پورا سیٹ۔ مالا نزدیک آکر بڑے اشتیاق سے اس کے گہنے چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ ارجمند منزل کی خواہشوں کے لئے بے چارے غریب پادری صاحب کی بیٹیا کی بڑے گھرانے میں شادی نہایت اہم واقعہ تھی، خواہشوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ پادری صاحب سے شادی سے پہلے روزی کی ماں گری بالا ارجمند منزل میں ماما گیری کر چکی تھیں۔ ان سب کو وہ قصہ معلوم تھا۔ کس طرح ایک غریب برہمن بال و دھوا سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے فرید پور کے ایک گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا نواب قمر الزماں چودھری کی پناہ میں ارجمند منزل پہنچی تھی۔ یہاں برتن مانگنے کے کام پر لگا دی گئی تھی۔ کس طرح نواب صاحب نے اسے اپنے نو عمر بیٹیوں کی عنایات سے بچانے کے لئے انگریز لاٹ پادری کی میم کے حوالے کر دیا تھا۔ جس نے اسے عیسائی کر کے اس کی شادی نوجوان کا لے پادری ہنری سے کر دی تھی۔۔۔ روزی کو بھی ماضی کی ان تلخ حقائق کا شدت سے احساس تھا۔

مازمہ مالا مصاحب خاص کی حیثیت رکھتی تھی اور صاحبزادیوں کی گپ شپ میں حصہ لیتی تھی۔ اس نے روزی سے پوچھا۔ ”یہ سب سسرال سے ملا ہے بی بی؟“

”ہاں۔ مالا۔“

”کیا کیا ملا؟“

”ایک سیٹ ہیرے کا۔ سات جڑوا اور سادے۔ یہ والا سیٹ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر مکں

کے ڈیڈی نے دیا ہے۔“

”اللہ مبارک کرے۔“

مسز ایستھر گری بالابنرجی نے اپنے گلے کی باریک طلائی زنجیر جس میں متی سی صلیب آویزاں اور کانوں کے مختصر سے پھول اور چار باریک چوڑیاں اتار کر اس کے لئے رکھ لی تھیں۔ جب دشمن کے سٹر کو تھر بسو اس سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اور پچھلے سال جب روزی نے گلے سے اپنی شادی کی اطلاع بھیجی تو مسز بنرجی نے گھر کے خرچ میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر اپنے بے ہونے اچار مرتبے میز پوش اور سوئٹرز بیچ بیچ کر دے دیے تھے۔ اور ساری عمر کی گریہ میں جو چند پیسے انہوں نے پس انداز کئے تھے ان کو اس رقم میں ملا کر ڈھاکا کا مخصوص کھوکھلے سونے کا ایک شہریدہ پائیں۔ اور تین ریشمی ساریاں۔ ان کی اپنی شادی میں ان کے انگریز مربی رابرٹ ریڈ ولفروڈ نے اور مسز براؤن نے چاندی کاٹی سیٹ دیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی روزی کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہ چیزیں جب روزی پہلے روز لٹی کاٹج گئی تو انہوں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر اسے دیں۔ روزی اگلے آج ارجمند منزل میں اپنی بلند مرتبہ ہسیلوں سے اور آلے اس کم مایہ چیز کا ذکر کیا۔

ارجمند منزل کی ایک باندی چاؤ کی کشتی لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آوارہ نے اگلے کو اختر آرائی گودا اور چاء بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نواب قمر الزماں جو دھری باہر تشریف لائے۔ پانچوں لڑکیاں تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اسے بات کی۔ اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا نام رکھا ہے؟“

”مکمل کمار سانیال۔“

”مکمل کے وزن پر۔“ اختر آرائے خوشی سے کہا اور سب کمار سانیال کی کہی ہوئی بات دہرائی لفظ میں اہجہ کی اضافت اس لفظ کا الٹ ظاہر کرتی ہے۔

”کیوں بے؟ میرے مکمل سے لڑے گا؟ کان کھینچوں گا؟“ نواب صاحب نے خوشدلی سے کہا۔

”جی نہیں نواب صاحب۔“ اختر آرائے نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”مکمل مکمل کا مخالف۔ وہ اس سے میرے مکمل سے لڑے گا۔“

”دونوں کے کان کھینچوں گا۔ بد معاش کہیں کے۔“ پھر نواب صاحب ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔

نیچے اتر گئے۔ اور پائس باغ کی روشنیوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کچھ دیر قبل تیر الزماں کی دہن ایک سواہک نوٹ مکمل کے گردنے کے نیچے سر کا گئی تھیں۔ جہاں آرا نے چاندی کے ننھے منہ پتھر تنوں، نفرتی جھنجھوڑ، ریش قیمت انگریزی کھچھوڑ اور کپڑوں سے بھرا سوٹ کس مع ایک سواہک روپے کے دیا تھا۔ سوٹ کا تخت کے نزدیک رکھا تھا۔

”پوٹر دل کا تیس!“ روزی نے چار پیسے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ ”دیکھو ہر طرف توتو کے نور بکھرے پڑے ہیں۔“

روزی کے اس جھلے سے تینوں نوابزادیاں اور یاسمین جھینپ گئیں۔ روزی بطور مسز سناٹا اپنی نئی دو لمند حیثیت سے بید سر در بختی۔ یاسمین کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاید روزی آپا تھوڑی سی بددعا بھی ہو گئی ہیں۔ وہی روزی جو آج سے صرف سال بھر قبل سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں کود پڑی تھی پوئیس کی لٹاٹھیاں کھائی تھیں۔ جیل میں معافی مانگنے سے انکار کیا تھا۔ دولت، مرتبہ اور آسائش انسان اتنی جلدی کا یا پلٹ دیتے ہیں، اب یہ کس مرتبہ انداز میں مجھ سے باغی کر رہی ہیں کیونکہ میں محض ایک غریبہ واد کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھر قبل تک پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیتی رہی ہیں۔ یاسمین نے سوچا۔

عین اسی لمحے روزی نے اسے مخاطب کیا۔ ”ارے یاسمین اب تم بھی جھٹ پٹ شادی کر ڈالو دیپالی کو بھی چاہئے بیاہ کر لے۔ اور نکلے اپنے اس ڈیمپر سنگ جند رکنج سے۔“
”وہ دیپالی دیدی کا گھر ہے روزی آپا۔ اور وہ ان کے لئے شاید بالکل ڈپر اینگ نہیں ہے۔“
یاسمین نے نرمی سے جواب دیا۔

”نوں سنس۔ شادی سے پہلے ماں باپ کا گھر لڑکی کے لئے قید خانہ ہوتا ہے۔ آزادی تو شادی کے بعد ملتی ہے۔ خود مختاری کی زندگی۔ کیوں جہاں آرا؟“
جہاں آرا مسکرا کر خاموش رہی۔

روزی نمائش پسند، چمپھوری اور بددماغ ہونے کے علاوہ ذرا سنبھلے وقوف بھی ہو گئی ہے۔ جہاں آرا نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اور اسے ایک نہایت کمینہ خیال آیا۔۔۔ آخر ہے تو ہماری پرانی نوکرانی کی اولاد۔۔۔ دوسرے لمحے اسے اپنے اس خیال پر ندامت ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

رے دیپالی کا بیاہ ہو گا تو دیکھنا میں کسی دھوم دھام کروں گی۔ اس کے بابا تو کچھ کرنے سے رہے۔ سادھو
ی ٹھہرے۔ میں دو مہینے پہلے سے دیناج پور سے آجاؤں گی۔ سارا انتظام خود کروں گی۔ مگر وہ روزی کی طرح
پھر کسی سے بیاہ نہ کرے۔ سول میرج۔“

”آپا تم اپنے ہاتھی بھی لیتی آنا۔ دیناج پور سے“ انجم آرا نے لقمہ دیا۔
”ھزور۔ ہاتھی گھوڑے پانچ سب لاؤں گی۔ مگر دیپالی کوئی مرغاضھوٹے تو سہی جیسے روزی نے
ھوٹدیا۔“

”دیپالی ہے کہاں؟ تم سسرال سے آئی ہوئی ہو۔ کیا تم سے ملنے سے نہیں آنا چاہئے تھا؟“ روزی
نے ذرا بلند سی ترش بےجے میں کہا۔

”آپا کے ڈھاکر آنے سے پہلے ہی دیپالی دی ریڈیو پر وگرام کے لئے دلی بلالی گئیں۔ آج کل یہ خبر
ہے کہ اومارے ڈاکٹر سرکار سے بیاہ کرنے والی ہیں۔ شاید دیپالی دی کو یہ بات پسند نہ ہو۔ اور اسی وجہ
سے وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہتی ہوں۔“ اختر آرا نے کہا۔

”ڈاکٹر سرکار سے۔؟ اومارے۔؟ میں نے تو ووڈ لینڈز میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔“ روزی
نے حیرت سے کہا۔

”کیوں۔؟ اومارے جیسی ہیں ویسی ہیں۔ ڈاکٹر سرکار نے انہیں قبول کر لیا تو اومارے کی خوش قسمتی
ہوئی۔ مگر دنیا یہی سمجھے گی کہ ڈاکٹر سرکار نے اومارے کی دولت سے شادی کی ہے۔“ جہاں آرا نے جواب دیا۔
انجم آرا اٹھ کر اندر گئی اور ایک قیمتی دلائی کھلونا لا کر کمر کے قریب رکھ دیا۔

”مائے تم لوگوں نے کتنی پیاری پیاری چیزیں کس کو دی ہیں۔“ روزی نے تینوں نوابزادیوں کو مخاطب
کر کے کہا۔

”ڈونٹ بی سلی۔“ جہاں آرا بولی۔

تخت کے کنارے بیٹھی ہوئی یاسمین نے سوچا۔ میرا تحفہ ان سب تحائف کے مقابلے میں حقیر اور
کم قیمت ہے۔ مگر میں نے کتنے پیار سے بچے کے یہ دو فراموشی کر انہیں دیے ہیں۔ انھوں نے میرے پرنسٹ
کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب وہ دوستی کو تحائف کی قیمت سے ماپا کریں گی؟

”یڈی ارجنارائے نے تو بس ایک چمک دیدیل ہے۔“ روزی بے پروائی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

مکمل کے نام جمع کردالوں۔ ویسے تو اس کے ٹھا کر دادا نے اس کے پیدا ہوتے ہی بنک میں اس کا اکاؤ
کھول دیا ہے۔

بے چاری روزی نئی نئی دولت پا کر بوکھلا گئی ہے۔ چاروں لڑکیوں نے سوچا۔

برآمدے سے موٹر آن لگی۔ اور نواب اجل حسین مرشد زادہ جوڑی دار پانجامہ، سیاہ خیروا
ترکی ٹوپی نیچے اترے۔ برآمدے میں آکر وہ تخت کے قریب ذرا سا ٹھٹھکے۔ جہاں آرا نے روزی سے ان کا
کرایا راہنہوں نے ذرا گھبرا کر آداب عرض۔ آداب عرض۔ مزاج شریف۔ ؟ کہا اور زینے کی سمت چلے
۔ پان چباتے، بھڑے، جھٹی نا، بد ہیئت، میٹرک فیل جاگیر دار جہاں آرا کے خدائے مجازی !
روزی سوچ رہی تھی۔ اسرار خداوندی ! میں جہاں آرا کو کتنا خوش قسمت سمجھا کرتی تھی اور خود کو کتنا
بد نصیب۔ مجھے لذت کما رسا نیاں جیسا دکھش اور اسامٹ شوہر ملا۔ جہاں آرا بے چاری کی تقدیر میں
نواب اجل حسین کھٹے تھے۔ اسرار ربانی !

نواب قمر الزماں پائیں باغ میں ہوا خوری کمرے کے برآمدے کی طرف آ رہے تھے۔

”ارے بھی بیگم۔ ذرا یہاں کیے گا۔ میری سفید شیر وانی کہاں ہے۔“ اوپر زینے پر اگر نواب

اجل حسین نے آواز دی۔

”جی ابھی آئی۔“

”اور تازہ پان۔“

”جی۔ آتی ہوں۔“ جہاں آرا نے فوراً اکمل کو تخت پر لٹایا۔ اور چپ پیروں میں ڈال کر
بسرعت زینے کی طرف بھاگی۔

نواب قمر الزماں اس وقت برآمدے میں بیچ کر گیسٹری کی جانب جا رہے تھے۔ انہوں نے

کرب کے ساتھ جہاں آرا پر نظر ڈالی۔ بے زبان میچ جو دھری کی بے زبان جھنجھی ! اسی کی طرح جی ونا ! میچ کی

کی شادی ایک غریب کسان، مولوی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ وہ اس سے نباہ لے گئی۔ لیکن یہ کالج کی تعلیم یافتہ

لڑکی بھی اس زبردستی کے بے تکے رشتے کو کس صلے سے نباہ رہی ہے۔ میں تجھ سے شرمندہ ہوں بچی ! اور اپنی

مجبوریوں سے شرمندہ ہوں۔ میں تو ساری عمر طیمہ سے بھی نادم رہا تھا مگر میری ندامت سے طیمہ کے لئے کیا

فرق پڑا؟ میری شرمندگی یا اپنی مانی سے تیرے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو مرتے دم تک اپنے اس نامعلوم

مجازی کی اسی طرح خدمت کرتی رہے گی۔ میری بچی۔ میری بے چاری بچی۔ کاش۔ کاش میں
 بان سے تیرا یہاں کر دیا ہوتا۔ شاید میں لمحہ کی دھج کے سامنے بھی سرخرو ہو سکتا۔ کاش۔ کاش۔
 یہ آہستہ گیلری میں سے گزرتے اپنی جائے پناہ۔ اپنے کتب خانے کی طرف چلے گئے۔

دو ڈلیٹرز سے مشورہ لیت لکھ کر سانیال کا فون آیا۔ تھوڑی دیر میں سز سانیال کے لئے کار صبح
 اے جی۔ نیرازاں نے برآمدے میں آکر روڑی سے کہا۔

روڑی کی آیا تالاب کی مٹی پر سے اٹھ کر آئی اور کل کا سامان اور تحائف پیک کرنے میں مصروف
 مکمل اور مکمل دونوں برابر گڈیوں پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ڈھائی تین ماہ کی دو مختصر کمزور، نازک
 سی جانیں۔ سوجھ بوجھ پر ہاتھ تالاب کا پانی گھنار ہو گیا۔ گلاب خاص کے نیچے رکھے دو کرم اوتار
 لحاسن کی رنگین موتیاں کروں میں جھللا اٹھیں۔

جھٹ پٹے کا وقت کمروں کے اندر بہت ڈیر پر لنگ ہو سکتا ہے۔ نواب قمران اں گھبرا کر اپنے
 ملنے سے پہلے کے باغ میں اتر گئے اور شیتے ہوئے تالاب کے کنارے آکر راج سٹھاسن پر جھک گئے۔
 برآمدے میں تخت پر لیٹے دو لولہ بچے سوتے ہیں گننائے۔

سنلہ جب ننھے بچے کوئی پیارا سا خواب دیکھتے ہیں تو گننا تے ہیں۔ پامین نے مسکرا کر بچوں پر
 ہالی۔ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں روڑی کے لئے کہنے پن اور نوڈولنے پن کو معاف کر دیا اور اپنی فطری
 لی سے اسے مخاطب کیا۔ "روڑی آیا۔! آپ نے یہ نام خوب سوچا۔ کل برفندہ انگلی۔! اسدوون
 بنے۔ ایک سن کی بید انگلی۔! دوئے ہندوستانی!"

"انسان۔ جدید ترین موڈل۔" روڑی نے کہا۔
 دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر شہس پڑیں۔

"روڑی آیا۔" سروجنی دیسی کی ایک نظم ہے۔ "فکار یا ستمیں کل اور راکل کو دیکھتے ہوئے
 ہستہ بولی۔"

"سو جاؤ میرے بچو۔"

صبح تک کے لئے محفوظ و مامون

سوئے رہے۔

کہ ہمارا رت جگا بہت طویل ہے۔
 جتنی دیر تم سوؤ۔ ہم۔ ہم کھیتی بوئیں گے
 ہم آرزوؤں، اور رنجوں اور آنسوؤں سے بھر پور سینے بوئے ہیں۔
 تاکہ جب تم جاگو تو ان کی فصل کاٹ سکو
 بچو۔

صبح ہوتی ہے۔ رات گزر گئی۔
 ہماری مشقت ختم ہوئی۔ ہماری کھیتیاں لہلہا رہی ہیں
 ہمارے ہاتھ کمزور تھے
 لیکن اندھیا سے میں ہم نے تمہاری آنے والی شان و شوکت کے خواب دیکھے۔
 تمہارے بچوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچا۔ ہمارا رت جگا ختم ہوا۔
 جاگو بچو

ہم نے سینوں کی جو فصل تمہارے لئے بوئی ہے
 اس کے صلے میں
 ہماری محنتوں کے ثمر کو
 تم تو صیف سے یاد کرو گے
 یاد رکھو؟

ہمیں ملزم ٹھہراؤ گے۔ یا ہمیں معاف کر دو گے۔
 یا ہمیں مجید نے سراٹھایا۔ نواب قمر الزماں برآمدے میں آچکے تھے اور تخت کے قریب کھڑے
 رہے تھے۔ انہوں نے یا ہمیں کے سر پر ہاتھ رکھا اور چپ چاپ خواہش اندر چلے گئے۔
 بن بارغ کے درخت شام کی سنہری ہوا میں لویاں لگتا رہے تھے۔
 مل اور اکمل بے خبر سوایکے۔

برڈز آف پیراڈائیز

”اگر تمہارا وہ خط مجھے صرف ایک دن پہلے مل گیا ہوتا تو شاید ہم لوگ آج یہاں نہ ہوتے۔“
نے کہا۔

ہسپانوی لباس پہنے سٹریس سرسوتی نے کیلے کے جھنڈ میں سے نکل کر قہوے کی کشتی میز پر رکھی تھی۔ پیراڈائیز رین ٹری کی شاخوں سے اتر کر نیچے آئی اور گھاس پر چلنے لگی۔ یاسمین سے دیکھ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے اسپینش کولونیل وضع کے بنگلے میں سے کلیپسو موزک زانے لگی۔ ”شو نو کی گرل فرینڈ سان فرینڈو سے آئی ہوئی ہے۔“ دیپالی نے کہا۔ پانی کی بند ٹیپ سے میز پر آن گری۔ یاسمین نے اوپر دیکھا۔ بادل کریمین پر سے سرکے ٹیلے کی سمت آ رہے۔ بڑے پتوں اور موٹے تنے والے رین ٹری کے جھرمٹ میں شفاف نار پیہ سما تھا۔ سر پر سرخ بندھن مانا باندھے اسکرٹ میں بلبوس ایک ایسٹ انڈین عورت نالے کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ ایک درخت پر بنے ٹری ٹاپ ہاؤس پر بورڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار۔ پلانٹیشن میڈیکل ڈسپنسری۔ اس درخت کے نیچے بھی پندرہ فردوس اڑتے پھر رہے تھے۔ چند مریض جمع تھے۔ چینی لیٹ ننگرو۔ اپنی اپنی جنتوں سے نکالے ہوئے انسان۔ آدمی کی عادت ہے اس کی جنت سے نکالو تو وہ اپنے ہی بھلی ایک اور جنت بنا لیتا ہے۔

”دیدہ کیا ہوا تھا۔؟“ یاسمین نے کمزور آواز میں پوچھا۔

”اسٹراکھون۔“ سٹریس سرسوتی نے بنگلے کے برآمدے سے آواز دی۔ دیپالی نے کہا: ”ابھی آئی۔“
”کھڑک بنگلے کی سمت چلی گئی۔ سٹریس سرسوتی باہر آ کر کرسی پر بیٹھیں۔ اور بولیں: ”ہمارا میم صاحب کہتے ہیں ڈانسر ہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔“ وہاں سٹریس سرسوتی۔ ہم تمہارا میم صاحب کو بہت زمانے سے ملے۔“ یاسمین نے بنگلے اردو میں جواب دیا۔ ”ہم اور دیپالی میم صاحب ایک ہی کنٹری کار چنے والا۔“
مطلب۔ پہلے ایک ہی کنٹری تھا۔“

”تم سینا میں بھی بنا چکے ہو؟۔ جیسے مس نکو۔“ مسٹرئس مسرئوٹی نے کھڑے ہو کر دین چک لیں۔ یاسمین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سرخ بندانا والی عودت اسکرٹ گھماتی کپڑوں کی ٹوکری مکر پر رکھے ٹلے کی طرف سے آئی۔ مبرلا کے قریب پہنچ کر اس نے ٹوکری گھاس پر رکھی اور مسٹرئس مسرئوٹی کے ساتھ ناچنے لگی۔ اب وہ دو یا نو ی رقص کر رہی تھیں۔ سمر سٹ ماہم کے کسی قبل از جنگ استوائی سیٹنگ کے نادل کا سین۔ یا نے آنکھیں ملیں۔

سرخ بندانا والی عودت نے گلے میں پختن پاک کا بڑا سا تعویذ پہن رکھا تھا۔ وہ مسٹرئس مسرئوٹی زیادہ خوبصورتی سے ناچ رہی تھی۔ دیپالی بنگلے سے واپس آئی۔ کمری پر بیٹھ کر چاء بنانے لگی۔ کتنی بے فکری کی زندگی ہے یہاں یاسمین نے سوچا۔ ”یہ لڑکی بہت اچھی ڈانسر ہو سکتی ہے۔ کون یاسمین نے پوچھا۔

”مسٹرئس خیر النساء؟ باہا کے کپاؤنڈر شرافت علی کی بیوی۔“ دیپالی نے جواب دیا۔
 ”مسٹرئس خیر النساء نے عصیت سے پوچھا۔“ آپ پاکستان سے آیا ہے؟“
 ”ہاں۔“ یاسمین نے جواب دیا۔

”آپ نے نور جہاں کو دیکھا ہے؟“
 ”کون نور جہاں؟“

”میرے لئے جہاں میں چین ہے نہ کر رہے۔“ مسٹرئس خیر النساء نے گا کر جواب دیا۔ ”خاندان مووی ولا۔ ہم نے سب موڈیز دیکھی ہیں۔ کنگن۔ بدھن۔ گاجی صلاح الدین۔ سکندر۔ جندگی ہے پیا سے پیار میں بٹلے جا۔ عک کے مجھ میں اپنا سر جھکائے جا۔“
 ”مگر یہ تو بہت پرانی فلمیں ہیں۔“ یاسمین نے کہا۔

”بس وہی یہاں چلتا ہے۔ اور دوسری فلم دیکھا۔ انداز اور برسات۔“ مسٹرئس مسرئوٹی۔
 جواب دیا۔

”ہم لوگ سس صاحب یہ موڈیز دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ ہیں پتہ چلا ہے ہمارا دل لڑ کنڈی ایسا ہی ہوگا۔“ مسٹرئس خیر النساء نے اداس آواز میں کہا۔

دیپالی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”فرگٹ اٹ۔ دیدی۔“ یاسمین نے کہا۔

”تم بہت خوش ہو۔ تم دنیا کے TOP پر ہو۔ ورلڈ ٹور پر نکلی ہو۔ اپنے ملک کی مشہور ٹرانز ڈھا کہ اب بھی تمہارا وطن ہے۔“ دیپالی نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔

”سوری دیپالی دی۔“ یاسمین نے کہا۔ واقعی میں بہت مسرور ہوں۔ ساری دنیا اب میرے ہوں میں ہے۔ کامیاب کریر۔ اُن گنت مڈ آج۔ گلیمز۔ سیلشی۔ شہرت۔ اُن بے چاری دیپالی دیدی کو اٹا۔ ۶ اور جہاں آرا آپا کو۔ ۶ محض مایوسی۔ لیکن مجھے روزی سانیال کی طرح اپنی کامیابی پر زور نہیں ہونا چاہیے۔ گو میں نے اپنی کامیابی کی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنے آبا کو ڈیغائی کیا۔ مگر ٹسٹ کی لگن۔ اس نے باواز بلند اضافہ کیا۔

”بوش۔“ دیپالی بولی بھرا جانک چپ ہو گئی۔

شاید یہ مجھ سے جتنے لگی ہیں۔ انہیں اب کون جانتا ہے۔ مجھے ساری دنیا جاننے لگی ہے۔ جیرلڈ ہتکے اگر کوشش کی جائے تو میں اپنے ”موڈرن اور ٹیل بیسے“ کا نیویارک میں باقاعدہ اسٹوڈیو قائم کر سکتی ہوں۔ مگر ابھی یہ بات ان کو نہیں بتاؤں گی اور جل جائی گی۔ کیا پتہ لا شعوری طور پر متعصب بھی ہوں۔ میرا حال الیسٹ پاکستان سے ان کو ٹکنا ہی پڑا۔ نہیں۔ پرانی مارکسیست میں متعصب تو شاید نہیں ہیں۔ اتنی پرانی دوست ہیں۔ اگر ان کو یہ بتا دوں کہ سینڈ سم، مشہور انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلڈ بلونٹ سے شادی کرنے والی ہوں تو شاید اور حمد کریں۔ نہیں بتاؤں گی۔ نظر لگ جائے گی۔ پری نادر جیرلڈ ایک طرف۔ بے مثال یونانی مجسمہ۔ ادا ایک طرف ان بے چاری کے موٹے کالے لبت موہی ہیں۔ وہ تو جہاں آرا آپا کے میاں سے بھی گئے گذر رہے ہیں۔

سرسوتی اور خیر النساء گھاس پر بیٹھی ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں۔ شو نو نے بنگلے کے برآمد میں اگر آواز دی۔ ”دیدی۔ آپ کا فون۔“ دیپالی بھراٹھی اور عمارت کی طرف چلی گئی۔

سرسوتی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”مس صاحب ہمارا سیم صاحب رو کیوں رہا تھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی بیٹھے بٹھلے رونے لگتا ہے۔“

”معلوم نہیں۔ سرسوتی۔ شاید۔ شاید ان کو اپنا کنٹری یاد آتا ہے۔ اور۔ اور۔“

”اور کون —؟“

یاسمین نے جلدی سے بات بنائی۔ ”وہ — مسٹرئس سرسوتی ادھر دھاک میں دیدی کا ایک فرینڈ تھا۔ جہاں آنا بیگم —“

”جہاں آنا بیگم —!“ مسٹرئس خیر النساء نے خوشی سے دہرایا۔ ”بادشاہ کا بیٹی؟“

”نہیں۔ ایک معمولی سے نواب کا بیٹی۔“

”پھر کیا ہوا — کیا ہوا؟“ دونوں عورتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

”جہاں آنا بیگم کا نو اسٹوری بہت ٹریک تھا۔ اسی کو یاد کر کے تمہارا سیم صاحب دکھی ہو جاتا ہوگا۔“

”کیا ہوا؟ — کیا ہوا؟ — عا سکی معسومی —؟“ سرسوتی نے پوچھا

خیر النساء نے سوال کیا۔ ”عسک مجاجی تھا یا عسک حلیکی —؟ ہیرد کون تھا —؟“

یہ عورتیں بے حد سینا دیکھتی تھیں۔

”خیر النساء شاید عسک مجاجی اور حلیکی دونوں تھا۔ جہاں آنا آیا اپنے کزن کو لو کرتا تھا وہ اُس کو۔“

”سمجھ گیا۔“ مسٹرئس سرسوتی نے طمانیت سے کہا۔

”پھر اُن کا کزن اُن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

”کیوں —؟ پچ پچ — ہائے ہائے۔“

”آئیڈیا لوجی کی خاطر۔“

”آئیڈیا لوجی — کیا —؟“ خیر النساء نے دریافت کیا۔

”مطلب — مطلب — ایسا کہ — غریب امیر صب برابر ہونا چاہئے۔ ہیرد امیر لوگ

کو HATE کرتا تھا۔ ہیرد بہت امیر تھا۔ اُس زمانے میں خیر النساء — لڑکا لڑکی آئیڈیا لوجی کی

خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ دیتا تھا۔“

”تب تو وہ پاگل لوگ تھا۔“ سرسوتی نے کہا۔

”ہاں۔ ایک دم پاگل۔ اور اگر سوچو تو — تو ہم بھی پاگل ہے۔ ہم نے آئیڈیا لوجی کی خاطر

ن سیکھا۔ کہ ہمارا دیش میں کلچر خوب پھلے پھولے۔ ہم نے اس کے لئے بہت محنت کیا۔ بہت کوشش
ہمارا ایک انکل کا دوست سنرل منسٹر تھا۔ اس نے ہمیں فارن ٹور پر بھیج دیا۔ پاکستان گورنمنٹ

”کون گورنمنٹ ہے؟“ سر سوئی نے پوچھا۔

”ہمارا اپنا پاکستان گورنمنٹ۔ تم لوگ تو ابھی برٹش کولونی ہے۔“

”کولونی ہے تو ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔“

”آہ۔ تمہاری منٹلٹی اب تک کولونیل ہے۔“ یاسمین نے حقارت سے کہا۔ بے چاریاں بھلاؤ

ولاد۔ خود غلام۔

”اور تمہاری منٹلٹی کیا ہے؟“ سر سوئی نے چمک کر پوچھا۔ نیو ورلڈ میں پیدا ہو کر مہندی نژاد
درجہ بندی ہو جاتے ہیں۔ اور بے ادب۔ اب ان جاہلوں سے کون بحث کرے۔ وہ چپ ہو گئی۔

دیپالی واپس آئی۔ ”میرے شوہر کا فون آیا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔ انہوں نے کل رات کو تمہارے ڈانس
درگرم گورنمنٹ ہاؤس میں رکھوا دیا ہے۔ گورنر جنرل کے لئے۔“

”گورنر جنرل کے لئے۔؟“ یاسمین نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔ سٹرپس سر سوئی زیب لب مسکرائی۔
”کی ٹرے اٹھا کر بیگ کی طرف چلی۔ یاسمین نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھی اور حینپ گئی۔

”اچھا اب ہم بھی چلتا ہے۔“ خیر النساء نے کہا۔ سرخم کر کے مسکرائی اور کچڑوں کی ٹوکری اٹھا کر
رد پیشی کی سمت روانہ ہو گئی۔

”عجیب مسخری عورتیں ہیں۔“ یاسمین نے اظہار خیال کیا۔ ”تم کن لوگوں میں آ پھنسیں۔“

”بہت بھلے لوگ ہیں۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ ”انہیں یقیناً ہم اور تم مسخرے لگتے ہوں گے۔“

اسرزمین کو چھوڑے انہیں تین سال سے اوپر ہو گئے۔ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ خیر النساء اور سر سوئی
دو دنوں کے پُر کھے یو۔ پی کے صلیع اعظم گڑھ سے آئے تھے۔ تین سال پہلے۔ جب انگریزوں نے یہاں اپنے

مردو غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ تب ان کی جگہ اپنے نئے ہندوستانی غلام یہاں منگوائے تھے۔ یہ یہ آدھے
پیش آدھے ایٹرن یوچی کے ہندو یا مسلمان آدھے برٹش ہیں۔ سترہویں صدی کے انگریزی الفاظ

ان لوگوں ہیں۔ پچھلے میل زمانہ میں۔ یہ بے چارے اب تک برٹش قلی کہلاتے ہیں۔ مگر یہ بڑے ذہین لوگ ہیں انہیں

معمولی مت سمجھنا۔

”دیدیں۔ کہاں سے کہاں بات نکلی گئی۔ کچھ دیر ہوئی میں نے آپ سے پوچھا تھا۔ کیا ہوا تھا
میں کا جواب تو دیجئے۔ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کیا ہوا تھا۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔“
”سیدے اب ملاقات ہوئی ہے۔ اور اس اجنبی و در افتادہ جگہ۔۔۔ آخر ہوا کیا تھا؟“

”دیپالی نے ایک بڑا آن پیراڈائیز کو دیکھ کر کہا۔“ دیکھو یہ کتنے خوب صورت پرندے ہیں۔“

”دیدیں۔ پلےز۔ بات مت ٹالئے۔“ یاسمین بھائی تم تو ہمیشہ کی فوڑی پار کر ہوا۔“

”پوری بات بتائیے نا۔ آپ سن بیا لیس میں جب جہاں آرا آپا کی شادی ہوئی اس کے بعد کبھی
اُن سے ملی کیوں نہیں؟ وہ جب بھی دیناج پور سے ڈھاکہ آتیں آپ کے لئے معلوم کراتیں۔ اطلاع
ملتی کہ شانتی نکیتن میں ہیں یا ریڈیو پروگرام کے لئے ملکتہ گئی ہوئی ہیں۔“

”نہیں۔ میں چند ایک بار جہاں آرا سے ملی تو تھی۔ دراصل اس سے نظریں چار کرتے ہوئے
مجھے احساس جرم ستاتا تھا۔“

”آخر کیوں؟ کیا ہوا تھا؟“

”دیپالی ہنس پڑی۔“ کیا ہوا تھا؟ اُس نے دہرایا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ جہاں آرا کی شادی کی
اطلاع کا جب تمہارا خط آیا اس سے صرف دو روز قبل اُدوارے شانتی نکیتن پہنچیں۔ مجھ سے
بہت سیلو ڈریمٹک انداز میں کہا۔ ریمان اپنی کزن کا بچپن کا منگیت رہے۔ تم سچ میں آگئیں بڑ
شرم کی بات ہے۔ تم اپنی ہسپلی کی زندگی برباد کر رہی ہو۔ اپنے نیک دل باپ کو صدمہ پہنچا رہی ہو۔
جہاں آرا اور ڈاکٹر سرکار دونوں کہیں تمہاری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔“

”جب سے میں نے بالکل غیر متوقع جہاں آرا کی الماری میں ریمان کی تصویر رکھی دیکھی تھی میں
بھونکی تھی۔ اور احساس جرم مارے ڈال رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ریمان سے بات نہیں کی۔ ان کے
بہت اصرار پر جب ان کو وجہ بتائی انہوں نے پورا قصہ سنایا۔ کس طرح ان کی نسبت لٹوی۔ اور وہ
ان سے میری ملاقات سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ بہت سمجھا بکھا کر ریمان نے
مجھ سے بیاہ کر لینے پر راضی کر لیا۔ لیکن اب شانتی نکیتن پہنچ کر اُداسی کہنے لگیں۔ جہاں آرا اب
نک یہ آس مل گئے بیٹھی ہے کہ ریمان شاید ارجمند منزل واپس آجائے اور نواب اس سے شادی کر لے۔“

کے لئے تیار بھی ہو جائیں۔ اگر تم نے ریحان سے بیاہ رچایا تو جہاں آراغریب شاید نہ رکھالے بلکہ نشین محمد بن لڑکیوں کے ایسے ٹریک فٹ سے ہیں۔ علاوہ ازیں ریحان ایسا ناقابل اعتبار شخص ہے جب اس نے اپنی کزن سے بے وفائی کی جس کے باپ کے روپے سے وہ ولایت پڑھنے گیا تھا تو بھلا تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔ تم کو بھی چھوڑ دے گا۔ پھر تم کیا کرو گی۔ چند رکنج کے دروازے بھی تمہارے لئے بند ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ کیا کہیں تھی اور ناجبرہ کار۔ یہ سب سن کر ذہل گئی۔ اُچارا کے واپس جانے کے بعد اسی رات میں نے ریحان کو بڑا کڑا خط لکھا کہ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیں۔ اسی رات میں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ اس کے دوسرے روز تمہارا خط ملا۔ جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ بیچاری جہاں آرا کی شادی دیناج پور کے کسی زمیندار سے ہو گئی۔ اگر تمہارا وہ خط مجھے دو روز پہلے مل گیا ہوتا تو میں اُچارا کے بھڑے میں نہ آئی ہوتی اور پردگرام کے مطابق ریحان سے سول میرج کرنے کلکتہ چلی جاتی۔ لڑہونی کو کوئی مال نہیں سکتا۔

”ریحان کلکتہ جا چکے تھے۔ میرا اعتبار نامہ موصول ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے ان کو بہت ہی سخت خط لکھا تھا۔ آئیٹیا لوجی کی خاطر۔ یعنی یہ کہ انسان انسان کا ل نہ دکھائے۔ اور وہ جہاں آرا کا دل دکھا رہے تھے۔ اور میں اپنے والد کا۔“

”دیپالی دیدی۔ ایک بات بتاؤں۔ ہم سب پاگل لوگ تھے۔ بقول مسٹر ایس سر سوئی۔ صرف وادی صبح الدماغ تھیں۔ اور ریحان بھائی کے بارے میں آگے میں بتاؤں؟ سنئے۔ سن پتیا لیس میں لاندیا کسان بھائی کی طرف سے ایک لوک گیت کانفرنس ہوئی تھی۔ یاد ہے؟ لوک گیت منڈیاں مارے ملک سے آئی تھیں۔ اس کانفرنس میں ریحان بھائی میرے پیچھے لگ لئے۔“

”راسکل۔۔۔!“ دیپالی نے قہقہہ لگایا۔

”آپ اُس میں نہیں آئی تھیں۔“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریحان اور اُچارا وہاں جانے والے ہیں اس لئے نہیں گئی تھی۔“

”مسلمان نوک سنگرز بہت بڑی تعداد میں آئے تھے کیونکہ جنگال کی فوک میوزک زیادہ تر

مسلمانوں کی تھی۔ یہ دراصل مجھے اب مشرقی پاکستان بننے کے بعد اندازہ ہوا۔ ریحان بھائی ن فوک سنگرز کے کیمپ کے انچارج تھے۔ ایک دستہ منی پور سے آیا تھا۔ گارو ہلز سے مس ایس بارو

کو انہوں نے بھگا دیا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ مٹی پور کے راجہ کا بھائی کیونست لیڈر تھا! آج یہ سب قصے اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ سپلر تھیٹر کے لوگ تھے۔ کیا جوش و خروش تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ شونا رنگال عنقریب تقسیم ہونے والا ہے۔ بس صرف یہی خیال تھا کہ انگریزوں کو نکالتے ہی ملک میں دودھ کی ندیاں بہ جائیں گی۔ —

”اور کتنی جنگجو اصطلاحات تھیں! ہماری ٹولیاں اسکوڈ کہلاتی تھیں۔ چانگام اسکوڈ۔ مڑوا ویلی اسکوڈ۔ مٹی پور اسکوڈ۔ سپلر تھیٹر اسکوڈ۔ دیدی دہاں اڑیہ اسکوڈ نے ایک گیت سنایا تھا۔ اس پیٹ کی خاطر میں بنگال گیا۔ پاٹر میلے۔ دھان کوٹے۔ دھان کاٹی۔ چاکری کی۔ پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ ناچا۔ چرخہ کاتا۔ گالیاں دیں۔ ہم راج سے ملا۔ اس پیٹ کی خاطر۔ —

”اور ہم ڈھاکہ سے ٹری نیڈاڈ آگئے۔ اس پیٹ کی خاطر۔“ دیپالی بولی۔
 یاسمین کہتی رہی۔ ”ایک گونڈ گیت تھا۔ میں نے کابے سچ کر جنگل کا ٹیکس دیا۔ بیل سچ کر۔ اب بھی کافی نہیں۔ انگریز کے راج میں ہم بھوکے رہتے ہیں۔ ہمیں اس وقت ایسا پکا معصوم یقین تھا کہ اپنے قومی راج میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ اور وہ حیدرآباد اسکوڈ۔ ہم سرخ سپاہی شانِ وطن۔“

”ریحان کے متعلق بتاؤ یا سمیں۔“

”ہاں دیدی تو وہ اس کا نفرنس میں میری بہت سرپرستی کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا میں دیپالی سرکار کی دوست ہوں۔ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اچانک میں بہت پور ہو گئی۔ طبیعت میزاج ہو گئی۔ پارٹیشن سے ذرا پہلے میں اپنے کفر مذہبی قدامت پرست مولوی دالدار سارے گھر والوں سے بغاوت کر کے ایک اسکا لرشپ پر بھرت ناٹیم سکھنے مدراس چلی گئی۔ اور وہاں سے ایک سال بعد اپنے ایک روشن خیال رشتہ دار کے پاس سیدھی کراچی۔ وہ بہت بار سوخ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بنگالی سٹرل منسٹر کے ذریعہ کوشش کر کے مجھے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا۔ انہی دنوں ڈھاکہ سے جہاں آرا آپا نے لکھا کہ آپ لوگ چند رنج فروخت کر کے کلکتہ اور وہاں سے ٹری نیڈاڈ جا چکے ہیں۔ جہاں آرا آپا کو بڑا افسوس تھا کہ جاتے وقت آپ ان سے ملی نہیں۔ خط تک نہ لکھا۔ ان کو صدمہ زیادہ یہ تھا کہ شاید ہندوستان پاکستان کی سیاست کی تلخی آپ دونوں کے درمیان آگئی۔“

نہاد لے میں لیا ہوا بڑا سا مکان تھا۔

”متر بابو نے نہ جانے کس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ بابا اودا ملے پر عاشق ہو گئے ہیں۔ لیڈی رائے بھی چاہتی تھیں کہ اودا کسی سے بھی جلد از جلد شادی کر لیں! اور ریمان کے FIXATION سے آزاد ہوں۔ ریمان بھی شہر میں موجود تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا۔ کیونکہ بہت شدید تھی۔ ریمان سے دوستی کی افواہ کی وجہ سے اپنی ساری دولت کے باوجود اودا کے لئے رشتے مفقود تھے۔ نرٹیند بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ایک پگلا سرمایہ دار۔ وہ بہن کے سیاسی رجحانات سے ہمیشہ نالاں تھا! اب اس نے بھی اودا پر شادی کے لئے زور ڈالا۔ آخر ایک روز اودا می خود ہی اگر ٹرٹراہٹ میں بابا سے کہہ گئیں کہ وہ اُن سے بیاہ کر لیں گی۔ شاید ان کی اسکیم یہ بھی رہی ہو کہ بیاہ کے بعد شوہر کی موجودگی میں ریمان سے ملنا جلنا اتنا قابل اعتراض نہ سمجھا جائیگا۔“

”میرے بابا بہت سادہ لوح ہیں۔ وہ کسی انسان کو برا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اودا کے وہ بھی مدّاح نہ تھے۔ اس کے باوجود، چونکہ اپنی جگہ سے اکھڑ چکے تھے، وہ کسی جذباتی سہارے کے متلاشی تھے اور اودا می ان کو بھی خوب FLATTER کر رہی تھیں۔ متر بابو جو شادی کی گفت و شنید ڈھاکے کے زمانے سے چلا رہے تھے بڑے کاستیاں بزنس مین تھے۔ بابا رائے خاندان کے داماد بن جائیں تو ان کے ذریعے وہ نرٹیند رائے سے اپنے دسیوں کام کھلا سکیں گے۔ کیونکہ نرٹیند داتنا ”برادوں صاحب اور بد دماغ مغرور آدمی تھا کہ کوئی فقو خیر اس کے پاس پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

”میں محو حیرت یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اصول پرست بابا نے مجھ سے ریمان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ پوچھا تھا۔ اودا می سے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بڑے شدید تناؤ میں وقت گزر رہا تھا۔

”اب دیکھو۔ کلاس کی پیدائشی خردماغی کبھی جاتی نہیں۔ اودا پرانی ”فیوٹرلور“ تھیں۔ بابا سے شادی کرنے والی تھیں مگر ہمارے کہنے سے اس طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھیں جیسے ہم غریب ریونیو جی لوگ ان کے محتاج کر رہے تھے۔

”میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بابا مطب جانے کی فکر میں تھے۔ چند رنج کی قیمت کا روپیہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شو نو اور ٹوٹو آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔ متر بابو کے گھر پر رنج

لوں کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ اب سبز منزل نے پشی مال سے لڑنا شروع کر دیا۔ بھوتانی دینی۔ گود
ہر۔ خود ایک لڑاکا خاتون۔ گھر میں روز کھٹ پٹ ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ ریڈیو
راؤں سے ذرا سی آمدنی ہو جاتی تھی۔ باقی وقت میں میوزیم یا کسی لائبریری میں گزارتی۔ مترابو کے
پس جلتے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اور اس چیز سے اور زیادہ کوفت ہوتی کہ ریمان اسی شہر میں موجود
اور ان کو معلوم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ ایک بے روزگار ریونیو جی۔

”ایک صبح میں دکتوریہ میوریل میں گھوم رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں میو سلطان کے
بالخالی کے پوڈریٹ کے نیچے کھڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سراج الدولہ بکلائیو۔ کارنواں
یو میر۔ اچانک اودادی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا وہ کسی انگریز کے ساتھ ہاں موجود
مجھے اس سے ملوایا۔ وہ ان کا لندن کا کوئی پرانا ہم جماعت تھا۔ کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اسے سیر کر رہی
پھر انہوں نے نہایت بلندی سے میرا تعارف کرایا۔ مس دیپالی سرکار۔ میرے بھائی
رے کی پرسنل اسسٹنٹ۔

”میں ہنگامگان کی شکل دیکھنے لگی غصے کے مارے میرا بھیجا آؤٹ ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا
کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی سٹریٹینڈ وولے کی پی۔ لے نہیں ہوں۔
اودادی نے جو اس وقت دکتوریہ میوریل کے اندر انگریز دوست کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی
تھے گھور کر دیکھا۔ اور کسی برطانوی ڈچر کے سے انداز میں کہا۔ ”اس کے متعلق ہم پھر بات کریں
یونگ برٹ۔

”انگریز بہت ہتھ بوتا ہے۔ وہ اس غیر متوقع محیٹے سے خاصا نادام نظر آیا۔ میں لالہ سیلی
اسے ہنٹ گئی۔

”اسی روز شام اودا رے مترابو کے ہاں پہنچیں۔ میں باہر چوہرت پر کھڑی تھی انہوں نے
زے ہی مجھے چھٹکارا شروع کیا۔ تم۔ تم کو میرے انگریز دوست کے سامنے مجھے جواب دینا
ہوئی۔

پہلے سے آگے بڑھ رہی ہیں اودادی۔ میں نے جواب دیا۔
مد سے تم آگے بڑھ چکی ہو۔ احسان فراموش۔ تم پہلے تاریخ سے زمیند کے آفس میں کام کر دینی۔

تجارتی جیسی لیفوجی لڑکیوں سے کلکتہ پٹا پڑا ہے۔ ہر چوتھی بنگالی لڑکی تمہاری طرح گاتی ہے۔ تم عجوبہ رہا نہیں ہو۔ یہاں تم کو ویسٹ بنگال کا گورنر کوئی نہیں بنا دے گا۔ بشکر کرو کہ میں نے نرملیندو کے دفتر میں ملازمت کا بندوبست کر دیا۔

”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے شرابی، بد معاش، بد دماغ بھائی کی سکرٹری بننا قبول کروں گی بہت سخت غلطی پر ہیں۔ ادا دیدی۔“
”میں نے اب ذرا سکون سے جواب دیا۔“

”میں تمہارے باپ سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے پیر شیخ کہا۔“
”کر لیجئے۔ میں نے جواب دیا۔“

”بابا اور مسٹر مٹر گھر پر موجود نہ تھے۔ پشی ماں کالی گھاٹ گئی ہوئی تھیں۔ مسٹر مٹر کان لگا اندر سے یہ سارا مکالمہ سن رہی تھیں۔ اومادیسی لٹے پاؤں والی کتیں جب بابا گھر آئے مسٹر یہ سارا قصہ ننگ مرچ لگا کر ان کو سنایا۔ بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نزد میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد مجھے آواز دی۔ میں باہر چوتھے پر آئی۔ اس رات میں اُد جانے کے بعد کمرہ بند کر کے بہت روتی تھی۔ بابا نے کہا۔ دیپالی ہمت سے کام لو۔“

”میں نے کہا۔ بابا کیا آپ واقعی اس خوفناک عودت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“
”وہ چیپ رہے۔ میں نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نرملیندو رائے کی پرسنل سکرٹری علاوہ ازیں سرپری تو ش اومادیسی کے لئے علیحدہ کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ آپ وہاں رہیں گے۔ ریحان آیا کریں گے۔ میں ریحان کی ساری عمر شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ کیسی ہولناک صورت حال ہے۔ بھ بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ اس روز میں نے پہلی بار بابا کے سامنے ریحان کا نام لیا تھا۔“

”بابا چند منٹ ننگ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ چلو۔ ہم اس ملک کو ہی خیر باد کہتے ہیں۔“
”واپس ڈھاکہ۔ میں نے پوچھا۔“

”ہیں۔ ٹری نیڈ آڈ۔ مکمل کا خط آیا تھا۔ اگر میں وہاں آنا چاہوں تو وہ میرے لئے وہاں کر سکتا ہے۔ کبھی بھی پلانیشن پر میڈیکل آفسیر کی جگہ لی سکتی ہے۔“

”بابا کے ایک چچا زاد بھائی مدین گدڑی ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپن چلے گئے تھے۔ ڈا

بہت پیسہ لگایا۔ ایک مرتبہ وطن آئے تو چند کنج آئے تھے۔ بڑھیا سوٹ۔ ہوانا سگار۔ میری ماں زندہ۔ انہوں نے جھینپ جھینپ کر گھر کا افلاس چھپاتے ہوئے ان کی میزبانی کی تھی۔ اب میں نے بابا سے مگر آپ اب اودادی کو کس طرح SHAKE OFF کریں گے؟

”بابا ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں ان سے کہوں گا شادی کے بعد وہ میرے ساتھ ٹری نیڈا دھلیں۔ نکار کریں گی۔ قحہ ختم ہو جائے گا۔

”ایسا ہی ہوا۔

”چندر کنج کی قیمت کا جو ردیہ باقی بچا تھا اس سے جہاز کے پانچ ٹکٹ خریدے گئے۔ بابا۔ ماں۔ میں۔ شو نو۔ ٹو نو۔ بہت لمبا بحری سفر کر کے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ کھوکھو آنے پر راضی نہ ہوا۔ نباسجھائی لیڈر بنتا جا رہا تھا۔ اندر آر۔ ایس۔ ایس میں شامل ہو چکا تھا۔

”ازدواجی زندگی کا آرام جو سپندرہ برس بعد ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا شاید بابا نے میری وجہ اس کی قربانی دی۔ پتہ نہیں۔ لشی یاں مجھ سے بہت خفا تھیں کہ گھر آئی لکشی کو واپس کر دیا۔

”ار سے وہ لکشی تھی کہ وہاں جان۔ ”یاسمین بولی۔ ”آپ سب کی زندگی اجیرن کر دیتیں۔

”یہاں پنچ کر میں نے لشی ماں کو سمجھایا کہ اشنان کر سیں میں بھی ہو سکتا ہے۔ جہا کالی ہر جگہ ہے۔

روں کی یہاں کمی نہیں۔

”یہاں سوشل رسوم انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیں۔ ہنومان جی کے مندروں میں پوجا بعد لوگ باگ چوراہوں پر آ کر فیسا کرتے ہیں اور کلیسو ڈانس۔ شو نو کو سمان فرسینڈو میں ٹوکرڈ ی ہے ٹو نو ونیزولا چلا گیا ہے۔

”للت سین سے میری شادی یہاں پہنچنے کے دوسرے برس مکمل چا جانے طے کرادی۔ اور میں بڑے ن سے مسز سین بن گئی۔ للت یہاں کے کامیاب ترین بیرسٹریں۔ پہلی بیوی اسپینش نژاد اور لا دلہ تھی عرصہ ہوا طلاق دیدی۔ شریف آدمی ہو، میں کافی خوش ہوں۔ بابا اور لشی ماں ہاں کے ساتھ بطور P.G. تھے ہیں۔ بابا کے مطب کے لئے دیکھو للت نے کیسا خوب صورت بڑی ٹاپ ہاؤس بنوایا ہے۔

یاسمین نے ذرا تعجب سے دیپالی کو دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی اور بولی۔ اس کا مطلب ہے

”آرا آیا بھی لینے دیناج پور کے رئیس کے ساتھ خوش ہوں گی؟“

”شاید۔“

”یہ مجبوریوں سے سمجھوتہ ہے یا سچی خوشی؟“

”معلوم نہیں۔“

ایک طویل امریکن کار بھاٹنگ میں داخل ہوئی۔ اسے دودی پوش نیگرو شو فر ڈرائیو کر رہا تھا۔ بھاری بھر کم اور کم رولت سین برلیٹ کیس منہالے کار سے برآمد ہوئے۔ رین ٹری کی سمت آئے ڈاکٹر بنوئے چند سرکار ٹری ٹاپ ہاؤس کی سیڑھیاں اترے۔ وہ چاروں باتیں کرتے اپنے کو لو نیل بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اندر ڈرائینگ روم میں نیگرو بٹلر پنچ کے انتظام میں مصروف تھا۔ یاسمین طویل برآمدے میں سے گزرتی ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ اس نے دریچے سے باہر بھاٹنگ کا بھونڈا دیہی ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہل چل کر مالا جب رہی تھیں۔ سامنے پالتو خرگوش اور اعلیٰ نسل کتے دوڑتے پھرتے تھے۔ نہایت پرسکون منظر تھا۔ یاسمین دریچے میں سے ہٹ کر وسیع ڈرائینگ روم میں ادھر سے ادھر بیٹھ قیمت سامان آرائش دیکھتی پھری۔ ایک بڑے ادنیٰ گراموفون کے نزدیک دیپالی سرکار کے پرانے ریکارڈ رکھے تھے۔ یاسمین نے گوک بھر کے سفید اور بھونڈے والا ایک ریکارڈ گراموفون پر لگایا۔ سوئی کہیں بیچ میں پڑ گئی۔ اچانک دیپالی کی آواز بلند ہوئی۔ کوئی کہے کالو۔ کوئی کہے گورو۔ لیو ہے۔ لیو ہے۔ بختاڑھول۔

یاسمین پر پھر بیزاری کا دورہ پڑا۔ اس نے سوئی اٹھائی۔ ریکارڈ پلٹا۔ کماری دیپالی سرکار دو سرابھن۔ سوئی پھر وسط پر پڑی۔ جو پہراوے سو ہی پہنوں۔ جو کھلاوے سو ہی کھا جہاں بٹھاوے تاہیں بیٹھوں۔ میرا کہے پر بھو۔

واہری عورت کی اوقات۔ یاسمین نے دل میں کہا۔

نیگرو بٹلر کمرے میں آکر بولا ”مس! پنچ از سرورڈ۔“

گراموفون بند کر کے وہ ایوان طعام کی طرف بڑھی۔ سامنے آتش دان پر روزی کی دستخ

شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ ”را دھیکا سانیاں۔ نئی دہلی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء“

۳۴ ایستھر گری بالا بنرجی

ڈھاکہ - مشرقی پاکستان - دسمبر ۱۹۷۹ء

مشن کمپاؤنڈ کے ایک کوارٹر کے سیننگ روم میں کروشیا کے میزبوش سے ڈھکی بڑی ہیز
تین تصویریں رکھی ہیں۔ مکمل - نیلا - ایلا - نئی دہلی - روزی کے بچے - پادری بنرجی آرام کرسی پر لکھیں
ند کئے لیٹے ہیں۔ ڈاکیہ سامنے سے گزر جاتکے - وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔
”روزی کا خط آیا؟“

”نہیں۔“ ایستھر گری بالا اسٹوڈیو پر بھات اُباتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔
”اتنے برسوں سے وہ آئی بھی نہیں۔ کب آئے گی؟ ہر سال انتظار کرتا ہوں کہ شاید اس کمرے
آجائے۔“

”پال۔ اس کے لئے یہاں آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ویزا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔“
”جب پارٹیشن نہیں ہوا تھا تب کونسا آتی تھی۔ اسے اب بھی ہم سے خرم آتی ہے۔ وہ ہم سے
میشہ سے چڑتی تھی۔ وہ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ ہم دیسی کرسچین غریب لوگ ہیں۔ مگر ہمارے مرنے کے
جلد سے شاید ہماری قدر آئے۔ ہم اس کے ماں باپ تھے۔“

چرچ سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو دو کمروں کا کوارٹر مل گیا ہے۔ عسرت سے گزر رہی ہے۔
لری بالا اچار چٹنی بنا کر بیچتی ہیں۔ دونوں کا باری باری موتیا بند کا آپریشن ہو چکا ہے۔ پادری صاحب
با آپریشن ٹھیک سے نہیں ہوا۔ ان کی بھارت زائل ہو چکی ہے۔ لیسوع۔ لیسوع۔ وہ جو آسمانوں
سے گذر گیا۔ لیسوع۔ شام کو گری بالا پادری صاحب کا ہاتھ تھام کر ان کو شہلا نے لے جاتی ہیں۔
سفید داڑھی۔ نابینا۔ پر نور چہرے والے پادری بنرجی سنان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے لیسوع
کے ایک حواری معلوم ہوتے ہیں۔ آٹے ٹوہا۔ آٹے ٹوہا۔

کل رات پادری بھرجی اپنے منہ سے جابلے۔ آخر وقت میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نہ دیکھ سکا۔
 گری بالانے روزی کو موت کی اطلاع کا تار بھجوا۔ اس کا خط آیا۔ ماما تم فوراً میرے پاس چلی آؤ۔
 لیکن برعین خزانہ ماما اپنے داماد کے ٹکڑوں پر پلنے نئی دہلی نہیں جائیں گی۔ اور نہ اپنے امیر زادے
 نواسوں کی آیا گیری کریں گی۔ مشن والے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ مشن اسکول میں ہوسٹل وارڈن کا کام
 دلوادیا ہے۔ مگر پرنسپل سے ان کی نہیں بنتی۔

ایک روز وہ رکشا پر بیٹھ کر ارجبند منزل پہنچی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بال ودھوا برہمن ہندو
 پندرہ سالہ بیٹی سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے کشتی پر بیٹھ کر فریدپور کے گاؤں سے بھاگ کر اپنے
 زمیندار آقا کے ہاں پناہ لینے ارجبند منزل ڈھاکہ آئی تھی۔ ایک بوڑھی عیسائی غریب بیوہ نے ارجبند منزل
 پہنچ کر نواب قمر الزماں کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

پنچالیس سال قبل، نو عمر قمر الزماں اپنی بنت عم علیہ بی بی پردم دے رہے تھے۔ مگر اپنی رعیت
 کی اس دلکش ہندو بال ودھوا کے قیر نظر کے بھی گھائل ہو گئے تھے۔ بوڑھے نواب قمر الزماں نے خود
 کر دروازہ کھولا۔ ایک پوپلے منہ والی پریشان حال ضعیفہ ان کے سامنے کھڑی تھی
 اسکول پرنسپل کے خلاف اس کی شکایات سن کر نواب نے کہا۔ "اے بیوہ! ارجبند منزل تمہارا
 گھر ہے۔ یہیں رہو۔ تم کو اس عمر میں ہم محنت مزدوری نہیں کرنے دیں گے۔"

"نواب صاحب۔ پال بڑے خود دار آدمی تھے۔ میں کسی بھی جگہ مفت خوردی کر کے ان کی روح کو
 تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مجھے کہیں کام دلواد کیجئے۔"

گری بالادیمبی کے اصرار پر نواب صاحب۔ ان کو یونیورسٹی کے گریڈ ہوسٹل میں کچن سپروائزر
 کی ملازمت دلوادیتے ہیں۔ دو سال بعد وہ بعارضہ منونہ مر جاتی ہیں۔ چرچ یا رڈ میں پال کے پہلو میں دفن کی
 گئیں۔ کسی کو علم نہیں کہ نئی دہلی کی مشہور دو تہمند ہوسٹل وکر رادیکا سانیال ان کی بیٹی ہے۔

نئی دہلی میں جس وقت روزی کو مسز بھرجی کی وفات کا تار ملا جو نواب قمر الزماں نے بھجوا دیا تھا
 بہ اپنی عالیشان نئی کوٹھی میں ڈنر کے انتظام میں مصروف تھی۔

بہان آچکے تھے۔ تار بسنت کمار سانیال نے لیا۔ وہ روزی کے پاس گیا جو چند غیر

لی ہمانوں کا سو اگت کر رہی تھی۔ ایک امریکن اسکالر اسکندہ کی تحریک کے بارے میں ایک امریکن فاؤنڈیشن کی فٹ سے کتاب بکھر رہا تھا۔ اس سلسلے میں روزی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بسنت کمار سانیاں سے کہا۔ ”مجھے مہوا ہے کہ آپ کی بیوی اسکندہ کے نمودنٹ کی ایک ہیروئن تھی!“ بسنت سانیاں دھیرے سے کہلایا۔ اس نے روزی کے ہاتھ میں وہ تار دیا جو ڈھاکہ سے آیا تھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ ”روزی۔ تم ہیروئن نہیں ہیں۔ تمہاری ماں ہیروئن تھیں۔“

جہاں آرا دیناج پور سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سب ارجمند منزل کے پھلے والے جمع تھے۔ اس کا بچہ اکل۔ والدہ۔ بھاوج۔ دونوں چھوٹی بہنیں۔ نیر الزماں نے اندر سے آکر کہا۔ ذرا اپنی جیتی یا سمن مجید کی حرکتیں دیکھو۔ یہ دیکھو لندن کے ایک اخبار میں اس کی تصویر کسی زیر سے شادی کر لی۔“

جہاں آرا نے ہینک لگا کر اخبار دیکھا۔ ”بلیک میوٹی ویڈیز۔ ڈارک ڈانسز یا سمن مجید ہیرو ٹیٹ پرنس چارمنگ۔“ ”ننگے پاؤں والی کالی رقاصہ کی شادی۔“

”معقول۔ اور یا سمن کیا رس کا گھوٹا ہے۔ بلیک میوٹی۔ ڈارک ڈانسز۔ حدیث ہو گئی۔“ نیر الزماں ہسٹلا کر کہا۔ ”جل پائے گوری کے مولولیوں کا خاندان۔ اور یہ انجام۔ ننگے پاؤں والی رقاصہ۔“

”اور وہ ننگوٹا انگریز کیا کرتا ہے؟“ بیگم قمر الزماں نے پوچھا۔

”ہوگا کوئی بھڑبھڑا۔“ نیر الزماں نے کہا۔

”فیشن ڈیزائنر ہے۔“ جہاں آرا نے اخبار چڑھ کر کہا۔ ”مگر جب دیہالی کا مری نیڈاڈ سے خط آیا اس نے لکھا تھا کہ یا سمن ڈانس کرنے پورٹ آف اسپین گئی تھی۔ اس خط میں تو کسی انگریز ونگریز کا ذکر تھا۔“ جیرلڈ ایڈرین بلونٹ۔ بہت خوب!“

یاسمین بلمونٹ، ڈارک ڈانسر

دیپالی دیدی۔ آپ کا خط ملا۔ اب آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ بہت عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جیرلڈ سے میں نے کہا تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ وہ مان گیا۔ نکاح کے لئے ہم نے ایک دوست کو بلایا جو پہلے باقاعدہ مولوی رہ چکے تھے۔ اب بے دین تھے۔ ہم سب پیسے نکل کر رات کے بارہ بجے ان کے گھر پہنچے۔ وہاں مزید مئے نوشی ہوئی۔ پھر مولوی صاحب نے نکاح پڑھا۔ دو لہا دہن مولوی گواہ سب نشے میں آوٹ تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے جیلی میں ایک میوزک کرائے پر لے لی۔ جیرلڈ کی آمدنی بہت اچھی تھی میں نے رقص ترک کر دیا۔ گھر ملاؤس والف بنی۔ بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام شہزاد رکھا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی میں نے پھر اپنا ڈانس ٹرپ تیار کیا۔

ایک روز اچانک اور بالکل غیر متوقع جیرلڈ میرے ٹرپ کے ایک بنگالی رقص کے ساتھ بھاگ گیا۔ معلوم ہوا دونوں پیرس میں ہیں۔ میں پتہ چلا کر نیرس پہنچی۔ ان کو ڈھونڈ نکالا۔ صبح کو میں ان کے فلیٹ پر پہنچی بنگالی چھوڑا۔ اسپرن باندھے گھر بیٹو عورتوں کے سے انداز میں اسٹو کے سامنے کھڑا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ جیرلڈ ڈریسنگ گارڈن پہنچے بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ گریسٹی کا یہ نظارہ دیکھ کر مجھے اُبکانی سی آئی اور میں بغیر کچھ کہنے سے لٹے پاؤں لندن واپس آگئی۔ پھر میں نے جیرلڈ کو لکھا کہ طلا آ دیدے۔ اور مہر ادا کر اس کا جواب آیا کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔ مولوی اور گواہ سب نشے میں دھست تھے۔ وہ نکاح نہیں تھا مذاق تھا۔ علاوہ ازیں ہم نے بلحاظ برطانوی قانون سول میرج نہیں کی۔ لہذا بچی کی پرورش کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ مجھے صفت نازک میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ تم لندن میں اپنا ڈانس اسکول اور یوگا کلاسیں چلاؤ کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ڈاؤن اینڈ آوٹ تھیں۔ اور وطن واپس جانے کے لئے کرایہ تک پاس نہ تھا۔ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری کفالت کرنے لگا تھا۔ محض ازراہ ہمدردی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں تم اچھے دوست رہیں گے۔

جیرلڈ کی والدہ جو ایک متمول اور نہایت کجغوس ریٹائرڈ ایجنٹ ایکٹرس ہیں وہ شہر زاد کو اپنے
 بچے کا دل لے گئی ہیں اور اس شرط پر اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں کہ وہ اسے روٹ کیتھولک اٹھائیں
 میں نے کہا روٹ کیتھولک کیا ہوٹن ٹوٹ، ہشتو، بدھسٹ کچھ بھی بنا دیکھئے۔ اسے میری طرح دھکے
 کھانے پڑیں۔ میں اب ایک دفتر میں کلر کی کر رہی ہوں۔ ڈانس ٹروپ چلانا بہت مشکل تھا۔ انڈیا
 آنے والے نامور ڈانسرز کا کچی ٹیشن بہت سخت ہے۔ پچھلے مہینے امید کی کرن نظر آئی معلوم ہوا
 یحیٰ بن الدین احمد آئے ہوئے ہیں۔ کچھلی مرتبہ پورٹ آف اسپین میں آپ کو میں نے بتایا تھا کس طرح یہ
 رت ایک زمانے میں میرا تعاقب کرتے رہے تھے۔ اب وہ منسٹر تھے اور یہاں ایک وفد کے ساتھ آئے
 اور ڈور چیمبر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے فون کیا۔ ملنے کی کوشش کی۔ انہوں نے صاف ڈال دیا کہ
 نہ مصروف ہیں۔ پھر میں نے سنا، انھوں نے کہا ”پرانی شناسا اب سب قریبی دوست ہونے کا دعو
 تے ہیں۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ یہ کام کروادو۔ وہ کام کروادو۔ میں کس کس سے ملتا بھرتوں۔ جس
 ملنے سے انہوں نے یہ کہا۔ اتفاق سے وہ مجھے بھی جانتا تھا۔ اس نے اگر مجھے بنایا۔

جہاں آرا آپا سے آپ کی خط و کتابت ہے، میں نے ان کو لکھی خط لکھ جواب نہیں آیا۔ غالباً
 بند منزل والے بھی میرے طرز زندگی سے سخت متنفر اور بیزار ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ زمین او
 ن میرے سامنے سے بھاگ گئے۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملی۔

آپ کی یاسمین بلونٹ

۳۶ پالیٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ

لاڈا اسپیکر پر دہرایا جارہا تھا۔ مسز دیپالی سین۔ مسز دیپالی سین۔ وی۔ آئی۔ پی۔ لافچ۔ ٹر
 آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مسز دیپالی سین ٹی۔ ڈیلو۔ اے کی مسافر۔ پورٹ آف اسپین کی مس
 پالی سین —

ششدر اور مضطرب وہ مسافروں کی بھڑ سے نکلی۔ پاکستان ایر فورس کے یونیفارم میں

ملبوس ایک سانولا نوجوان اس کی طرف آیا۔ ”دیپالی آنٹی۔“ اس نے ذرا جھجک کر پوچھا۔ ”میں مکمل ہوں۔ امی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کی فلائٹ بہت لیٹ تھی۔“ وہ پائلیٹ آفیسر مکمل حسین مرشد زادہ کے ساتھ وی۔ آئی۔ پی۔ لاؤنج کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کے اندر ڈھکی ملل کی سفید ساری میں ملبوس ایک غلین آنکھوں والی دہلی پتلی عورت، کھچڑی خیر مقدم کے لئے مصروف سے اٹھی۔ دیپالی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”یہ امی ہیں۔“ نوجوان مکمل نے ذرا گھبرا کر کہا۔

”میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی دیکھو اتنی دور سے تمہارے بیٹے کی شادی میری شرکت کے لئے آئی!“ دیپالی نے مصنوعی ایشامت سے کہا۔ جہاں آرا کو اس حانت میں دیکھنے کی ذمہ داری میں خود ہوں۔ میں ریمان کو آسانی سے بھلا سکی۔ لیکن ریمان کا رح سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ زندگی کی بربادیوں کا یہ کیسا لاتنا ہی سلسلہ ہے۔ اس نے آرا کو آنکھوں والی جہاں آرا پر بھر نظر ڈالا دوسال قبل وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ مکمل اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔

دیپالی نے اتنی شان، وغیرت پہلے ارجمند منزل میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُدمارے کے دو دروازے میں بھی نہیں۔ پاکستان کا نیا اوپری طبقہ واقعی سید متوال ہو چکا تھا۔ دلہن بھی ایک ملک التجار کی لڑکی جب مکمل کے سہرا باندھا جانے لگا جہاں آرا وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کونے میں جا کر اپنے رجو شوہر کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ دیپالی نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہندوستانی۔ خیر۔ پاکستانی۔ عورت! خلائق رضی اسے ایک ایسے عیاش بن بد قوارہ بد ہیئت شخص سے برباد کیا جس نے ساری عمر اسے جلایا۔ مگر اس نے دوسروں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی حمایت کی اور اس کی خدمت گزار رہی۔ اور اب اسی یاد کے روبرو تھی۔

چند سال قبل جہاں آرا کی چھوٹی کنواری بہنیں انجم راور اختر آرا اپنے بھتیجے منور الزماں سے ملنے لندن جا رہی تھیں جو وہاں اسکول میں پڑھتا تھا۔ طیارہ آپس پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ سارے مسافر ہلاک ہوئے۔ بروٹ میں لاشیں بھی نہ ملیں۔ اس دہشتناک جو انفرگ کے صدمے نے ان کی ماں بیگم قمر الزماں کی جان لی۔ نواب قمر الزماں، اس کے بعد سے بہت کم لوگ جتے۔ اس وقت یتیم نواسے کی شادی کے عہدے میں

میانے کے نیچے ترکی ٹوپی اوڑھے (اگلے وقتوں کے لوگ ننگے سر رہا خلافت تہذیب گردانتے تھے) گورنر اور اعلیٰ افسروں سے ایک آدھ بات کر لینے کے بعد پھر خاموش ہو گئے۔ صوفے پر گم صم بیٹھے رہے۔ کی نظر دیپالی پر پڑی جو ایک طرف کھڑی جہاں آرا کی پرانی خادمہ مالا سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے اشارہ کے لئے اپنے پاس بلایا۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ وہ دونوں چپ چاپ سامنے کی چل سیل کا نظارہ کیا کرتے۔ دیپالی کی آنکھ بھڑائی۔ اس نے چپکے سے آنسو پوچھے۔ نواب صاحب نے دیکھ لیا۔ آہستہ سے ”رونا نہیں چاہئے بیٹی۔ بُری بات ہے۔ صبر کرنا چیز ہے۔“

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کے بھانجے ریحان الدین احمد۔۔۔ میں ابھی ان سے نہیں مل کر آ رہی ہوں۔“

نواب صاحب نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو آہستہ سے قالین پر کھٹکھٹایا اور ذرا توقف کے بولے۔ ”ریحان اب وہاں بڑا آدمی ہے۔ اپنی پرانی سیاست چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گیا۔ منسٹر بن گیا ہے۔ اب کیا کر رہا ہے؟“

”اُومارائے کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے بھائی کی کوئی بہت بڑی بزنس ہے۔ ردوائں ایک فرم کے جنرل منیجر ہو گئے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کھوکھو کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے لن کوفون کر سیکر آنے کی خبر دی۔ خود ملنے نہیں آئے۔ اپنی کار بھیج دی۔ میں، کھوکھو اور اس کی بیوی اُومارائے کے علی۔۔۔ روڈ گئے۔ کوٹھی کی دوسری منزل میں اُومارائے خود رہتی ہیں۔ نیچے ایک دنگ میں ریحان اور اُن کی بیوی اور لڑکا۔ چند روز ہوئے لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُومادی کے بھائی نرملیندورائے نے اب شادی نہیں کی۔ چوبیس گھنٹے شراب میں غرق منگال کلب میں بیٹھا رہتا ہے۔ سارا کاروبار ریحان ہاتھ میں ہے۔ سنا ہے چند ماہ کے لئے منسٹر بنے تھے نرملیندو اور اُومارائے کے اس کاروبار کو۔۔۔ فائدہ پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ ان کے اور زیادہ احسان مند ہیں۔ ریحان صاحب اپنے تے لڑکے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ مجھ سے کہتے لگے باغی ہو کر گھر سے نکل گیا۔ تیرہ سال لڑیں۔ ابھی سے شاعری کرتا ہے۔ بھوک کی پیڑھی کا ہمدرد شاعر۔“

نواب دسترالزماں نے جو سر آگے بڑھائے بغور سن رہے تھے۔ ایک لمحت ایک تلخ قہقہہ بلند۔ لوگوں نے اچھی سے انہیں دیکھا۔ انجم آزاد اور اختر اراکی موت کے بعد آج وہ پہلی بار بیٹھے تھے۔

بنگال کے ایک قدیم کوئی ابھی خند نے کہا تھا "تالاب کنول سے بھر گئے بہار میں کھسکیاں آم
بور پر جمع ہیں۔ مسافت چھوٹی ہو تب بھی، ہوا جب گاڑی کے راستے میں رقص کرتی ہے، غریب الوطن
دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔" اور دھکا کہ سے پورٹ آف اسپن کا راستہ بہت طویل تھا۔ واپس جانے سے
قبل اس آخری غم وہ سنگ مرخ کے تالاب کے کنارے پرانے "راج سنگھاسن" پر بھی جہاز
سے باتیں کرتی رہی۔ اس نقلی شاہی تخت پر لوگوں میں یہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں۔

معاذیں آرا نے پوچھا: "ریحان بھائی کی دلہن کیسی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

"عام سی گھریلو بی بی ہیں۔" دیپالی نے جواب دیا۔ "غریب شریف گھرانے کی لڑکی۔ بتا رہی تھی
اُومارائے کے بھائی نرملیندر رائے نشے میں نین کا دھلا سہ سے تھے۔ گارڈن ریج میں۔ ان زہرو بی بی کے با
اُن کی کار کے نیچے دب کر مر گئے۔ وہ ایک غریب کاریگر تھے۔ زردوز۔ جن کے دادا کھنڈو سے کلکتے آ گئے
تھے۔ اُومادیدی نے تنگم کر کے بھائی کو پولیس کچہری سے بچا لیا۔ متوفی کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ماں مر چکی
بھائی اُدھر نکل گئے تھے۔ اُومارائے بطور تلافی اس یتیم بے سہارا لڑکی کو اپنے ہاں اپنی نئی کوٹھی میں لے
آئیں۔ اپنے دارڈروب کی دیکھ بھال اس کے سپرد کر دی۔ رہنے کے لئے ایک کوٹھری دیدی۔ زردوز
لڑکی سینے پر رونے میں غاق سلیقہ مند۔ احساس کمتری کی شکار۔ ریحان صاحب جو حسب معمول اُوم
کے ہاں آتے رہتے تھے انہیں یہ لڑکی بھاگتی۔ یہ پارٹیشن کے ڈھانچے تین سال بعد کی بات ہے۔ ریحان صاحب
کے دل میں جانے کیا نیکی آئی ایک دن اس بے چاری مظلوم لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اُوماس کے ساتھ
بڑی ساس مند کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ ریحان بھی اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے۔

"اُومارائے کا ایک دلچسپ مشق ذہن ہے بتایا۔" دائم المرنجی ہیں۔ سیاست سے کب کی کن رہ کٹر
ہو چکی ہیں۔ صبح سویرے اُٹھ کر نزدیک بیلوڈ پر چلی جاتی ہیں۔ ایک ملازم چھپرہوں اور ہڈیوں کا برتن لے
کر پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ سڑک اور باغ کے سارے آوارہ بلیوں اور کتوں کو ناشتہ کراتی پھرتی ہیں۔ پھر کوڑ
کو دانہ ڈالتی ہیں۔ گھر واپس آکر ریحان کی بیوی سے تجھائیں جھائیں کرتی ہیں۔ ریحان غموں گھر سے باہر رہتے ہو
واٹ لے لائف۔"

جہاں آرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اٹھ کر مغرب کی نماز کے لئے اند چلی گئی۔ باورچی خانے کی
طرف سے رات آتی نظر آئی۔ ریحان کی چھوٹی بہن رابعہ جو اکمل کی شادی کے لئے اپنے گھر عظیم پورے سے

دز کے لئے ارجمند منزل آئی ہوئی تھی۔ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ شفق رنگ پر نظر ڈالی اور کہا۔ ”میں بھی نماز پڑھاؤں۔ ناقروہ کو تمہارے پاس بھجی ہوں۔“

”ناقروہ نماز نہیں پڑھتی۔“ دیپالی نے پوچھا۔

”نماز۔۔۔ وہ خدا ہی کو نہیں مانتی۔ وہ اپنے ماموں پر پڑی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ مولانا الدین احمد کامیٹا اور نواسی دونوں ملکر۔“ رابعہ نے جواب دیا اور تیز چلتی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد اس کی لڑکی ناقروہ نجم السحر ارجمند منزل سے باہر آکر ”راج سنگھاسن“ پر ہلک گئی۔ حساس، ذہین چہرے والی بیسٹ مال لڑکی تھی۔ اور ایک جوشیلی اسٹوڈنٹ لیڈر۔ لگ بھگ اسی پر نے انقلابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیپالی نے سوچا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دیپالی کی ہمہ مت دوستی ہو گئی تھی۔ ناقروہ سے ایسٹ پاکستان کی پیچیدہ سیاست کے قصے سناتی رہی تھی۔ مولانا فی کی عوامی لیگ۔ بالیسال اور کھٹن کے قوط۔ جیسو ر کی زرعی تہجکا خریک۔ پولس فائرنگ۔ کابجی ٹیشن۔ پولس فائرنگ۔ مظاہرے۔ آدم جی جوٹ مل کا فساد۔ عوامی محاذ۔ جیل یا ترائیں۔ بنگال۔ ست کا پرانا نقشہ۔ ادھر مغربی بنگال میں بھی تقریباً ہی سب ہو رہا تھا۔

”میں تمہارے ماموں کے متعلق تمہاری جہاں آرا خالہ کو بتا رہی تھی۔“ دیپالی نے کہا۔

”مجھ ان کے متعلق سب معلوم ہے۔“ ناقروہ نے ناگواری سے جواب دیا۔ ”امی اپنے بھائی کو ہمیشہ میڈیلیٹیز کرتی رہی ہیں۔ اور جہاں آرا خالہ بھی۔ اور شاید۔۔۔ آپ بھی۔ مگر ہم لوگ آپ سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھڑکھوٹا پچان لیتے ہیں۔ ماموں جانتے۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش دادی۔ محترم نخل گڈول۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ برسوں نیویارک۔ آج اس پوٹیشن پارٹی میں ہیں کل اس جہاں مشر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں، ادھر کوڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔“

نیرجا بنداری اسے کہتے ہیں۔

”ناقروہ۔۔۔“ دیپالی نے رسائیت سے کہا۔ ”کل کے باغی آج کے ایسٹبلیشمنٹ میں شامل ہو چکے۔ آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے ایسٹبلیشمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔“

ناقروہ نجم السحر استہزائے ساتھ ہنسی۔

”دیپالی آنٹی۔۔۔ معاف کیجئے گا آپ عمر کی اس ایسٹ پر سنج چکی ہیں جہاں انسان

کو ایک دفاعی ہتھیار۔ ایک زہ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔
 دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا: "ناصرہ ڈیر۔ تم نے ایس ان ونڈر لینڈ پر بھی ہے؟"
 کی وہ نظم یاد ہے۔

YOU ARE OLD FATHER
 WILLIAM, THE
 YOUNG MAN SAID
 AND YOUR HAIR HAS
 BECOME VERY
 WHITE
 AND YET YOU INCESSANTLY
 STAND ON YOUR
 HEAD —

DO YOU THINK, AT
 YOUR AGE
 IT IS RIGHT ?

ناصرہ بھی ہنسنے لگی۔ اور بولی۔ "یہ بات تو آپ کے پنڈت نہرو سے کہنی چاہئے۔"
 مالا اندر سے قہقہے کی ٹہلے لے کر آئی اور اسے تخت پر رکھ دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد
 دیپالی نے کہا۔ "ناصرہ۔ تم جہاں آرا سے مٹی رہا کرو۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ بید تھا ہے۔ نیر الزما
 کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی۔ دیناج پورا اپنی سسرال میں اب وہ رہنا نہیں چاہتی۔ ماں مر گئیں۔ دو جوا
 بہنوں کی خوفناک موت کا غم سہہ چکی ہے۔ باپ چراغ سگری ہیں۔ اور وہ ان سے ہمیشہ سے خائف رہے
 ہے۔ شوہر مر گیا۔ جیسا کچھ بھی تھا۔ اب لڑکے نے اپنا گھر بسایا۔ وہ کتنی اکیلی ہے۔"
 "ہوں گی۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے
 تھا؟ مجھے بھی وہ بید پسند تھا۔ مگر میرے باپ معمولی آدمی ہیں۔ کلاس ٹو انسر۔ ہم لوگ عظیم لوگوں

بہت معمولی سرکاری فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ہماری کوئی سماجی حیثیت نہیں۔ جہاں آراء خالص اپنے اظہار کے خواہش رکھنے کے ایک گروپ کی اندر سٹریٹ کی رکھی بیاہ لائیں۔ یہ طبقہ ناقابل معافی ہے۔ جب میں پیدا ہوا تھا جہاں آراء خالص نے میرے بڑے چاچو چچے کئے تھے۔ میرا نام نجیم السحر انہوں نے ہی رکھا تھا۔ اتنی کو بنا کر دیتی تھیں۔ گویا ہماری سرپرستی کرتی تھیں۔ ہم لوگ ان کے POOR RELATIVES تھے۔

اب بھڑک کر اس نے ایک کنکریٹھیا لے کر اسے زور سے تالاب میں پھینکا اور بات جاری رکھی۔ ”اور یہ لوہاں۔ ہمارے نانا۔ یہ اب تک اس گھر میں رہے ہیں کہ ان کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے۔ ناکام رہے۔ زندگی ان کی سیاسی داؤ پیچ میں گزری۔ اولڈ گارڈ مسلم لیگی۔ جب یہاں زبان کا ایجنسی تھیں ہوا انہوں کی موافقت میں آواز اٹھائی۔ جلوس نعرے لگاتا یہاں ارجمند منزل کے پھاٹک پر آیا۔ اردو بھاشا۔ اردو بھاشا چوبے نا۔ یہ اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر تو پی اوٹھے برآمدے میں جا کر چلائے۔

پہلے۔ ضرور چوبے۔ جلوس اتنا مشتعل ہوا کہ پھراؤ کر دیتا۔ بچ گئے۔ اب یہ ایک پولیٹیکل میک اندر فرسٹریٹڈ۔ لیکن یاد رکھیے۔ ”اس نے منگھا سن پر سے اٹھ کر خطیبانہ انداز میں کہا۔ یہ نہ سمجھئے ہم لوگ اردو امپریلزم کے خلاف ہیں یا مغربی پاکستان جو ہمارا استحصال کر رہا ہے اس سے متنفر ہیں تو اسے ہم انڈیا سے جا ملیں گے۔ ہرگز نہیں۔ جہاں انڈیا سے مقابلے کا سوال پیدا ہوا ہم پاکستان کی حقارت کے لئے کٹ مریں گے۔ ہم بچے پاکستانی ہیں۔ اچھا دیپالی آئی۔ اب میں چلوں۔ کل آپ کو اپرپورڈ نے آجاؤں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اس وقت کہاں جا رہی ہو۔“

”گھر۔ عظیم پورہ۔“

”تم شادی کے لئے یہاں ارجمند منزل میں نہیں ٹھہری ہو۔“

”ہرگز نہیں۔ اتنی آگئی ہیں۔ وہی ان لوگوں کی محبت میں ٹھکی جا رہی ہیں۔ میں روزانہ آپ سے ملنے جاتی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔“

دیپالی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ روش پر سے گزر کر سرعت پھاٹک کی طرف چلی گئی۔

نے رات کی تاریکی میں ڈوبی کافی آلودار جمند منزل پر نظر ڈالی۔ اندر کمروں میں تیز روشنی ہو رہی تھی گہما گہمی۔ بہانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ رات بعد اٹکل اپنی دلہن کے ساتھ مغربی پاکستان واپس

جانے والا تھا۔ وہ پشاور اور فورس اسٹیشن میں تعینات تھا۔ اپنی کرن ناصرہ کی طرح وہ بھی بڑا شدید قوت پاکستانی تھا۔ پاکستان کی دفاعی سرودیں کا ایک فرض شناس جوشیلا، محب وطن ہوا باز۔

۳۷

شنکری کا ناچ

نئی دہلی

۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر دیپالی

تمہارا خط آیا تھا۔ جلد جواب نہ دے سکی۔ اپنی شدید پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا تھی۔ میرا کمبل اب فوج میں لفٹنٹ ہے۔ وہ محاذ پر لڑ رہا تھا۔ خدا باپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خیریت سے آگیا۔ مگر ایک بری خبر سناتی ہوں۔ جہاں آرار کا بیٹا اکمل جموں پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ سکتی ہوں کہ جہاں آرار بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ اس بے چاری کی شادی میں شرکت کے لئے پچھلے سال ہی وطن آئی تھیں۔

جب کمل اور اکمل پیدا ہوئے ہیں تو یاد نہیں کس نے یا تم نے یا میرے شوہر نے کہا تھا کہ کہے پہلے ا (حادثہ) لگانے سے اس لفظ کی ضد بن جاتی ہے۔ سچ یہ نام ہی منحوس نکلا۔

موجودہ صورت حال میں جہاں آرار کو تعزیت کا خط لکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا قیامت ہے اور جہاں آرار ٹیگور کا "شنکری ناچے" اتنی گنجیمینٹل اومبرے ڈمر دواجے "بہت گایا کرتی تھیں۔ بے چارہ اکمل مرشد زادہ نیل اومبرس ڈمر دوجا نے گیا اور اس کے اپنے پر خچے اڑ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر تمہاری شنکری زوروں میں ناچ گئی۔ تم وہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ خوش قسمت ہو۔ بچ دو دو۔

پیرسٹر صاحب کو سلام۔

تمہاری

رندی

۳۸ گڈلک ڈائری

۴ جنوری ۱۹۶۶ء — ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء — ۱۹ رمضان ۱۳۸۶ھ — ۱۸ اپریل ۲۰۲۳ء

نام: یاسمین بلونٹ

دفتر کا پتہ:-

گھر کا پتہ:-

ٹیلیفون نمبر:-

کار نمبر:-

ڈرائیونگ لائسنس نمبر:-

ٹی۔وی۔ لائسنس نمبر:-

بینک اکاؤنٹ نمبر:-

پاسپورٹ نمبر:-

لائف انشورنس پالیسی:-

بلڈ گروپ:-

عینک نمبر:-

آج سال نو ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نئی نویلی ڈائری کو شروع کرتی ہوں۔ جو ڈھاکہ سے کوئی آنے
مجھے لے گیا ہے۔ نام ہے "گڈلک ڈائری" اس میں میں لکھ رہی ہوں۔ لہذا اس کا نام "گڈلک ڈائری"
چاہئے۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ میں تیری ناشکری نہیں کرتی۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ اللہ
نہ کرنا۔ اللہ تجھ پر میرا سارا حال روشن ہے۔ میرے گناہوں کو معاف کرنا۔ تو بخور و رحیم ہے۔ میں نے
افرائیاں کیں۔ اپنے حافظ قرآن مولوی باپ کو صدمہ پہنچایا۔ اسٹیج پر ناچی گائی۔ مشرک سے بیاہ کیا۔
احرار نکاح ہی نہ تھا۔ بیٹی کو عیسائی بنوا دیا۔ اللہ میں تیرے غضب کے خوف سے تھر تھر کاہتی ہوں۔

مجھے مذاقِ قبر سے بچاؤ۔ اللہ تجھے اپنے حبیب کا واسطہ۔

آج صاف نو ہے۔ میں نے سینئر مسز بلونٹ کو ٹرانک کال کی تھی کہ نئے سال کی مبارکباد اپنی بیٹی
دون۔ معلوم ہوا دادی پوتی دونوں ماس کے لئے چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرنا۔ اللہ میں اپنے حال
اپنی مجبور یوں کا شکار تھی۔ اللہ تو میرے سب مصائب یا مجبور یوں سے واقف ہے۔ پھر کبھی مجھے
ذراے گا ؟

ڈیر ڈائری۔ اس ملک کی عورتوں کے بھی خونِ سفید میں۔ شہر زاد بیمار پڑی ہے۔ بڑھیا۔ مسز
نے اسے ہسپتال میں ڈال دیا اسے دیکھنے بھی نہیں جاتی۔ وہ گاؤں یہاں سے اتنی ذرا ہے۔ صبح کو ٹرین سے وہ
رات کو تھکن سے چور ٹرین سے لوٹو۔ صبح سویرے پھر فیکٹری وقت پر پہنچو۔ یہ بے کیفی مسلسل محنت، جا
کی زندگی کب تک چلے گی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تمہارا دل کمزور ہے۔ ڈاکٹر کرنا بالکل چھوڑ دو۔ میری بیٹی
شہر زاد جس کا اب پورا نام شہر زاد کرشنا جو ز فین بلونٹ ہے۔ مجھ سے کہتی ہے۔ اس کے دین میں احساسِ جز
اور احساسِ گناہ کی شدت ہی بخشش کا باعث بنتی ہے۔ بہت سے راہب اپنی پیٹھ پر خود کو ڈرے لگا
ہیں۔ تو کوٹے تو مجھے زندگی ہی لگا رہی ہے۔ اللہ میرے عیوب سے چشم پوشی کرے۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ پرموں شام میں شیریں کو دیکھ کر ہسپتال سے باہر آئی۔ گاؤں کی خاموشی
سڑک شدید بارش میں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی میں بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ شیریں مجھ سے ہر
رکھائی سے پیش آتی تھی۔ شاید اس کی دادی نہیں چاہتی کہ میں اس سے زیادہ لمبے لمبوں۔ شہر زاد ابھی ٹانگا
براہر چھو کر رہے مگر اپنے باپ کی طرح بے رحم اور کائناتوں اور دادی کی طرح سرد مزاج۔ وہ شاید بھی نہیں
چاہتی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی ماں ایک کالی عورت ہے۔ اس کا اپنا رنگ سفید ہے۔ سبز آنکھیں۔
چوکیٹ بال۔ اپنے حسین و جمیل باپ پر لگی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دو غلام ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ آج وہ مجھے
صاف صاف کہہ رہی تھی "میں تم بار بار ہر ہفتے مجھے دیکھنے اتنی درد سے کیوں آتی ہو۔ مت آیا کرو۔ میں اچھو
ہوں۔" میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں باہر کرسمس ان اسٹاپ پر کوچ کا انتظار کر رہی تھی۔ مینہ زیادہ تیزی سے
لگا۔ بارش کے قطروں اور میرے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اللہ اللہ کہتے ہوئے میں چہرے پر اوٹ کر کے ذرا پیچھے اس اجنبی نے مجھے اللہ اللہ کہتے سن لیا۔ اُنہم میں بڑے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔ کیا آپ کا کوئی اس ہسپتال میں ہے؟

میں نے جھجک کر اس کی صورت پر نظر ڈالی گورا چٹا، لمبا تڑنگا۔ پنجابی یا پٹھان۔ خاصا خوش شکل برساتی ہے۔ وہ بھی اسی کوچ کا منتظر تھا۔ اس کے درد مند لہجے کے یہ دو بول سن کر میں جو اس وقت اس لمحے اس اتنی دنیا میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے تاریک طوفانی کی لہروں پر ایک روشن محفوظ ٹوکا اچانک نمودار ہو گئی۔ میں نے مومنیت کے ساتھ اُسے جواب دیا۔ میری ہسپتال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اگلے ہفتے اُسے ڈسچارج کر دیں گے۔

تو پھر میں اس بڑی طرح بلک بلک کر رد کیوں رہی تھی۔ اس نے وجہ نہ بوجھی۔ روشن کوچ سلیٹی رول میں سے نمودار ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے بتایا بیڈ فڈ سے آرہا یہاں پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اُسے ایک گیراج میں چھوڑا اب بس پکڑ کر شہر جا رہا ہے۔ آبائی وطن۔ یہاں ملا ہو رہے آیا ہے۔ بزنس کرتا ہے۔ باتوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا آپ ہیں۔ مگر اردو اتنی صاف کیسے بولتی ہیں اور وہ بھی پنجابی لہجے میں۔ میں نے بتایا میں برسوں سے لندن کی ایک لارمنٹ فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہوں جہاں میری ساتھ دایاں سب پنجابی عورتیں ہیں۔ جی ہاں۔ میں ہوں لیکن ہول سیل قمیض سیتی ہوں۔ ناکام ڈانسر۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج شام میں اور مقبول دیر تک ہیمپٹن کورٹ کے باغات میں ٹہلتے رہے۔ اٹھا غریب بارنزمیں ایک قیمت بڑا مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ مگر کواشارہ کافی ہے۔

مقبول کہتا ہے میں فیکٹری میں مزدوری کرنا چھوڑ دوں اور اس کی فرم میں کام کروں۔ چار گنی زیادہ تنخواہ لے کیوں دل گھورا نہیں کرتا۔ میں اس کی احسان مند نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے بہت سے فائدے۔ پھر میں اس کی حازم ہو جاؤں گی اور وہ میرا آگے۔ نہیں۔ یہ بات غلط ہوگی۔ جہنا اللہ؟

اُتو مجھے صراطِ مستقیم پر چلائے جائیو۔ آمین۔

جب شہزاد چھوٹی سی تھی۔ میں اور حیرلڈ جیلسی کی ایک میوزیم رہتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر ایک دیکھا تھا۔ AUTUMN CROCUS ایک غریب اسکول بچہ جس کی زندگی میں کوئی رنگ اسپنسر۔ کم مایہ۔ وہ پیسہ جوڑ کر تحقیق گزارنے سوئٹزرلینڈ جاتی ہے۔ وہاں سے ایک بڑا دایرہ سا شے ملتا ہے۔ نہایت اداس۔ ہلکا پھلکا غناک سار دانس۔ چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آدمی اپنے ملک چلا ہے۔ اسکول بچہ اپنی اجاڑ زندگی میں واپس انگلستان آ جاتی ہے۔

بڑھیا مسز بلونٹ نے آج تک مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ حرامزادی۔ شہزادہ کوئی ہے بہت خوبصورت درمندر مکان ہے۔ بہت بڑا باغ۔ بڑھیا اپنی جوانی میں وینڈا میں بھی ناچ چکی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔ شیری اسی مٹے اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ بڑھیا اپنے اکلوتے لڑکے حیرلڈ کو حلق کر چکی ہے۔ شہزاد نے آج تک مجھے کوئی معمولی سا تحفہ خرید کر نہیں دیا۔ ہاں پھلی کر مس پر ایک ہینڈ بیگ لے آئی تھی۔ سال میں ایک دوبار مجھ سے مل لیتے۔ خیر خدا سے خوش رکھے۔ آبا مجھے ماق کر چکے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں نے مجھے بھلا دیا۔ شاید وہ میرا ذکر بھی کرتے ہوں گے تو اس طرح کہ چل پائے گوری کے مولویوں کے خاندان کی لڑکی اور اداوارہ نکل خاندان کی ناک کشادی۔ خیر میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میرے ہم وطن جب کبھی یہاں ملتے ہیں خصوصاً دھاکے والے بڑے جوش سے کہتے ہیں۔ کراچی آجائے۔ آپ کے لئے حکومت ڈانس ایکڑ می بنا رہے گی۔ ج نے اس کے لئے خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے کوئی جواب ہی نہ آیا۔ میں بہت کمزور، بہت غیبراہ معمولی ہستی ہوں۔ کون میری سنے گا۔ وہ تو بالکل شروع شروع کی بات تھی۔ ایک بنگالی منسٹر کو خوش کرنا تھا جس کی سفارش پر حکومت نے میرے فارن ٹور کا بند دہست کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں ٹا۔ ڈیر ڈاکری۔ دنیا بہت ہی ذلیل کیسی جگہ ہے۔ منسٹر ریحان الدین احمد کا رعیت دیکھا؟

فیکٹری میں میرے ساتھ کی دو بچی لڑکیاں بہت اچھی سنگرز ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے نو

مرنے نے مینوں ہشک نہ ملاں
مینوں مرن دا شوق مٹا دن دے
کجری بیناں میری عورت د گھدی
میںوں بچ کے یارہ مناداں دے

لاچی میں بندر روڈ کے جھنگلے اوچے فلیٹوں کے نیچے رات کے وقت ایک اندھا فقیر سر پر گول ٹوپی۔
نا انگلی تھامے آنکھیں۔ اور منہ اٹھا کر چلاتا۔ اے گم کے مارو۔ خدا تمہارا گم دھند کرے۔ اوندھ فشتا
یا دلہو ز آواز میں کانے گھتا۔ دھنی حال کی جب ہیں اپنی خبر۔ رہے دیکھتے اھوں کے غیب و ہجر
یوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۶۷ء ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ ۱۵ سادون ۲۰۲۳ء

۱۳۷۵

لک ڈائری۔ اس برس کے بھی سات مہینے نکل گئے۔ اور ابک اکیلا تنہا انسان اوداتے سارے
سا گھیرا ہوا ہے۔ کیوں؟ مسیحی۔ اسلامی۔ بنگالی۔ بکری۔ اور شاید ایرانیوں کا ایک اور کیلنڈر
اس ڈائری کے چھاپنے والوں نے ایرانی کیلنڈر بھی کیوں نہ شامل کر دیا۔ ذرا وقت کا کنفیوژن

ی رے۔ اور درنگین کشتی والے طالع۔ کشتی موٹے۔ اس گھاٹ سے لگا دے۔ یہ ندی کرب تک
گی۔ اس ناؤ کو کب تک کھینا ہے۔ کس دھن میں شام سویرے کس دھن میں چلا جا تک ہے۔ تیرے
بھیے ہیں۔ بھائی مانجھی۔ کیا اس دیا کا کوئی انت نہیں۔ اس کا کوئی سرا نہیں اوانجھی رے۔

مانجھی رے بھائی۔ اب ہاتھ تھک گئے۔ کشتی کھینے کی اب سکت نہیں میں نے دریا لے خالھ

ممت بھی چپوہ چلائے۔ پر اب ہمت نہیں۔ ادا نہجی رہے۔

یہ سارے بھٹیالی گیت بار بار یاد آتے ہیں میرے دکھی مظلوم خوبصورت دلہن کے ملاح
لدوز گیت۔ کیا میں کبھی واپس جاسکوں گی؟

آج میں نے دیپالی کو خط لکھا۔

ردزی۔ اپنے میاں اور چاروں بچوں کے ساتھ مغرب کی سیاحت پر نکلی ہے۔ کیا
میں نے اسے نہیں بتایا کہاں رہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ جاکر پکڑی میں کھانا
لہا مار پرانے دنوں کا ذکر نکلا جب ردزی اور دیپالی انڈر گروڈ الفلابی درکرز تھیں۔ ردزی
ساتھ ان کے جہندستانی میزبان کے لڑکے لوکیا ل بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا اسکول میں ہم دو
تھی کر پتی تھیں۔ کلیناٹ اور کنکے بردا کی طرح کی ہیروئن بنیں تو ردزی کے میزبان کی لڑکی نے
یہ لوگ آپ کے زمانے کی فلم اسٹار تھیں؟

”کافکا کہتا ہے کہ بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا۔
نے بھی لاسا ہی بولا۔“

”اوہ گوڈ کیپ کو آرٹ یا سمین یو آر کریزی۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں اپنی کپنی کے کاغذ
”جھن جھن جھن۔“ اچھا۔ سنو۔ ایک پولش رائٹر نے کہا۔
”ہیں۔ تم نے پھر ناچ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے تم کو منع کیا ہے۔“
”میںوں چم کے یار منا دل دے۔“
”خور گوڈز سیک۔ گھنگر و اتارو۔ ڈاکٹر کا حکم مانو۔“

منو پولش رائٹر نے کہا ہے۔ انسان کی روح جو سات تالوں میں بند ہے اس میں
گیشہ۔۔۔ بتاؤں۔ سن رہے ہو۔۔۔“

”بکو۔“

”ایک پوشیدہ گوشہ ہے جس کو صرف مصائب کی کنجی ہی کھول سکتی ہے۔ اور اس گہشتہ میں
ت اور افضل ترین نعم اور ادراک چھپا ہوا ہے۔ اور مقبول ایک جگہ میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب
بھی میں نے خدا کو دیکھا۔“

”اور بکو۔“

”اور جب ہم اپنی مسرت کے باہر میں سوچتے ہیں اس وقت ہمارا تخیل بچے کے تخیل کی طرح
ور معصوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم حسن در بچے میں کھڑے ہوتے اس کے سامنے کا منظر تائی
ہوتا۔“

”اور شیکور ایسا بول گیا ہے کہ یاد مندر کی وہ بچان ہے جو حال کو مار کر اس کا دل مردہ ماضی کے سامنے
رہی ہے۔“

”اور کیا کیا بول گیا ہے، تمہارے شیکور نے ناگ میں دم کر رکھا ہے۔“
”چھن چھن چھن۔“

جو پیرادے سو ہی پہنوں

جو دے سو ہی کھاؤں۔

جہاں بٹھا دے تاں ہی بیٹھوں۔

سے یو لومی۔ میں نے التجا کی۔

”آئی لویو“ اس نے جواب دیا۔

مقبول اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا اسے مزدوری کام سے جا ملے۔ خدا حافظ
باہر گیا کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مقبول ایک سیلف میڈ جید و متمدد کاروباری ہے اور عوام سیلف
امیاب لوگ خود غرض ایگو سنٹرک اور خود پسند اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایگو سنٹرک، خود پسند اور مغرور
مگر بہت سی چیزوں میں اصول پرست اور راست باز۔

وہ اپنی ایک کتاب میرے کمرے میں بھول گیا تھا۔ میں نے کتاب اٹھائی کہ سنبھال کر رکھ دوں جب دوبارہ
دے دوں گی۔ کتاب میرے ایک کھٹا خط مرک کر نیچے گر گیا۔ فنا نہ کی اردو تحریر۔

ڈیرٹھ لک ڈائری میں نے وہ خط پڑھا:

میرے پیارے خاندان عالی جناب خان مقبول احمد خان صاحب۔ کینز دست بستہ آداب بجا
ہے اور عرض کرتی ہے کہ دامن ہو کہ نیا ڈر موصول ہوا۔ میں خیریت سے ہوں۔ بچے بھی خیریت سے
اور آپ کو یاد کرتے ہیں گے۔ دیگر یہ کہ آپ کو ولایت گئے بہت برس ہو گئے۔ اب اگر اپنی پیاری
دکھا جائے یا ہم لوگوں کو دہاں جلد از جلد کر کے بلا لیجئے۔ اپنی ہلکھ کا خیال رکھیں۔ مکرّمہ ساس صاحبہ
مکرّمہ سسر صاحب آپ کو ماکھواتے ہیں۔ پیاری شہنشاہہ خاتون سلام عرض کرتی ہے۔ باقی ہر دم آپ
کرنے والی

آپ کی

ناچیز زوجہ میمونہ سلطان

آج بتاریخ ۹ ستمبر بمقام لاہور دست پرست کیا۔

امول پرست راستباز خان مقبول احمد خان صاحب۔ عالی جناب خان صاحب۔ تم بھی

مراکتومہ۔ گہری رات۔ اُٹو کی آنکھ۔ بلی کی آنکھ۔ چیتے کی آنکھ۔ برہن کی آنکھ۔ خاموشی سوہی
دردِ خزاں ایک ایسی کمرور بے بس عورت ہے جس کا آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ میمونہ سلطان خزانہ
ہری تھی کایا جانے کس کا دلاری کا ایک بہت پرانا گھسا پٹا ریکارڈ ارجبند منزل میں موجود تھا۔ ا
جہاں آراء آپا اسے اکثر بجا یا کرتی تھیں۔ جل جانے دو۔ جل جانے دو اس دنیا کو۔ یاں کوئی کہ
کایا نہیں۔

تم بھی غم مت کرو میمونہ سلطان۔ اے گم کے مارو گم مت کرو۔

ڈیرٹھ لک ڈائری۔ میں نے ابھی ابھی طے کیا ہے۔ کل کارمنٹ فیکٹری کے سالانہ جلسے میں خوب ناچا

WHAT THE BLOODY HELL

گی۔

ڈیرٹھ لک ڈائری۔ تم تو دبئی سرسٹھ کی پرانی ڈائری ہو۔ آج میں نے آتے برسوں بعد الماری کے پچھلے خانے

ن تم کو پڑایا یا سہرا کتوبر کے بعد سارے درق ساھے۔ کیا ہوا تھا ہمارا ٹھیک۔ طویل بیماری پھر DOLE
 دینا۔ شہزادہ موڈ لنگ کر رہا ہے کبھی دیکھنے بھی نہیں آتی۔ روزی، دیپالی کسی کو میں خط نہیں لکھتی
 یا لکھوں اپنی ساس کا سر؛ مقبول نے اچانک ملنا جیلنا چھوڑ دیا۔ ایک دائم المریض غورت کے ساتھ کو
 بدوقت خراب کہے۔ سنا ہے ایک حسین انگریز لڑکی اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اود جب تم گئے تو میں نے دیکھا کہ خدا کے پاؤں کے نشان فرش پر بنے تھے۔ ٹیگور نے کہا تھا۔ ماما
 یر فنی۔

BUT WHEN THE NIGHT IS
 ON THE HILLS, AND THE
 GREAT VOICES
 ROLL IN FROM THE SEA,
 BY STARLIGHT AND BY
 CANDLELIGHT HE COMES
 BACK TO ME

دھت۔

نادر دام تانا دی رے نا۔ نادر دام تانا دی رے نا۔
 شیرازی کا باب جیرلڈ بلونٹ ایک GAY LIB رسالے کا اسٹنٹ اڈیٹر ہو گیا ہے۔ سنا
 ہے اب ایک جرمن لڑکا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ زندگی بڑی ڈرائی چیز ہے۔ بھیانک۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج صبح برسوں بعد مقبول نے فون کیا۔ بڑی درد مندی سے کہا اگر مجھے ملازمت
 کی ضرورت ہو۔ سمبرگ میں اپنی برانچ میں ہکا بھلا کارپسٹنٹ کا کام دیدے گا۔ جس میں مجھے محنت کرنی پڑے۔
 میں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ آج میں خود مقبول کے دفتر گئی تھی۔ دقت مفرد انسانوں کو بھکاری بنا دیتا ہے۔ میں نے

اس سے کہا مجھے وہ جرمی والی نوکری دیدے۔ بڑے اخلاق سے ملا۔ میرے متعلق خاصا متھکر نظر آتا تھا۔
 مہینے سے انشاء اللہ میں ہمہ گ میں کام شروع کر دوں گی۔ شہرِ نادلا پتہ ہے۔ شاید امریکہ چلی گئی۔ باہر برون ہو
 کی طرح گر رہی ہے۔ پرسوں کرسمس ہے۔ میرے ساتھ کرسمس منانے والا کون ہے۔ چچا سارتر نے سچ کہا
 ہے۔ جنہم دوسرے لوگ ہیں HELL IS OTHER PEOPLE

کرشن چتر دشی ہیں۔ اندھیری رات میں ایک بار میں دیپالی کے ساتھ پد پری گئی تھی۔ وہاں دیپالی
 نے ہم سب کے نام کے چراغ جلا کر پتوں کی کشتیاں بنا کر ان میں رکھے تھے اور ان کو پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ
 چراغ پانی پر بہتے کچھ دور جا کر گھب اندھیرے میں کھو گئے تھے۔

ریحان الدین احمد رسنا ہے۔ کلکتہ سے ڈھاکے واپس چلے گئے۔ انڈیا میں داں زیادہ نہیں لگی۔
 اب واپس ڈھاکہ میں بھی منسٹر نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا۔ لوگ پرسنٹی پیج کی بات کرتے ہیں۔

”اور میں تو ایسی رخصت تھی کہ کتوں بلیوں بے عقل چڑیوں تک کی دلازاری نہ کرتی تھی۔ لوگوں
 نے مجھے اتنے دکھ کیوں دیئے؟“

“MUSIC IN WHERE YOU HEAR IT”

گارمنٹ فیکٹری میں میری کچھ رفیق کارمنٹ کو در بڑے جذبے سے گانا کرتی تھی۔ ایک بار جو ترنہ
 در آوے۔ وہ بھوساگر توں تر جاوے۔ مین آجاء شاں والیا۔
 جانے وہ ہے کبھی کہ نہیں۔ اب ذرا ذرا شبہ ہو چلا ہے

“LOVE IS THE STATE

OF TOTAL SECURITY

NON-LOVE IS THE

STATE OF TOTAL ABSENCE”

ڈیر گڈلک ڈائری۔ کل مقبول آیا تھا بہت دیر بیٹھا۔ کہنے لگا۔ میجر سلطان پیدائشی IMBEC ہے چچا کی لڑکی تھی اس لئے نو عمری میں اس سے شادی کر دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ بھی زیادہ نہیں رہا۔ اب تک وہ اپنی بزنس پھیلانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں چار رہیں۔ کیا میں — ؟

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔

”میں جلد سب معاملات طے کرتا ہوں“

”وہ بارنڈ والا مکان — — — ؟“

”اس سے زیادہ بڑا اور زیادہ شاندار گروہرا سکوائر میں۔“

اس کے بعد سے وہ پھر غائب ہے — — — ادا نا بھی رہے۔ افسوس کہ یہ ناؤ بھی۔

میجر بک براؤن کا میجر پنجابی ہے۔ جب سے بنگلہ دیش دار چھڑی ہے مجھے طعنے دیتا رہتا ہے۔ میں چپ ہوں جواب دے کر کہاں جاؤں گی۔ زمانہ انسان کو بزدل اور نہ صحت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ کل معلوم ہوا بول کی بہن ہینوئی اور دو بھائی سب کے سب دوسرے ”بہادر یو ہا“ کے ساتھ چٹاگانگ میں مارے گئے۔ نام ہے مقبول کا صدے کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے مجھے اپنے گھروالوں کی خیریت معلوم ہیں۔ اس کالی آندھی میں کس سے معلوم کرواؤں۔ آج صبح یہاں کے سابق مشرقی پاکستانی حال بنگلہ شیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا موڑ دوں۔ کیونکہ مقبول پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لیے پاکستان آیا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے۔ اور اگر میں یہاں کام کروں تو غدار۔ پھر جاؤں۔ دوسری ملازمت مجھے آسانی سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس کوئی اکیڈمک کوالیفیکیشن نہ ہے۔ میں نے محض رقص میں مہارت حاصل کی تھی۔ میرے ہم وطن لڑو جھگڑ کر چلے گئے۔

آج صبح پنجابی میجر نے مجھے خود ہی فوٹس دیدیا۔ میں نے مقبول کو ٹرنک کال کیا۔ وہ کراچی گیا ہوا۔ اب میں پھر ڈول پر جاتی ہوں۔

ہندو بنگالیوں کے ہاں کالی اور مہادیو کا تصور لرزہ خیز ہے۔ تخریب۔ سستی۔ قہر۔ بلایا۔
 سینکڑوں اندھیکار خون۔ قیامت۔ دیہاتی گی پھوپھی بھوتارنی دیہی چندر گنج میں بڑی عقیدت سے
 جھوم کر ایک ہندی کیرتن گاتی تھیں۔

اگر دم بگرو دم بابے ڈمرو۔ ناچے سدا شو جلت گرد

برہما ناچے دشو ناچے ناچے مہادیو

کھپڑے کے کالی ناچے ناچے چاروں دیو

کھپڑے کے کالی ناچے۔ کھپڑے کے کالی ناچے۔

نذر الاسلام کو کالی کے اس تصور نے کتنا فینسی نیٹ کیا تھا۔ کھپڑے کے

آتش نواز نذر کا بنگال اس وقت آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ یہ جملہ بھی ڈیر ڈاری ایک کلا

ن چکا ہے۔ اور کلیشے میں تبدیل ہو کر الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھود دیتے ہیں۔

چار سال گذر گئے۔ چار سال سے میں منتظر ہوں۔ شاید ایک دفعہ مقبول کے دل میں پھونکی آجا۔
 درود یاد کر لے۔ لیکن اب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود گرد و نزا سکواڑ میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں یہاں
 ملک میں شہر شہر ادنیٰ ترین نوکریاں کرتی پھر رہی ہوں۔ مزدور طبقہ کے ترکوں اور ایشیائیوں کی بھڑ میں شاہ
 ہم وطن اعلیٰ مرتبت، بنگلہ دیشی یہاں ملتے ہیں کئی کترا کے نکل جاتے ہیں کہ شاید میں اُن سے امداد کے لئے کہوں
 نیا دہ ترمئی جنریشن والے تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ انہوں نے میرا نام تک نہیں سنا۔ پرانی نسل والوں کے
 میں اب ایک EMBARRASSANT ہوں۔ جنہا ایک نے مجھے سڑن مشہور کر دیا ہے۔ کیا واقعہ
 میرا کریک آپ ہوتا جا رہا ہے؟ برتن دھو چکنے کے بعد رات گئے تک جب تک ریسٹوران خالی نہیں ہو
 ایک کو نے میں تنہا بیٹھی مٹرک کو تکتی، لگا تار سگریٹ پتی مغربی پوشاک میں ملبوس سائولی عورت۔ خالص
 انتظار۔ کچھ نہ ہونے کا انتظار۔ کیا مقبول اب بھی سامنے مٹرک کے دھندلے میں سے نمودار ہو سکتا ہے؟
 ناممکن۔ اب یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح میں ایک روز ایک گوشہ میں بیٹھی سیاہ قہوہ پی رہی تھی۔ ایک خوفناک بوڑھے گلف
 عرب نے دور سے مجھے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ اس رات سے میں نے طعام خانے میں بیٹھ کر مٹرک کو بنگلہ

رات آیتے میں مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

گل میں فرینک فرٹ جا رہی ہوں۔

فرینک فرٹ ۳۰ جنوری آج میں نے بنگلہ میں ایک ایسا سیاہ پوش FUGUE دکھایا ہے کہ ارتقا
ہم دیکھ لے تو جلتے بھریانی INDIAN MODE PURAVI - SAD EVENING MEL-
OVERTUR — وہ دیکھو دریا سے کہرہ اٹھا۔ غبار تاروں کا آٹھ رہا ہے۔
— BAS: اکھنڈ رول کے دھند لکوں میں الم کے غمی پکارتے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے کہ وقت
نے صرف: وقت نے۔

POIN — ہمیں یقین تھا کہ روز فردا کرن کرن دل میں آجے گا کیا کرے گا جہاں کو روشن۔
COANYERPOI — الم کے ساتھی سیاہ کپڑوں میں، بیدلی کے غم اٹھائے یوں نوحہ زن ہیں یہ وقت
بولا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر، آنسوؤں کے ریشہ بہاؤ یہ وادی غم ہے۔
BAS — جنازے واپس گھر لو کو آئے۔ جنازے واپس۔ جنازے واپس۔

بجواس۔ موربہ بجواس۔ اد۔ کے۔ میں MODE بسنت میں موسم بہار کا سیلے کر لو گرات کرتی ہوں
تخت کرو دل سخت کرو راسی طرح زندہ رہنا ممکن۔
یہ جتنے لوگ مانتے ہیں بولتے استہ اس پر اس وقت چل رہے ہیں، یہ دراصل کسی قبرستان، کسی
یوریم کی سمت قدم بڑھا رہے ہیں۔ جتنے لوگ زندہ ہیں سب POTENTIAL لاشیں ہیں۔ میرے

اس میٹے ہاؤس میں جتنے لوگ مقیم ہیں سب فانی۔

۲۴ جنوری۔ فرینک فرٹ میں کام نہیں بنا۔ واپس ہیمبرگ۔

اب دریا اور سمندر برف سے ملتے ہیں۔

اللہ۔ میں ترے اسرار مجھ سے انکار کرتی ہوں۔ میں تیرے قبر اور ترے جلال اور تیرے غضب۔ آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح لرزاں ہوں۔ سزائے موت کے قیدی کے مانند جو جلاد کی دستک کا منتظر ہو۔ خداوند! میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرادل۔ جو کالی کا مندر ہے جس میں خلقت اٹاٹوٹ گھسی ہوئی ہے۔ جس کے تنگ صحن بجزی کے پتوں کا سر کھڑی سے جدا کیا گیا ہے۔ کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے۔ کالی کی مورقی کلکتہ کی کالی مٹاری میں سوتلہ سوسال سے زمین میں آدمی دھنسی ہوئی ہے۔ آدمی دفن ہے۔ عورت کی طرح جو ہمیشہ آدمی دفن رہتی ہے۔ اور کالی کے منہ کے فرش پر کتوں کے پتے لٹتے پھر رہے ہیں۔ عورتیں بکروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں۔ میرادل سونا گچی کی تاریک گلی ہے جس میں میرا آرزو میں میری پشیمانیاں میری حیرتیں پاؤں ڈرے لمبی پتی ہستی ساڑیوں میں، کونوں کھدروں میں، غلیظ دیوایا سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے۔ اب کا آنے والا کتنی لائے گا۔ اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

اب سامے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں طرف سے بند ہوئی۔ میں ہری من کیسے جاؤں۔

جب فون کی گھنٹی بجتی ہے دل لرزتا ہے۔ شاید مقبول نے فون کیا ہو۔ شاید شہر زاد نے فون کیا ہو۔ اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رسان مجھے مرتے دم تک کوڑا مارتا رہے گا۔ خداوند! تو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں۔ اور بہانے کس طرح مروں گی۔ میری زندگی میں او خدا نے ذوالجلال تو خوب جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے ہیں جب میں نے کہا ہے یہ میری زندگی کا بدترین، خوفناک ترین لمحہ ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی بھی اس سے کہیں زیادہ بُرے وقت آنے باقی ہیں۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکا لیا۔ ڈیر بیڈلک ڈائری۔ میرا کریک آپ ہوتا جا رہا ہے۔ کیا مجھے پرسیکیوشن کو میڈیکس ہو گیا ہے

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں —
 اوانجھی رہے۔ اپنی توار الگ رکھ دو۔ تمہاری ناؤ ٹوٹ چکی۔ جانے کا وقت آگیا۔

”آخری نقطہ نظر کے آگے اور کوئی منظر نہیں ہے۔“

دوسرا پارٹ ایک۔ میں نے رحمان الدین احمد کی بہن رابعہ آپا کو ان کے ڈھاکے کے پرانے پتے پر خط لکھا ہے۔ کہ اگر میں یہاں مریضوں کو میری غائبانہ نماز جنازہ ڈھاکے کی کسی مسجد میں ادا کروادیں۔ کیا یہاں سب بدباطن ہیں بھرتی ہری نے لکھا تھا معصوم انسانوں کے لئے ہر جگہ بدباطن انسان موجود ہیں۔ سانپ کی طرح ایک آدمی کا کان چاٹنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دیتا ہے۔ برے انسان ایسی سے بلندی کی طرف ترقی کرتے ہیں جس طرح شفاف پانی سانپ کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم آدمی کے الفاظ پر معاش کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتے ہیں۔ میں بد معاشوں کے نشتروں کو ضبط کر کے ہنسا ہوں۔ کب تک؟ کب تک بھرتی ہری؟

کہیں میں نے یہ بھی پڑھا کہ دنیا THERMODYNAMICS کے دوسرے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ کینفیوژن بڑھ رہا ہے۔ نظام عالم ختم ہو رہا ہے۔ دنیا اسی طرح بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گی۔ مہاج سرد پڑ جائے گا۔ مذہب کہتا ہے قیامت آئے گی۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں سب کچھ باقی رہے گا۔ انسانیت زندہ رہے گی۔ اللہ جانے۔

میں بہت وقار سے مرنا چاہتی ہوں۔

دکھ سکھ۔ جنون اور صبح الدماغی۔ محبت اور نفرت۔ جنگ اور امن۔ غربت اور امارت۔ شکست اور فتح۔ خرافات اور رسالت۔ گناہ اور معصومیت۔ زندگی اور موت سب میں فقط بال برابر کافر ہے۔ پل کی پل میں انسان ادھر سے ادھر ہو سکتا ہے۔

ڈرگڈلک ڈائری۔ کل رات میری بیٹی شہر زاد کی شکاگو سے ٹرانک کال آئی میں گھر پر نہ تھی آج

دھمپھرن کرے گی۔ بہت دنوں بعد اس کی آواز سنوئی گئی۔ میں بے انتہا مسرور

(نامم)

۳۹

شہر زاد کرستینا بلمونٹ

ہمبرگ - ۱۶ جون

ڈیر مسز سین۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی ممتی سے آپ کا ذکر بہت
 مستنا ہے۔ آپ کو شاید اخباروں سے معلوم ہوا ہو۔ میری والدہ مادام یاسمین بلمونٹ ایک حادثے کا
 شکار ہو گئیں۔ ایلب کے کنارے جاری تھیں پاؤں پھسل گیا۔ میرا ذاتی خیال ہے وہ خود دیا کے
 اندر چلی گئیں۔ میں آپ سے واقف نہیں۔ ممتی سے خاصی واقف تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے آپ جنگور۔ گاندو
 مسروجنی نائیڈو۔ نہرو وغیرہ کے پرستار لوگ خاصے کنفیوزڈ اور بھولے تھے۔ آپ لوگ اب C O P E
 نہیں کر سکتے۔ C O P E تو میں بھی نہیں کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی دعوے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو (ممتی
 سمیت) بہت دعوے تھے۔ میں جانتی ہوں میں ایک تیرتا ہوا تنکا ہوا میں اڑتا ہوا پائر یا جینتی یا کچھ
 کی طرح بے بضاعت جاندار ہوں۔ زمانہ درمکان میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ حیات انسانی بالکل ہمل اور
 لالچی ہے۔ یقیناً آپ کہیں گئی میرے منفی یا روحانی خیالات مغربی یورپین ڈیکسٹنس کا تجربہ ہیں۔ یوں ہی سہی۔
 آپ لوگوں کے مثبت، صحت مند، اعلیٰ روحانی خیالات کا کیا نتیجہ نکلا۔ بات یہ ہے مسز سین کہ میں چوبیس سال کی
 عمر میں آپ سے اور اپنی بے چاری رو مینٹک غمزدہ آئیڈیلٹ ڈکھی ممتی سے کہیں زیادہ ہوشیار، تجربہ کار بلکہ
 خرامٹ ہوں۔ دنیا کا کوئی تجربہ پوچھے۔۔۔ ذہنی۔ روحانی۔ جسمانی۔ وہ میں کر چکی ہوں کبھی صومالی، گرو مسرٹ
 یا ذکر کیجئے میں وہاں جا چکی ہوں۔ کسی خطرناک سے خطرناک منشیات کا نام لیجئے۔ خاکسار اس سے بہرہ ور ہو چکی
 لیجئے۔ اخلاقیات کا آپ لوگوں کا نسخہ بیکار ثابت ہوا۔ ممتی کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوتی کہ وہ دراصل کی تہذیب سے
 فی گتیں۔ بیکال، مسلمان، پاکستانی ہوتے ہوئے انہوں نے مغربی رو دیتے اپنا ناچا ہے۔ اندرونی روحانی تصادم
 ندید تھا۔ اسی کی تاب نہ لاسکیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اب میں آپ کو اصل وجہ بتاتی ہوں وہ کیوں مرنے۔

پچھلے بیس بائیس سال سے مغرب میں کافی تنگی ترشی سے گزر کر رہی تھیں۔ مختلف کارخانوں میں مزدوری۔
 قص کا انٹرنیشنل کیریئر بنانے میں ناکام رہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔
 صاحب اور ایویسینوں نے ممی کو قبل از وقت کمزور اور بوڑھا کر دیا۔ دل کا عارضہ لگ گیا۔ لیکن
 اوہ اس وجہ سے مرے کہ کھیلے دنوں میں نے ان کو شکاگو سے فون پر مطلع کیا کہ میری تصویر
 وائے کے منظر پر ہڈ پر چھپنے والی ہے۔ میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بہت کم لڑکیاں
 فوش نصیب میں جن کو یہ اعزاز میسر ہو۔ میں نے ان کو بڑی مسرت کے ساتھ شکاگو سے یہی
 نے کے لئے ٹرنک کال کیا جواباً وہ خوب چینی چلائیں اور ریسورپٹ دیا۔ چند روز بعد مجھے اُن
 مادرے کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کپڑے پہننے اور اتارنے اور جسم کی اٹھائی کو آپ
 نے اتنی شدید اہمیت کیوں دے رکھی ہے۔ جنس کے بارے میں یہ سارے بے معنی اور لغو
 لئے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہر حال میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب اچھی خاصی کامیاب
 لہ ہوں۔ اور اب تک ہر نسل اور قوم کے اتنے آدمیوں کے ساتھ سوچکی ہوں کہ ان کی نئی
 مجھے یاد نہیں۔ اور ممی بے چاری محض ایک مددچرلڈ ایڈرین بلونٹ سے شادی کر کے بقیہ عمر
 احساسِ جرم میں مبتلا رہیں کہ جس شخص سے ان کا نکاح غلط سلط پڑھا دیا گیا تھا۔ وہ تین سال
 اس کے ساتھ رہیں۔ میرے والد سے علیحدگی کے بعد مجھے یقین ہے مرحومہ نے نہایت پاک دامن
 زندگی گزاری ہوگی۔ بے مصرت، بے کار، بے معنی زندگی۔ کتنا اہول وقت ضائع کیا بے چاری نے۔
 جوانی واپس نہیں آتی۔ انسان دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔

دوسرا احساسِ جرم ممی کو یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اجازت سے مجھے رومن کیتھولک بنوا
 یہ سب میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں پرسوں شکاگو سے یہاں آئی۔ ان کے کمرے میں ان کے
 نے سے ایک ڈائری برآمد ہوئی کئی سال پرانی ڈائری ہے جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکھتی رہی تھیں۔
 ۔ بگلا۔ کہیں کہیں انگریزی۔ اس میں آپ کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ نہ مجھے بنگلہ آتی ہے نہ اردو۔
 کی پرانی دوست تھیں لہذا یہ بے چاری المناک ڈائری میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں امید کرتی ہوں
 اسے ممی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گی۔ میں ہوں آپ کی مخلص:

شہر زاد کرستینا بلونٹ

P.S. معلوم میرے والد کہاں ہیں۔ سنا ہے لندن میں GAY LIB تحریک کے آرگنائز

شامل ہو گئے ہیں۔ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میری داری کا انتقال ہو چکا ہے۔
یہ مقبول احمد خاں کون صاحب ہیں۔ ان کو گولی مار دینی چاہئے۔

P.P.S. آپ کی نسل کا دو غلامین اور اخلاق کے دو ہرے معیار حیرت انگیز ہیں۔ آپ لوگ

ندن آکر جوق در جوق "HAIR" اور "OH! CALCUTTA!" دیکھتے ہیں۔ اور پھر مہر

لیاں دیتے ہیں۔ ہم نے خود کو برائی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے۔ شاید اس وجہ سے آپ ہم سے

لٹے ہیں۔ معاف کیجئے۔ میں یہ سب آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرے بچپی میں می اکثر آپ کی

شن مثال دے کر مجھے لیکچر ملایا کرتی تھیں۔ آپ کیسی بڑی انقلابی تھیں۔ جان پر کھیل کر حصول

ادی کی جدوجہد کی۔ کتنا اعلیٰ کردار تھا آپ کا۔ اہا ہا۔ آپ کی حاصل کی ہوئی آزادی ایسی

نی کہ خود آپ ہی کو تارک الوطن ہونا پڑا۔ اور آپ کے انقلابی بلند کردار پر ویرجان الدین احمد

کو بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں ملے ہوئے کلب میں نظر آئے تھے۔ مخالفت ملک کے دو منسٹر

تھے۔ سب بیٹھے ایک ساتھ شراب پی رہے تھے۔ صبح کو کانفرنس ہال میں ایک دوسرے کے خلاف

لڑے بیان دیئے۔ جن کے اثر سے دونوں ملکوں میں مزید خون خرابہ ہوا۔ معصوم غریبوں کی جائز

گیس۔ اس سے پہلے آئے تھے می نے ملنا چاہا صاف مال گئے کہ وقت نہیں ہے۔ اگر می کوئی اہم

ہستی ہوتیں دوڑ کر ملتے۔ سیک۔ سیک۔ سیک۔ یہ آپ لوگوں کے دو ہرے معیار تھے۔ مجھے

پ کی نسل نے بہت ڈزا لٹرن کیا ہے مسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں سے بغاوت کر کے

DRUGS اور سوا میوں کے ریکٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب ہیں؟ آپ

نے امن کے لئے کام کیا تھا؟ اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں۔ مسز سین۔ اگر نو جوان لوگ

فلاور چلڈرن بن گئے آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم ہوئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

امید ہے آپ میری اس صاف گوئی کو معاف کریں گی۔ ادم شانتی شانتی شانتی۔

شہر زاد

۴۰ سوامی آتم آنند شنکر پرمی

روم ایر پورٹ پر ایک نوجوان سفید فام سوامی جی ترشول اور جھولا سنبھالے ساتھ ساتھ چلتے
اسے پر سوار ہوئے۔ اور میڈ پر مسز سین کے برابر بیٹھ گئے۔ شوا ایشوا۔ انھوں نے لمبا سانس لے کر
۱۔ اور پھر مالا جینے لگے۔ مسز سین نے تعجب سے ان کی سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ایسا نو عمر لڑکا اور
مکرانا نہیں جانتا۔

مسز سین نے دوبارہ اس کی شکل پر نظر ڈالی۔ ذرا مانوس معلوم ہوئی۔ مسز سین کو اپنی طرف
ردیختا پا کر سوامی جی نے جھولے سے اپنا تبلیغی لٹریچر نکال کر ذرا دہشتی سے اُن کی گود میں سرکا دیا۔
”معاف کرنا بیٹے تمہارا کیا نام ہے؟“

”سوامی آتم آنند شنکر پرمی۔“ لڑکے نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

”ہیں بیٹے۔ اس سے پہلے کا نام؟“

”مجھے پہلے کا نام یاد نہیں۔ میں اپنی پہلی زندگی بھول چکا ہوں۔“

”او۔ آئی سی۔“ انھوں نے گورے چھوڑ کر کوئی نظر بھر کے دیکھا۔ یہ شکل کس کی تھی۔ کس کی تھی
پس بار لو۔ آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈھاکہ۔ شاید وہ ہو۔ مسز سین خاموش رہیں۔
توقف کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی اور بولیں۔ ”ہم لوگ کتنی جلدی ایسٹھن پینچ جائیں گے۔ سائینس
ترقی کمال ہے۔“

”سائینس۔؟ پراچین کال میں وی مان اڑتے تھے۔ اور ہابھارت کے زمانے میں پہلی ویشن
دہو گیا تھا۔ انگریز ہندوؤں کی قدیم کتابیں چرا کر لے گئے اور ان کی بنا پر اتنی ترقی کر لی۔ اس پر کون روکی
ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔“ سوامی جی نے کہا۔
”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ایٹھنز۔ وہاں آئرنم قائم کروں گا۔ پھر اٹلیا۔ ہر دور۔ نارڈ شوا کا مشہور۔“

”اٹھیا جا رہے ہو تو قحط زندگان میں کام کرو۔ آج کل وہاں خشک سالی ہے۔“

”قحط زندہ لوگوں کو چاہئے کہ رین گوڈ کی پوجا کریں۔ تاکہ وہ پانی برسائے۔ ہر ہر مہادیوا۔“

”تم کو چاہئے بیٹے کہ تم رام کرشنا مشن والوں کی طرح خدمت خلق کرو۔ ہندوستان میں بڑی

غربت ہے۔“

”غریب لوگ ہمارے شکر پریم فاؤنڈیشن کے قائم کئے ہوئے مندروں میں آکر پرہسام کھا سکتے ہیں۔ لڑکے نے جواب دیا۔

”دیکھو بیٹے۔ میں بھی شکتی۔ ہمارا کالی کی پجاری ہوں شاید شکر بھگوان کی مرضی تھی کہ تم

مجھے اس طرح ملو۔ اس لئے میری بات دھیان سے سنو۔ شاید میں تمہارے والد سے واقف ہوں۔ کیا تم انڈین سول سروس کے مسٹر چارلس بارلو کے لڑکے ہو؟

گودا سنیا سی چونک پڑا۔ پھر اس نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ سخت کر کے جولا دیا۔ ”او۔ کے۔ چارلس بارلو۔ لیکن میرے لئے وہ ایک اجنبی نام ہے۔ میں اُن سے دس سال سے نہیں

ملا۔ وہ میرے والد نہیں دادا ہیں۔ میں اُن کے بڑے بیٹے ماس بارلو کا لڑکا ہوں۔“

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ ٹھکانے کے جوان سال حاکم اعلیٰ چارلس بارلو! اور اس کی بیٹی

طور پر جینی ہوئی وائیکٹ بارلو کا پوتا اتنا بڑا ہے کہ سوامی بے چارے۔

”بیٹے اگر تم۔“

”شو۔ شو۔“ نیم آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے؟ سوامی شکر پریمی نے

درستی سے کہا۔ ”میرے گریڈ پانچ چارلس بارلو آسٹریلیا میں ہیں۔ ان کی بیوی میری دادی لندن میں جرمن

بیماری کا نشانہ بن گئی تھیں۔ اب تک دوبارہ جنم لے کر بھی دوبارہ مر چکی ہوں گی۔ کیا معلوم میرے والد

نام بارلو بھی مر چکے ہیں۔ میری چھوٹی کیرل بارلو شاید زندہ ہیں۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں اور میری پسینے جتنے جتنے

ڈیڈ اور می کی طلاق ہو گئی تھی۔ میں ایک غیر اخلاقی زندگی گزارتی ہیں۔ انہوں نے ہماری کبھی پرواہ نہیں کی۔

گریڈ پانچ چارلس بارلو نے آسٹریلیا میں دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ میرا سوتیلی چاچا چرڈ۔

اس کا نام گریڈ پانچ اپنے مرحوم بھائی ونگ کمانڈر چرڈ بارلو کے نام پر رکھا تھا۔ جو سیکنڈ ورلڈ وار میں

جرمنی پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ یہ چرڈ سنڈنی میں انٹیریور ڈیکورٹر ہے۔ اور کوہا GAY۔ میری

میرا ہولند میں ایک لڑکھن کلب چلاتی ہے۔ میری والدہ ایک رئیس زادی ہیں۔ ایک فریج جگ لو کے ساتھ
یہ آف فرانس میں رہتی ہیں۔

شکر ہے وہ تو نارمل ہیں۔ مسز۔ میں نے دل میں کہا۔

”مجھے اس دولت عیش و عشرت، کامیابی، گناہ آلود دنیا سے، چوہوں کی دوسے نفرت ہوگی

یہاں میں سنیاں لے چکا ہوں۔ مٹی آپ کو کہاں ملیں؟“

”تمہاری مٹی مجھے نہیں ملیں۔ میں پورٹ آف اسپین میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر برسرِ طر ہیں۔ پچھلے
وہ ایک سرکاری مقدمے کے سلسلے میں پرتگال گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گئی تھی۔ بحیثیت انڈین سٹریٹ
بزنس پر میرا اثر و یو لیا گیا تھا۔ تمہارے دادا نے وہ پردہ گرام دیکھا اور پتہ لگا کر یہاں سے ہوٹل ہم
نے کئے۔ ہمیں اپنے شیش فارم پر لے گئے۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر بے حد
ہوئے جیسے میں ان کی تدلیوں کی بھڑکی ہوئی رشتہ دار ہوں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی
نے میں وہ مجھے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔ اب وہ اتنے اکیلے تھے۔ تنہا اور ضعیف۔
بول نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال سے آسٹریلیا آکر انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر
لی۔ اس سے طلاق ہو گئی۔ اس امریکن بیوی سے ان کا لڑکا سڈنی میں رہتا ہے مگر ان سے نہیں
شرار لوتم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ
بکر تم سب ان سے ایک بار ہی مل آؤ۔؟ ان کا پتہ لکھ لو۔“

لوکار دراکش کی مالا جیتا رہا۔ ”ان کو اپنا کرنا بھگتنا ہے۔“ اس نے سرد مہرے سے کہا۔ ”ایک سنیاں
خون کے رشتے بے معنی ہیں۔“

مسز۔ سین نے جھنجھو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ایتھنٹرک اس سے بات نہیں کی جب
ایر پورٹ پر اترنے کے لئے نیچا ہونا شروع کیا سو امی آتم آندہ شکر برمی نے اچانک
کو مخاطب کیا۔ ”میرا سوتیل چچا رچرڈ بارلو جو سڈنی میں انیٹریڈ ٹیکورٹیر ہے مجھے ابھی چند
میسرس میں ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک نیا ہوٹل سجانے کے لئے اسے ہنگل دیش ڈھاکہ بلایا
اگر اتفاق سے آپ کی دہاں اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہئے گا کہ میں اگلے مہینے کی پندرہ
بعد ہر دوں میں ہوں گا۔ یہ رشی کشن میں میرے آخرم کا پتہ ہے۔“ اس نے اپنا کارڈ سرکایا۔

”اس سے کہنے کا مجھ سے وہاں آن کر ملے۔ میں نے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ وہ مایہ حال میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اور آپ بھی رشی کش آئیے۔ شوا۔ شوا۔“
 طیارے نے لینڈ کیا۔ سوامی جی مسافروں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایرپورٹ پر اتر کر
 ہجوم میں ان کا جھنڈا اور ترشول کچھ دیر تک نظر آتا رہا۔

۴۱ جلگھر

ڈھاکہ ایرپورٹ پر یاسمین مجید یادگار کیٹی کے اراکین ہمارے پھول لئے منتظر تھے۔ شریتی دیپالی،
 بنگلہ دیش کی ایک قابل فخر بیٹی، مشہور مفید، بنگلہ دیش کی دوسری قابل فخر بیٹی، نامور قاصدہ اور شہ
 مرحومہ یاسمین بلونٹ کی یاد میں منائے جانے والے تہذیبی جشن کے لئے اتنی دور جنوبی امریکہ سے
 کی گئی تھیں۔ مرنے کے بعد یاسمین بلونٹ ”عظیم شاعرہ“ بھی قرار دیدی گئی تھی۔ واہ۔ جب وہ
 تھی پچیس برس پر دیس کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے، فاقے کر کے، لیسٹورانوں میں برتن دھو
 رشتے داروں اور ہم وطنوں کی گالیاں کھلے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے، سرد بے رحم دیا میں ڈوب کر
 اب اس کے نام پر بین الاقوامی تہذیبی جشن منایا جا رہا ہے جس پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ
 گا۔ یادگار کیٹی نے مسز سین کو آمد و رفت کا ایر ٹکٹ پیش کیا تھا۔ جسے لینے سے انہوں نے انکار کیا۔ یہ
 بڑا GHOULISH آسبی سفر تھا۔ وہ اپنے سورگیہ پتا ڈاکٹر بنوے چندر سرکار اور سورگیہ بھومی
 بھوتارنی دیسی کی راکھ ساتھ لائی تھیں کہ ان کی وصیت کے مطابق اسے ہر دور لے جا کر گنگا میں
 دیں۔ یہ شاید خود دیپالی سین کی طعن کی آخری دھڑ ہو۔ جلد شاید خود ان کا بلا واسطہ آخرت کا آجا
 سنسار میں کافی تورہ لیں۔

”آپ کے لئے انٹرکونٹینٹل میں انتظام کیا گیا ہے۔“ استقبال کیٹی کے سکریٹری نے کہا۔ ”اے
 اے ہرے فکر بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔ یا آپ کسی دوست کے ہاں قیام پسند کریں گی؟“
 اب ایک وردی پوش شو فر آگے بڑھا۔ ”میم صاحب“ وہ دانت نکوس کر بولا۔ ”نواب“

جمہد منزل سے گاڑی بھجوائی ہے۔ خود تشریف نہیں لاسکے۔ آج صبح اخبار میں آپ کا نام دیکھا حکم دیا۔
 تین گاوڑاں جا کر آپ کو لے آؤں۔ چلے۔" دیپالی نے استقبالیہ کمیٹی سے منعت چاہی۔ شوفر کے
 ہڈ تیز تیز چلتی باہر آئی۔ شوفر نے ایک سفید مسیڈیز کا دروازہ کھولا۔

نواب صاحب بیچارے اب بکتے ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ مدتوں سے اس عاندان کی خیر خبر معلوم
 نہ تھی۔ ڈھاکہ اور پورٹ آف اسپن میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ جو محض ایرسٹرز کے ذریعے نہیں پاٹا جاسکتا۔
 ۱۹۷۰ء میں وہ کھلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔ اگلے سال اکمل کے مرنے کی خبر معلوم کر کے بھی جہاں آرا کو خط
 نہ کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد ان سب سے ملنے کی خوشی اور اضطراب سے اس کا دل
 ٹکنے لگا۔

مسیڈیز ڈھاکہ کی سمت رواں تھی۔
 "سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے شوفر سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور انہماک سے کار چلانا رہا۔ وہ لڑکا سا تھا۔ شاید جمہد
 ل میں بنایا ملازم ہوا تھا۔ اس وجہ سے اسے اپنی اہمیت کا بہت احساس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن
 پچھلے ختمے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔

دیپالی نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچتی رہی۔ جہاں آرا کا سامنا کس طرح کروں۔ اکمل کی تحریر
 الفاظ میں کروں۔ اکمل کو مرے بھی اتنے برس گزر گئے۔ جہاں آرا اب اپنے پوتے کے سہارے
 نہ رہی ہوگی۔ ممکن ہے بہو نے دوسری شادی کر لی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تعزیت کے جملوں کی
 سلسل شروع کی۔ پھر دل کڑا کر کے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف شہر تھا اور یادیں بندوق کی
 دن کی طرح بوجھا کر رہی تھیں۔ یادیں LAND MINES کی طرح دفن تھیں۔

"میم صاحب گنا سنئے گا۔؟ بنگلہ دیش ریڈیو" ڈرائیور نے کہا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔
 کی کھاٹا کاکیت۔۔۔ بھٹیالی ختم ہو رہی تھی۔ اب نذر لگتی شروع ہوئی۔ بدروہی۔ کہہ دے لے
 میں سر بلند ہوں۔ اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرخوں۔ کہہ دے لے بہادر کہ اس وسیع
 ن کو جیر کر چاند سورج ستاروں کو توڑ کر جنت بھڑخ دہا کر آسمان سے ٹکرا کر میں سارے عالم کے
 بسمہ حیرت بن گیا ہوں۔" نوجوان ڈرائیور نے مرکز اطلاع دی: "میم صاحب۔ ہم بھی بہت لڑا۔"

گانا جاری رہا؛ میں سرکش سسٹل آتش نوا قیامت کا دوست طوفان تباہی دمشت ہور
دنیا کے لئے سراپا ہلاکت۔ میں ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں۔ اصول شکن۔ بربادی کا دیوتا۔
وہ بے اختیار خود بھی اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی اور پل کی پل میں اپنے کالج کے زمانے میں خواہ
پہنچ گئی۔ جب وہ اور ریمان اور روزی ہنرچی اور نمود الحق اور حیوتی سب مل کر خوش دھروش سے یہ گید
گاتے تھے۔

اُسے پتہ بھی نہ چلا مرسیڈیز ارجمند منزل کی برساتی میں کب پہنچی۔

ایک پاگل سی عورت جھپٹے سفیر بال بکھرائے برآمدے کے ایک در میں بُت بنی کھڑی تھی دیا
کو کار سے اترنا دیکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی۔

ایک ملازم نے آکر اسباب کار سے اتارا۔ دیپالی اندر گئی۔ ارجمند منزل سنان پڑی تھی۔ جہاں آ
— جہاں آرا۔ پکارتی وہ زنا خانے میں پہنچی۔ وسطی تالا بھی خالی پڑا تھا۔ دیپالی اوپر جانے کے
لئے منقش چوبی زینے کی طرف مڑی ہی تھی کہ وہ دیوانی عورت بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی ٹانگوں
پرٹ کر آ۔ آ۔ آ کرنے لگی۔

”مالا۔ میم صاحب کو تنگ مت کر۔“ ملازم نے جو اسباب اٹھائے پیچھے پیچھے آکر اٹھا
جھڑک کر کہا پھر بہان کو مخاطب کیا۔ ”میم صاحب۔ جب سے سب لوگ مارا گیا، آلا پاگل ہو گیا
اور گونگا بھی ہو گیا ہے۔“

”کون — مارا گیا —؟“

”سب جنے۔ میم صاحب۔ بڑے نواب صاحب۔ نیڑمیاں۔ اُن کا بی بی بچے۔ جہاں آرا
بی بی۔ ان کا بہو اور پوتا۔ سب مارا گیا۔ آدھی رات کے ٹائم۔ سب بندوق کا نشانہ بنا۔ یہی کوٹھی کے اندر
مالا نے سب کو مارتے دیکھا۔ جب سے یہ گونگا ہو گیا۔“

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے ایک کونڈا سا لپکا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ پھر کھڑے کھڑے زور سے
لہڑی۔ پھر اس کی ٹانگوں نے جواب دیا۔ داغ سننایا۔ سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں کے
سامنے موغ اندھیرا تیرا۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی۔ کہہ دے اے نوجوان — جو اندر میں جنت دوزخ
دھاکر۔ عرش سے ٹکرا کر سارے عالم کے لئے مجتہ حیرت۔ اُس نے وحشیوں کی طرح چاندوں طرف دیکھا

معد لختے چپ رہی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ روتے روتے اس نے عموں یا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ درندوں سے بھرے جنگل کا ایک جانور ہے۔ جس کے بھٹ کے باقی جانوروں دو ستر زیادہ خونخوار حیوان آکر حیر بھاڑ گئے ہیں۔ ادا ان کی لاشیں گدھ کھا چکے ہیں۔ اور سنان صحراریت نے ان کے ڈھلپٹے بھی غائب کر دیئے ہیں اور وہ گیدڑ کی طرح پنجوں سے زمین کھرختی ان کو یاد کر رہی ہے۔ پھر اس نے جنگلی بلی کی طرح رونا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر اجنبی شکلوں والے نوکر آکر دروازوں میں نمودار ہوئے۔ مالا اور زورے آ۔ آ۔ آ۔ کرنے لگی۔ جس طرح ایک نا سمجھ بچہ سر پتے کو روتا دیکھ کر ہمدی میں خود بھی رونے لگتا ہے۔ مالا نے دیپالی کو آنسو بہاتے دیکھ کر آنسوؤں جھری لگادی۔

دفعتاً دیپالی چپ ہو گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور سپاٹ آواز میں کہا۔ ”مجھے بڑے نواب صاحب پاس لے چلو۔ ان کو اطلاع کر دو۔ میں آگئی ہوں۔“

”وہ بھی مارا گیا میم صاحب۔“ ملازم نے جواب دیا۔ دیپالی نے فرش پر رکتہ مارا۔ ”اُس بدلعاش وٹے کیلئے ڈرائیور نے کہا نواب صاحب نے ایر پورٹ کار بھیجوائی ہے۔ نواب صاحب نے۔“

”چھوٹے نواب صاحب نے۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔ باہر گئے تھے۔ آتے ہوں گے۔ میں ان کو خبر کرتا ہوں۔ دھیرج رکھئے میم صاحب۔ نیا زیمیاں میم صاحب کے لئے ایک ٹھنڈا پانی۔ جلدی۔“ دوسرے خدمت گار نے گھبرا کر کہا اور لپکا ہوا باہر گیا۔

دیپالی اب ایک نیم جان کو کر اسپینل کی طرح فرش پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو بوردی شگ کے لئے رواں ہو گئے۔ مالا اس کے نزدیک آکر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دیپالی نے آنسوؤں کی چلس میں سے لے دیکھا۔ اور پچھلا آواز کی پرائی فغادار خادمہ مالا۔ وہ اب اپنی دیوانگی میں لکڑی کے کی طرح ہنس رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں نے ندگی کا، دنیا کا انجام دیکھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد دیپالی نے سراٹھایا۔ صدمہ دوازے پر آہٹ ہوئی۔ ”ٹائیو نائیو نائیو“

اسنبھالے بڑھیا سوٹ پہنے ریمان الدین احمد دہلیز پر کھڑے تھے۔

نواب قمر الزماں چودھری کے مہانچے۔ ارجمند منزل کے نئے مالک شمیم نواب کے واحد قانونی وراثت میں زندہ بچے تھے۔ ارجمند منزل کے موجودہ نواب۔

دیپالی نے سرزور سے جھکا اور آنکھیں میں کالی جگت کے چوراہے پر بیٹھی بتگیں بناتی ہے۔ بتگیں بنا
ہے۔ بتگیں اڑاتی ہے۔

بچے کے بعد ریحان کا دلے کر پاٹ کی فیکٹری چلے گئے جو نواب قمر الزماں اور ان کے فرزند نیر الزماں مرحوم
کی فیکٹری تھی جس کے اب وہ مالک تھے۔ زہرہ دیپالی کو آرام کرانے اور پرسیدہ دم میں لے آئیں۔ یہ جہاں آواز
مرحوم کا بیڈروم تھا۔ دیوار پر آئینہ نورس یونیفارم میں ملبوس شہسباز اکمل مرشد زادہ اور اس کی دہن کی تصویر
لگی تھی۔ یہ پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی خاطر لڑتے ہوئے مرا تھا۔ دیپالی کا سر
گھومنے لگا۔ وہ دریچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے نیچے تالاب اور ”وکریم آدتیہ کاراج سنگھ اسر
نظر آ رہا تھا اور گلاب خاص کا درخت۔

دوسری سہری پر بیٹھی زہرہ اوارائے کی شکایتیں کر رہی تھی۔

”اُمادیدی نے میرا نام میں دم کر رکھا تھا۔“ بان بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ”وہ بالکل سٹھیا لگی ہے
جس طرح وہ بلوئیدیر جا کر لاوارث بلیوں کتوں کو کھلاتی تھیں ان کا خیال تھا ریحان صاحب اور میر
بھی ان کے پالتو جانور تھے۔“

”ریحان کے متعلق ساری عمر ان کا یہ رویہ رہا۔“ دیپالی نے غیر شخصی انداز سے کہا۔ اب اس
لمحے وہ محض ایک دور کی تماشائی تھی۔

”جی ہاں۔ ہمارے لڑکے فرقان کو بھی انہوں نے ہی میرے خلاف بھڑکایا۔ وہ DRUGS
کھانے لگا۔ گھر سے نکل گیا۔ پتی بن گیا۔ پھر وہیں معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکہ آ گیا ہے۔ ریحان صاحب بیٹے کو سید
چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو ہم بھی کلکتہ کو خیر یاد کہتے ہیں۔ ڈھاکہ واپس جا کر نئی زندگی شروع کر سکتے
ساری عمر گزارنے کے بعد شاید اوارائے ان کی سمجھ میں بھی آگئی تھیں۔ ۱۹۷۱ء میں ہم لوگ ایسٹ پاکستان
آ گئے۔ ریحان نے کھانا میں بزنس شروع کر دی۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی ہیں۔ پھر پولیٹیکس میں آ
پڑے۔ عوامی لیگ۔ شیخ مجیب الرحمن۔ وہ سب چکر لڑا لیونورسٹی میں داخل ہو گیا۔ سدھ گیا۔ پھر

۱۰ اٹھارہویں صدی کے بنگالی شاعر رام پرشاد سین کا ایک گیت۔

صاحب نے اسے آگے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا۔ ہم لوگ اپنا سارا روپیہ کلکتہ سے کسی ترکیب سے یہاں لے گئے تھے۔

”اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ فرقان لندن میں تھا۔ زندہ بچ گیا۔ اب باپ کے ساتھ بزنس کچھ بھال کرتا ہے۔“

”جب ارجمند منزل پر حملہ ہوا ہم لوگ کھلنا کے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ ارجمند منزل کا یہ گھرانہ شیخ مجیب کا حامی بن چکا تھا اور جو کچھ ہوا کیوں اور کس طرح یہ لوگ مارے گئے وہ ریمان پینچ وقت آپ کو بتا چکے ہیں۔“

”ہاں۔ میں اس کی تفصیل نہیں سنا چاہتی۔“ دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ریمان نے کسی باطل طریقے سے اس قتل عام کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس نے خود کہا تھا جب لاکھوں اکٹھے مارے جائیں غماؤں ہو جاتا ہے۔ افراد کی موت کا اتنا شدید صدمہ ذہن پر نہیں رہتا۔ مرگ ابنہ واقعی ایک جشن ہے۔ کسی بھی قتل عام کے پس ماندگان کی نفسیات ہو سکتی ہے۔“ لیکن اتنا کہنے کے بعد ریمان خود بھڑک اٹھ کر رونے لگے تھے۔

ریمان کی بہن رابعہ اور اس کا شوہر اور چھوٹے بچے ریغیو جی بن کر کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں پلے تھے۔ رابعہ کو بڑی بڑی لڑکی ناصرہ نجم اسکر کلکتہ جانے کے بجائے ایک گوریلا دستے میں شامل ہو گئی تھی بہت دنوں تک غائب رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں تھی۔

”میں نے اس لڑکی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہا پسند دل سے جا ملی تھی، بڑی آفت میں پھنسی۔“

ماہند دل کے گردہ سے الگ کر دیا۔ اسکا رشپ دلوکر اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھیجوا یا۔ فرنیڈشپ درستی میں پڑھ کر آئی۔ مگر ماؤسٹ بن گئی۔ یہاں کالج میں لیکچرر ہو گئی۔ اب وہ مجھ سے نہیں ملتی۔

مے خلافت کبھی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموش سی نسل ہے۔“

بان نے نواب قمر الزماں کی آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔ اسے ناصرہ نجم اسکر کی تلخ گفتگو یاد تھی جب وہ نو سال قبل اس سے یہیں ملی تھی۔ اب ریمان نے اپنی مرسیدریز میں بیٹھ کر نرائنج جا چکے تھے۔ ان کا ٹالٹش مود شاعر بیٹا فرقان اپنا پروگرام تیار کرنے میں ڈیڑن سمنہ چلا گیا تھا۔ نوکر چاکر شاگرد بیٹے میں تھے۔

پھر قیلوے کا۔ سیٹھا کا وقت۔

”ایک بات سنو زہرہ۔ گویا تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہارے مفلس باپ زلمیندہ راعے کی موٹی لے نیچے آکر مرے اور بطور نلانی تم سے ریمان نے بیاہ کیا۔ اور یہاں قتل عام ہوا اور تم ارجمندہ منزل کی ماگن بنیں۔ زہرہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اور مجھے سونے دو۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ مالا نے دہرایا۔

یہ ارجمندہ منزل ایک بھوت گھر ہے۔ کہتے ہیں جو لوگ اچانک اور بھیانک طریقے سے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آتماں ان ہی جگہوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ کیا ان سب کی آتماں مجھے دیکھ رہی ہوں گی۔ ایک روز شام کے وقت وہ میٹرھیاں اتر کر بائیں باغ میں آگئی۔ اوپر جہاں آرا درجومہ کے کمرے کا دریکچہ روشن تھا۔ جس پر اب زہرہ موجود تھی۔ اور اسی تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

جہاں آرا تم کو بھوسا گھر سے پار اتر گئیں مگر میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ اس فیکٹری کا مالک اور اس گھر کا خادما دماغ بننے کی خاطر ریمان نے تم کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم نے ایک غلط آدمی کے ساتھ زندگی جہنم میں گزاری۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم اٹھایا۔ پھر خود سید زدی سے بے قصور قتل کر دی گئیں۔ اور آج اسی گھر میں وہی ریمان دران کی بیوی نئے نواب اور بیگم کی حیثیت سے براجمان ہیں۔

مایا تیرے کھیل۔

وہ ٹہلتی ہوئی جب گھر کی طرف چلی گئی۔ جس کا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ گواڑ چوڑے کھیلے پڑے تھے۔ وہ اندر گئی۔ بچی جلانی۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر روشن ہو گئی۔ پارسی تھیسٹر۔ دھرم تلہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ نندا اور مدھم فوٹو گرافٹ: ماسٹر مصطفیٰ، سراج الدولہ، نائیک کاہیرو۔ مس تنکوری داس دی سنگر۔ مس راداس سسلا، نائیک کی بیروئن۔ ایک بڑی روغنی پورٹریٹ۔

نوابزادہ فخر الزماں چودھری۔ اسے یاد آیا۔ یہ ریمان کے نانا تھے۔ نواب قمر الزماں کے جواہر گچھا۔ جنہوں نے تھیسٹر کے شوق میں اپنے حصے کی جائیداد اڑا دی تھی۔ یہ ان کا جلد گھر تھا۔ اس میں نواب زادہ صاحب بعد دست دیپالی کے ٹھاکر دادا بھی سنا ہے اگر گایا بجایا کرتے تھے۔ پرانے اسٹوکر ٹیک، بنگال کے تھیسٹر پرست ڈسوا، ارجمندہ منزل کے اس جلد گھر میں ساما سازو سامان اسی طرح موجود تھا۔ الماری میں ”شاہجہاں“ ”سراج الدولہ“ کے کرم خوردہ چوغے۔ نقل تاج۔ تلواریں۔ بالسرہاں۔ سینریں کے پردے لٹے ہوئے

ایک طرف رکھے تھے۔ ہال کے چوبی فرش پر گرہ جی ہوئی تھی۔ کونے میں جا لے۔ سرخ اور سفید کٹاؤ کے کام کا جھاردار پہنچا۔ چھت گیریاں نواز زادہ میٹر الزماں کی شادی کے دنوں میں اسی کمرے سے نکال کر نواز زادہ فخر الزماں مرحوم کے تصنیف کردہ ادبیر ”راجہ بھوج“ کا سنگھ آسن تالاب کے کنارے رکھ دیا گیا تھا۔ جس پر راجہ منزل کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی تھیں۔

دیپالی جلسہ گھر سے باہر آگئی۔ اندر بہت جس تھا۔ اور وحشت۔ باہر پر فضا باغ میں ”وکر م آدتیہ“ کا سنگھ آسن۔ اب بھی موجود تھا۔ گوشتیں برساتوں کی وجہ سے گل چکا تھا۔ اس کی مورتیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں اٹھائیس^{۱۸} چھوٹی چھوٹی چوبی مورتیاں لگی تھیں۔ چار بڑی چوبی مورتیوں کے سروں پر تخت کھڑا تھا۔ زیادہ تر مورتیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں۔ سنگھ آسن تیسری کی دیو لوک سے جلا وطن اسپرائیں!

گلاب خاص کے نیچے بیچ کردہ تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ایک مرتبہ، گرمیوں کی ایک معطر شام جہاں آراء نے ذکر کیا تھا۔ ”دیپالی۔ ہمارے چھوٹے دادا جہاں نواز زادہ فخر الزماں چودھری اللہ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے ”راجہ بھوج“ کا ادبیر خود کپور کیا تھا۔ راجہ بھوج کا پارٹ بھی خود ادا کرتے تھے۔ تمہارے ٹھکانہ دادا راجہ اندر بنتے تھے۔ کلکتے کی ایکٹریس آکر رمبھا اور اردشی کے پارٹ گاتی تھیں۔“

اُس شام منہ چڑھی خادمہ مالا حسب معمول تخت کے پاس گھاس پر بیٹھی تھی۔ یاسمین اور رندری بھی آئی ہوئی تھیں۔ جہاں آراء نے حکم دیا۔ ”مالا۔ راجہ بھوج کا قصہ کر۔“

”ارے بی بی۔ ہندو لوگ بولتا ہے کہ دیو لوک میں تیس^{۳۳} ٹھکانے ہیں۔ ایک رندری انہوں نے شیوجی پر بڑی نظر ڈالی۔“

”گڈ گوڈ۔“ دیپالی اور سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔

”مادہ نطف کی تلاش اور ماؤنٹ اولمپس واقعی بہت دلچسپ جگہیں رہی ہوں گی۔“ یاسمین نے کہا۔

”تو بی بی! پارونی دیسی بن گئیں! انہوں نے شراب دیا کہ اسپرائیں بے جان مورتیاں بن کر راجہ اندر کے تخت میں لگ جائیں۔“

”تو وہ جادو کے سیب کا کیا معاملہ تھا۔“ اختر آواز نے پوچھا تھا۔

”عورت مرد کی بے دہائی۔ بی بی۔“ ملا نے پان چلے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔
 اچین کا راجہ بھرتری ہری اپنی بیوی پر ماسک تھا۔ اسے ایک جوگی نے امرجیون یا نے کا سیب دیا۔ اسے کھاؤ
 دامر ہو جاؤ۔ وہ راجہ نے اپنی بی بی انگ سینا کو دیا۔ انگ سینا نے اسے اپنے ماسک سائیس کو دیدیا۔
 مائیس ہمارائی کو چل دیتا تھا۔ ادرا اپنی پریمیکا الگ رکھتا تھا جو محل کی داسی تھی۔ وہ داسی بھی سائیس کو دھوکا
 بتی تھی اس کا معسوک ایک گوالا تھا۔ داسی نے وہ سیب گوالے کو دیا۔ گوالا بھی داسی کو دھوکے میں رکھتا تھا
 اس نے اپنی معسوک کو وہ سیب دیا جو اُبلے جپتی تھی۔ وہ منہ پر سیب ٹوکرے میں اُپلوں کے ادھر پر کھے چلی جاتی
 تھی۔ راجہ بھرتری ہری جنگل میں شکار کھیلنے آیا اُس نے اسے دیکھ لیا۔ اپنی رانی انگ سینا کی بے دہائی سے اس کا
 دل ٹوٹ گیا۔ تو وہ اپنے بھائی کرم جیت کو راج پاٹ سوپ کر سنیا س لے لیا۔“

لڑکیاں مہوت ہو کر یہ اسطوری داستان سن رہی تھیں۔ ملا کہے گئی۔ ”پھر راجہ کرم جیت کو ایک
 نرک جوگی شمشان گھاٹ لے گیا۔ وہاں بیتال درختوں سے لے لٹکے ہوئے تھے۔ ادرا ایک بیتال راجہ کے
 کندھے پر بیٹھ کر اسے کہانی سناتا تھا۔ پھر کرم جیت جو تھے رمبھا اور اندوشی کے نکاح کے مقابلے میں جج بنے
 جج بنے ان کے پھیلے سے خوش ہو کر راجہ اندر نے اپنا تخت ان کو بخش دیا جس میں وہی تیس مورتیاں
 لگی تھیں۔“

لڑکیوں نے غیر شعوری طور پر اس نقلی اسطوری تخت پر نظر ڈالی اور انھیں محسوس ہوا جیسے وہ
 فوراً اس دیو مالائی راج سنگھاسن پر موجود تھیں۔

”ادب کرم جیت کے مرنے کے بعد اس جیسا لائق راجہ کوئی نہ ہوا۔ تو اس سنگھاسن کو دفن کر دیا گیا اور
 مدیوں بعد راجہ بھوج نے اسے کھیت مید سے کھود کر نکلوایا۔“ جہاں آواز بولی۔ ”اب جب وہ راجہ اس
 تخت پر بیٹھنے کے لئے بڑھا تو ایک مورتی نے آواز دی۔ اس تخت پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو راجہ وکرم آدیر جیسا
 سخی اور فیاض ہو۔ اس طرح راجہ بھوج تیس مرتبہ تخت کی طرف بڑھے اور ہر مرتبہ ایک ایک مورتی نے لٹکار کر
 ان کو وکرم تیر کے اوصاف کے متعلق کوئی قصہ سنایا۔ دفائش۔ اصل پرست۔ راست باز۔ بہادر۔

جمل۔ یہ۔ وہ۔“

تب یاسین نے کہا تھا۔ ”آئیڈیا۔“ آپ کے چھوٹے ملا نے اوپر لایا تھا۔ میں اس کا پیلے بناؤں

”یہ ہو گئی۔“

”بنگلہ دیش کی تعمیر نو میں مصروف ہو؟“

وہ چپ رہیں۔ جیسے ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

دفعۃً دیپالی کو محسوس ہوا اور پرہیزگاری سے جہاں آرا جھانک رہی ہے اس نے غصہ سے زہرہ تھی۔ میگ زہرہ ریحان الدین احمد۔ مجھے ہیوس میٹن نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس چھاپا لوک راز جلد بھانگنا چاہئے۔ محفوظ۔ دور افتادہ پورٹ آف اسپن، پرسکون، غیر جنگ شہر ہر برسرِ ملت بین، خوش باش برازیلین بھادوچ آیا روزینا۔ ایٹ انڈین ملازمہ مسٹرئس مسرتی، نیگرو جبرائیل ریاضی ری اصل، راحت بخش آرام دہ دنیا ہے۔ بیتا لول کے اس مرگھٹ سے اتنی مختلف۔ یہاں ہر ہر قدم پر مال ایک ایک پرانا تھمہ دہرائے جا رہا ہے اور جنات کافولیں مسلسل پوچھ رہے ہیں۔ اور سناؤں؟

ریحان نے بھی نظریں اٹھا کر جہاں آرا کے کمرے کے درپے کو دیکھا۔ دیپالی پر نظر ڈالی اور آنکھیں جھکا لیں۔ ”مالا۔ مالا برابر آ۔ آکر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی بات فیر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہاں۔ کاش میں بھی اس کی بات سمجھ سکتا۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے۔“
دیپالی۔ جہاں آرا۔ یاسمین حمید۔ تین عورتوں میں سے بد بڑی بُری طرح ٹوٹیں۔ دیپالی نے آدیتھ کے سنگھاسن کی ایک مودتی برہم دھڑکھ کر دل میں کہا۔
پالکی چولے۔ پالکی چولے ہو ہو۔ وہ آہستہ سے گنگنا نے لگی۔
”دیپالی۔ میں نے آج سے پچیس سال قبل تم سے آخری بار گانا سنا تھا۔ چند سنگ کے بھاٹک پر ہی طرح گوھوے کے وقت۔“

”سنا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ ریحان تم نے۔ تم نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کر لئے۔ کلکتے میں رہیں بھی۔“ وہ غم و غصے سے جھنجھلا کر رہ گئی۔

”سمجھوتہ! کیا تم نے نہیں کیا؟ کیا تم نے پورٹ آف اسپن میں سمجھوتہ نہیں کیا؟“
”میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔“

”یہ بات تم کہہ سکتی ہو۔“ وہ بھی ہنسنے لگا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں قوت برداشت کم ہوجاتی
 ”اچھا۔ چلاؤ نہیں۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے دو جھکی بڑھے بڑھیا کیوں لڑ رہے ہیں۔“
 ریمان نے تھلا کر سگریٹ اپنے پوٹ کے نیچے کھٹا۔

”یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورڈ رازی کو بحال کرا
 دی مقامی بورڈ رازی نے اس کی جگہ لے لی۔“

”شٹ اپ۔ یو آر اے سی اولڈ ٹائمز۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آجاتی ہیں امریکا
 یہاں نصیحتیں کرنے۔“ ریمان نے ہٹا کر جواب دیا۔

”تم کسی پاگل خانے گئے ہو؟“ اس نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ ”میں ایک مرتبہ اپنے شوہر لکت
 ساتھ ایک پاگل خانے گئی تھی۔ برازیل تک شہر میں۔ وہاں ایک آدمی خود کو چار دانی سمجھتا تھا۔ دو
 کہہ رہا تھا میں جیزس کرائسٹ ہوں۔ ایک عورت کا خیال تھا وہ گرچھ ہے۔ ایک عورت کو یقین تھا کہ
 گرینڈ فارکلاک ٹکٹن چلکی ہے۔ وہ مستقل ٹک ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اسی طرح۔۔۔ رونو۔۔۔
 سب اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔“

”معلوم ہے۔ اب آپ بہت عقلمند ہو گئی ہیں۔ مجھے درس دے رہی ہیں۔“

”رونو۔ ایک قعر سناؤ؟“ دیپالی نے غیر ارادی طور پر سنگھاسن کے پایوں کی بات مانہ
 مورتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب ہم لوگ نئے تھے پوٹ آف اسپن نیچے۔ چھوٹا سا ایک مکان کر لے کر
 گلی کے سرے پر ہمارے سامنے ایک خوبصورت دو منزلہ ٹورس ڈھنگ کا مکان تھا۔ اس کے نچلے پرآمد
 اب بڑا بڑا دو دروازے تھے بڑھیاں برف جیسے سفید بال، روکنگ چیمبرز پر بیٹھی ننگ کیا کرتی تھیں۔ جتنے
 پادری اور نازان کے ہاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ پابندی سے چربچ جاتیں۔ پاس پڑوس کے غریبوں کی ادا کرتی تھیں
 بڑی دھواں ماسا دھوی ٹورس تھیں۔“

”دونوں بڑھیاں روز صبح دس بجے ٹیکسی پر بیٹھ کر بازار جاتیں ان کا نیگرو باورچی ایک بڑا سا قحط
 لے کر ساتھ جاتا۔ واپسی پر اس کا قحط سامان سے بھرا ہوتا۔ ایک روز میں اس نے سوچا۔ میں اس جگہ اجنبی ہوں
 میں بھی ان کے ساتھ سبزی ترکاری کی ان دوکانوں پر جاؤں گی جہاں سے اچھی چیزیں مل سکیں۔ کئی در
 کل گئے۔ میں ان فرشتہ صفت بڑھیوں سے نہ مل سکی نہ ان کے ساتھ بانٹا۔ جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ ایک

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی تو ٹیکسی میں لے سوچا دوسری ٹیکسی لے کر میں بھی جان کے چھپے سی جوں میں پہنچ کر ان کے ساتھ ہی خریداری کروں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اس دوسری گاڑی کے چھپے چھپے۔ "میری ٹیکسی مارکیٹ سے گذر کر دائر فرنٹ کی طرف چلی۔ اگلی ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے جا رہی جس اندر سے جہاز کی تاح نکل رہے تھے۔ ڈرائیور نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ دونوں بڑھیاں اپنی گاڑی اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئیں۔ برآمدے میں دس بارہ ٹالوٹریاں صوفوں پر ایک قطار میں بیٹھی مسگریٹ پی پی ن میں تعجب سے ٹیکسی میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑھیاں باہر آئیں۔ نیگرو باورچی تھیلا اٹھائے گا تھ۔ دونوں اپنی ٹیکسی میں بیٹھیں اور واپس چلی گئیں۔ ڈرائیور نے ایک قہقہہ لگایا اور ہللا۔ میں آپ ابھی شاید نئی نئی آئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ دونوں بڑھیاں پچاس سال پہلے یہاں کی مشہور طوائف تھیں۔ دونوں نیواورکیز سے یہاں آئی تھیں۔ اب اس ہوٹل کی مالک ہیں۔ روز مج آکر نمبر سے قہقہہ خانہ کی آمدنی سب کتاب کرتی ہیں اور رات کی آمدنی کے نوٹ اس تھیلے میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ ادما دنی کا زیادہ حصہ مت خلق پر خرچ کرتی ہیں۔ بڑا بڑا پادری لوگ جب یہاں آتا ہے ان کے یہاں ہی ٹھہرتا ہے۔

"جب میں گھر واپس پہنچی۔ وہ دونوں اطمینان سے روکنگ چیرز پر بیٹھی بائبل چڑھ رہی تھیں۔ "تورو نو۔ اکثر لوگ دوغلی زندگیاں گزارتے ہیں تم ماووزیل مارسیل اور ماووزیل ماری نہیں۔ تم وہ نیگرو باورچی ہو جو وہ تھیلا اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تم بھی شامل ہو۔"

"میں تم شامل نہیں ہو۔ کیا تم کو ویسٹ انڈیز ہجرت کے بعد ایک دو ہفتہ ہیرسٹر سے شادی کر کے انوی گورنر جنرل کے ڈنر میں جانے کے بجائے پلانٹیشنرز کے مزدوروں میں انقلابی تحریک کی تنظیم نہیں کرنی بنے تھی؟ تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تم تھک چکی تھیں یا ڈزالوژن جو چکی تھیں یا اب تم بھی آہام اور آسائش خواہاں تھیں۔ چراغ مسلسل جلانے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب تم محض زبانی یا تخمینی ہمدردی نہ ہو۔ لوگوں کی بے انصافی اور بے ایمانی پر خفا ہوتی ہو۔ مگر تم بھی شامل ہو چکی ہو۔ مسلسل علیحدہ رہنا بہت ہے۔ جو علیحدہ رہتے ہیں ان کو سسکی یا غصی یا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

"میں نے اخباروں میں تمہارے شوہر کا نام ایک دوبار دیکھا ہے۔ وہ اس جزیرے کی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ مگر یہ ممکن ہے کہ وہ ایک دن واپس کے وزیر اعظم ہو جائیں اور تم پر اہم مسٹر ڈیمنڈی۔ اس وقت دیہاتی میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اور تم سے پوچھوں گا تم کتنی 'آزاد' ہو۔ تم اور میں لیوورٹری کی میز پر کھائے ہو

مینڈک ہیں جن پر زندگی نے اپنے تجربے کئے۔

”لیکن ہماری طرح سب ہی تو بوجے نہیں نکلے۔“ دیپالی نے دفعتاً بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”بہت

ہیں جنہوں نے اب تک چراغ جلانے دکھائے۔“

”آل لگ ٹو دیم۔“ ریمان نے سگریٹ تالاب میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

۴۲۔ ناصرہ نجمہ اسمرقادی

روشن پرست گذرتی ایک اداس صورت لڑکی آہستہ آہستہ چلتی آکر تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

”آداب ماموں جان۔“ اُس نے ریمان کو سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“

”آداب دیپالی ماشی“

”جیتی رہو۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“ دیپالی نے تخت کی طرف اسے بلایا۔

ریمان نے ذرا رکھائی سے دیپالی کو معنی طلب کیا۔ ”یہ میری بہن ابوبکی بیٹی ہیں۔ میں ناصرہ نجمہ

سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔“

”ماموں جان پیدا نام بتائیے۔ جیسا آراء حالہ حور نے میرا نام ناصرہ نجمہ اسمرقادی رکھا تھا۔ اور میں

ماشی سے مل چکی ہوں۔ جب یہ پھیلی باریہاں آتی تھیں۔ سن جو سنہ میں۔ اکمل کی شادی۔ اکمل کی۔“

کی آواز ڈوب گئی۔

”مجھے خوب یاد ہے۔ کسی تو ناصرہ؟“ دیپالی نے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ ویسٹ انڈیز سے آئی ہوئی ہیں۔ سوچا مل آؤں۔“

”بہت اچھا کیا۔ مجھے بہت خوشی۔ بہت خوشی۔ آج کل کیا کرتی ہو؟“

”پہلے جنگ آزادی میں لڑ رہی تھی اب ایک گریز کالج میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتی ہوں اسی کالج

آپ نے اور جہاں آراء حالہ نے پڑھا تھا۔“

”تم جنگ آزادی میں لڑیں۔“ دیپالی نے گویا خود ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

”جی ہاں۔ جب پھلی مرتبہ آپ یہاں آئی تھیں۔ سن چونسٹھ میں۔ پاکستان ایر فورس کے پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ کی شادی میں شرکت کے لئے۔ اسی تخت پر اسی طرح ایک شام میں نے آپ سے کہا تھا۔ گو ہم مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف پھر کمر ہم کرتا پاکستانی ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے کمر میں گئے۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔

”نامرہ۔ تمہاری والدہ رابعہ کیسی ہیں؟“ دیپالی نے ٹھکی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”میرے والدین بخیریت ہیں۔ میرے ماموں جان بھی۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ بخیر عافیت ہیں۔ اس نے ریحان پر ایک حقیر آمیز نظر ڈالی۔

یہ لڑکی ریحان سے کس حد تک متشغی ہے۔ اور وہ خاموش بیٹھا ہوا۔ شاید وہ اس منہ بھٹ، منہ زور، تلخ مزاج، بد زبان نئی پڑھی سے ہارنا چکا تھا۔ ان سے خائف تھا۔ یا اس کا ضمیر مجرم تھا۔ دیپالی کو وہ وقت بڑی دھشت انگیز معلوم ہوا۔ مجھے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سیاسی گفتگو کو ٹال کر وہ کچھ دیر تک نامرہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

اسکوڑکی گڑ گڑا ہٹ۔ فرقان نے اسکوڑا کر سنگھاسن کے بالکل قریب روک دیا۔ ”کیا اڈا ہو رہا ہے؟“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہاری ہی کسر تھی۔ آؤ۔“ نامرہ بولی۔

فرقان، دیپالی نے پہلی بار غور سے دیکھا اپنے انداز اور پچال ڈھال میں باپ سے بہت مختلف تھا۔

”یہ پہلے بھوکے پیڑھی کے ہمدرد شامل تھے اب پیٹ بھری پیڑھی کے لیڈر بنے والے ہیں؟“ نامرہ نے کہا۔

فرقان نے اسکوڑ پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ”شانتی! شانتی!“ اس نے منہ کر کہا۔

”شت! اپ بگس خونڈی سی فیسٹ۔“ نامرہ نے تلخی سے جواب دیا۔ ”معاف کیجئے گا دیپالی دی۔

ہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان سے ہو کر گزر رہے ہیں جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف

جدوجہد اور تقسیم ہند کی خونریزی ایک پلنگ تھی۔“

”شاید یہ ہماری خوشی نہیں تھی۔“ دیپالی نے عجز سے کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے نذر الاسلام کے درد ہی ہم ہی لوگ تھے۔

”ہم نے بڑی تباہی دیکھی۔ PACIFIST کے محسوس میں کیا لوگ خود سے سمجھتے نہیں کرتے؟ اس پسند کا ضمیر

کیا کہتا ہے؟ "ناصر نے پوچھا۔" انتخاب کیا ہونا چاہئے؟ امن پرستی یا فلسطینی مجاہد؟ امن یا آپ کے کسلائیٹ؟
 "یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ تم شاید اب بھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتیں۔ تم شاید ٹائیگر صلیبی کو آئیڈیلائز
 کر رہی ہو۔ تم مسلسل پییم انقلاب کی بات کرتی ہو۔ ناصرہ آپا تم بہت MIXED UP ہو۔" فرقان نے
 اطمینان سے کہا۔

"یہ ایک بنیادی سوال ہے فرقان احمد۔" ناصرہ چمک کر بولی۔ "کسی دوسرے کو MIXED UP
 کہنا اوجھا ہتھیار ہے۔ دیپالی ماشی۔ یہ سارا خاندان۔" اس نے ارجمند منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہزاروں
 لاکھوں مارے گئے۔ میں نے مرگ انبوہ دیکھا۔ میں نے ٹا کے مذہب کاروں دیکھا۔ میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی
 بیماری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کاروں دیکھا۔ فرقان احمد! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا سامنا کر رہے تھے
 تم اپنے باپ کے پیسے کی بدولت لندن میں مصروف عیش تھے۔" وہ دریان کو اس طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ
 اس جگہ موجود ہی نہ ہوں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر نزدیک روڈ پر پھیلنے لگے۔ دیپالی نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔
 دیوانی مالا جو اس دوران میں کوشی کے اندر جا چکی تھی۔ دوبارہ کھڑکی کی طرح سرطانی آکر سنگھاسن کے قریب تالاب
 کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اب ناصرہ فرقان سے کہہ رہی تھی۔ "ہو مزمل اور QUIETISM اور امن پرستی بڑے خوبصورت الفاظ
 ہیں۔ لیکن تمہارے دلیمین اور ساں پٹیر اور جرمی نیٹھم آج تک ایک ہندو کی گولی نہ روک پائے۔ گاندھی نے جرمو
 یہودیوں سے کہا تھا ہٹلر کے مقابلے میں انہما استعمال کریں۔ ہا ہا ہا۔ جب یہاں ڈھاکا گھبراہٹا تھا اس وقت میں دلیم جیم
 اور برٹریڈ رسل کی دہائی دیتی؟ اور تمہارے جارج فاکس کی؟ اور تمہارے ٹالسٹائی کی؟"

"ایمرسن۔ جانتی ہوں ناصرہ آپا ایمرسن نے کہا ہے کہ جگ میں دلچسپی ایک کچے اور ایمپور ذہن کی علامت ہے
 ایک آدمی کے قتل کی سزا بچاؤ ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانا باز
 اور مادر وطن کے سچوت کہلاتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لئے ایک اور اجتماعی قتل کہ
 جاتا ہے۔ ہم بنگالیوں کو ایک کمزور روہیٹک شعر پرست بودی قوم سمجھا جاتا ہے مگر ٹیوٹیو سے لے کر ٹرٹرسٹ
 مودمنٹ تک اور جب سے کئی بائبل اور کسلائیٹ تحریک تک سب سے زیادہ تشدد ہمیں ہوا ہے۔ فرقان نے کہ
 "اتھا۔ تو میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں۔" ناصرہ نے جوش سے بات کی۔ "آئین اسٹائن بڑے امن
 تھے کیا اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اسرائیلی EXPANSIONISM کے موافقت نہ کرتے؟ مزدور

غرب کے جتنے یہودی جتنے زیادہ عالم فاضل اور ہیوسنسٹ ہیں اتنے ہی زیادہ وہ فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔
 ”مغرب میں تھوڑے سے یہودی انشکچوئیل اعتدال پسند بھی ہیں۔“ دیپالی نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا۔ وہ ایک
 بے بعد اس مانوس خالص بنگالی ”اڈے“ میں شریک تھی۔ مگر اس زبردست جزیئن گیپ کا بھی اسے شدید لہسا
 نا جو اس وقت اس کے لوران دونوں کے درمیان حائل تھا وہ ان سے بحث کرتے ہوئے ذرا جھجھکتی تھی۔ غالباً
 ٹیٹ آف ڈیٹ ہو چکی تھی۔ ماضی کے ”اڈوں“ کا پرانا ساتھی ریمان اپنے خیالات میں کھویا ڈور روشن پرٹنے میں
 حروف تھا۔ اودہ بھی اب اس کا ساتھی نہ رہا تھا۔

”ہرزہنی ادیہ نکاس کی پیداوار ہے۔ امن پرستی سے بھی چند طبقوں کا فائدہ ہوگا۔ آپ پہلے فیکٹری اور بی
 جایے اور پھر امن کا پرچار کیجیے۔“ مہو نے اپنے ماموں اور ماموں زاد بھائی پر کھٹی چوٹ کی۔ فرقان خوش دلی سے
 ہنستا رہا۔ ”اور اب شاید تم مذہبی بھی ہوتے جا رہے ہو۔“ ناصرو نے کہا۔

”مذہب میں امن کی اصل رصہ ہے۔“ فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا
 ”یقیناً! دیپالی انٹی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ سی۔ آئی۔ اے نے سوامیوں کے ذریعہ کتنا بڑا جال اڑھی لٹا
 میں پھیلا دیا ہے؟“

”ناصرہ آیا۔ ڈونٹ بی ڈانٹ“ فرقان نے برطانوی لہجے میں کہا۔ ”کسی کو چھینک آئی اور تم نے کہا یہ
 سی۔ آئی۔ اے کی کارستانی ہے۔“

”اور دمکتے کامیاب ہیں“ ناصرو کہتی رہی۔ ”وہ ایک موٹا مسخرہ بال لوگی جو امریکہ میں ہے۔ ایک مشہور
 لیٹن فوجیوان انقلابی، نیولفٹ کالیڈر اس کا چچا بن گیا کیا نام اس کا میں نام بھول رہی ہوں اور جملہ بنے
 کے بعد اس نے پریس کو بیان دیا۔ — THE REVOLUTION IS OVER BABY! —“

”ناصرہ آیا۔ بات یہ ہے کہ اب یسوع بھی میرا پروردہ ہے اور حسین بھی اور حسین کی نسل کے آتشوں QUIETIST
 نام۔ وہ اصل QUIETIST تھے اور حشیتی صوفیاء۔“

”افیم کا تم پر پوری طرح اثر ہو چکا ہے۔“ ناصرو نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مذہب کی امن پرستی! مغرب میں
 دونوں طرف کی فوجوں کے ساتھ فوجی پادری جاتے ہیں۔ ایک ہی خدائے فتح کی دعا مانگتے ہیں جو دونوں طرف کے مرنے
 والوں کے لئے ایک ہی خدا اور اس کے بیٹے سے جنت طلب کرتے ہیں۔ انڈیا پاکستان کی جنگوں میں ایک طرف کے جوان
 زرگاہ کی تصویریں ساتھ لے جاتے ہیں۔ سمت سری اکال کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف نعرہ نکیر اور نو حیدر“

اور یہاں تو سن اکہتر میں دونوں طرف اسلام ہی اسلام تھا۔ "ناصرہ چپ ہو گئی۔ پاشس کے نیچے گھریاں لٹھری تھیں۔ سلسلے میں سرخ کنول کھلے تھے۔ دیپالی کو خیال آیا الیکریامیو نے کہا تھا۔ انسان کے مسلسل بہم سوالات اور کائنات کی مکمل خاموشی۔

ناصرہ پھر گرج کر لولی۔ کبھی جرج آف انگلینڈ نے یا یونوپ اور امریکہ کے قومی کلیساؤں نے ان جارجانہ لڑائیوں کو ڈناؤنس کیا جو ان کے لوگوں نے ساری دنیا میں لڑیں؟ پھلی جنگ میں پوپ نے تاسیوں اور فسطائیوں کو ڈناؤنس کیا۔؟ اور یہاں تو۔ ہمارا یہ پورا دیس ہی مولویوں کا دیس ہے۔ پاکستان کے علماء نے اس جنگ کو ڈناؤنس کیا؟ دونوں طرف ایک سے ایک بڑے مولانا موجود تھے۔ یاسمین خاں موجود کی مثال پیش کروں۔؟

"کیا مثال۔؟" فرقان نے اب ذرا دھیان سے پوچھا۔

"یاسمین خاں، شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے ولایت چلی گئی تھیں۔ سگن گچھے کے مولانا مجید اللہ کی بیٹی۔ پہلے انہوں نے قصہ اپنا کیریر بنایا۔ پھر انہوں نے ولایت میں ایک انگریز فیشن ڈیزائنر سے شادی کر لی۔ مولانا مجید اللہ نے ان کو عاق کر دیا۔ حکم صادر کیا کہ کبھی ان کو اپنی شکل نہ دکھائیں۔ یاسمین خاں کے اپنے لاشعور میں مولویت رچی ہوئی تھی ان کو معلوم تھا کہ انگریز فیشن ڈیزائنر جرنلڈ ایڈرین بلونٹ سے ان کا نکاح قطعی ہو گس تھا ایک FARCE ایک پاکستانی نقلی مولوی صاحب، جو دراصل ایک دوست تھے اور گواہ لوگ سب نشے میں آوٹ۔ تو احساس جرم نے یاسمین خاں کو سستا شروع کیا۔ پھر اپنی لڑکی کو اپنی اجازت سے محبواً انہوں نے عیسائی بنوایا۔ پھر وہ لڑکی نیوڈاڈل بن گئی۔ یاسمین خاں کو ان کے احساس جرم نے مار ڈالا۔ ان کا ضمیر ان کو کھا گیا۔ ٹھیک۔؟ مجھ کو یہ سب اس طرح معلوم ہے کہ جب ان کو دوسری بار ویسٹ جرمنی میں ہارٹ ایٹک ہوا انہوں نے امی کو بڑا اندوہناک خط لکھا تھا۔ مفصل۔ اور آخر میں لکھا تھا کہ رابعہ آپا اگر میں پردیس میں مچاؤں یہاں نہ جانے میری لاش کا کیا حشر ہو۔ میری موت کی اطلاع پر ڈھلکے کی کسی مسجد میں میری غائبانہ نماز جنازہ ادا کروا دیجئے گا۔ اچھا تو مولویوں نے یاسمین خاں کو معاف نہ کیا۔ لیکن جب یہاں کی ہزار ہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔ سینکڑوں کو مجبوراً طوائف بننا پڑا تو عالم اسلام کے کسی مولوی نے کچھ نہ کہا۔" ناصرہ چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ ہمتا رہا تھا۔

یہ لڑکی اصل باغی ہے۔ بد روہی۔ ہم لوگ شاید اس حد تک باغی نہیں تھے۔ دیپالی نے سوچا۔ دودھری

”اور آپ کو معلوم ہے دیپالی ماٹھی۔ لوگوں کو کس طرح مانا گیا؟ ان کو اسپتال لے جاتے تھے وہاں کمری
رہ کر ان کے جسم کا سارا خون نکال لیا جاتا تھا۔“ دفعتاً وہ زلمو قطار روٹنے لگی۔

AND WOMEN MUST WEEP

AND WOMEN MUST WEEP

دیپالی نے دل میں دہرایا اور خود اپنے آنسو پونچھے۔

”تو پھر کیا میں نہ ماتی۔؟ میں نے بھی کو میلا میں اپنے پستول سے ایک پنجابی فوجی سپاہی کو گولی باردی۔ اور
جاگنی کا کرب، اس کا ترپنا اور اس کا مرتا ہوا چہرہ۔ مرتا ہوا چہرہ مجھے براہِ خوب میں دکھائی دیتا ہے۔“
قی رہی۔ ”کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے۔؟“ اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔
”ناصرہ آیا۔“ فرقان نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے لندن میں ایک بہت پرانی بڑی فلم دیکھی تھی۔
فیر انٹی وار فلم PATHS OF GLORY پہلی جنگ عظیم کے متعلق اس جنگ کے زمانے کا ایک
ایلی مارلین دونوں طرف مقبول تھا تو دیپالی آٹھی۔ اتحادی سپاہی ایک جرمن لڑکے کو پٹلاتے ہیں اور
سے ایلی مارلین گواتے ہیں۔ اور گاتے گاتے وہ رونے لگتی ہے اور سپاہی خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر
ایک۔۔۔ شاید نو عمر برطانوی سپاہی ہے جو بہت خوفزدہ ہے۔ اور وہ مورچہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔
سے پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ بھگوڑے کی سزا موت ہے۔ وہ بیمار پڑتا ہے اسے فیلڈ ہسپتال میں داخل
ہیں۔ اس کا علاج کرتے ہیں۔ جب وہ ذرا بہتر ہوتا ہے اسے اسٹریچر پر ڈال کر میدان میں لاتے ہیں اور پھر
انوجان کو ایک کعبے سے باندھ دیتے ہیں۔ اور پھر فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دیتے ہیں۔“
ریحان واپس آچکے تھے اور گلاب حاص کے نیچے کھڑے یہ قہقہے سن رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔
”میں بھی بھگوڑا ہوں۔ ناصرہ۔ تم۔ اور دیپالی تم۔ میرے لئے جو سزا چاہو تجو بر کرو۔“

بڑا دھشتناک سناٹا چھا گیا۔ شام کی ہوا میں جھاؤ کی نازک ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔
ناصرہ نے سر اٹھا کر پہلی بار ذرا نرمی سے اپنے مضحل ماموں پر نظر ڈالی اور دھیرے سے ”لیکن ماموں
کیا روسی افواج رپورڈ کے عوامی محاذ والوں کی سرفروشی کے بغیر فسطائیت کو سہارا جاسکتا تھا؟
عی جنگ بھی جرم ہے؟“

”یہ سلسلہ لاتنا ہی ہے؟“ باپ کے بجائے فرقان نے جواب دیا۔ ”البر کا میون نے جنگ کے فوراً بعد

لکھا تھا کہ میں کسی ایسی سچائی کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس کی رو سے بالواسطہ یا براہ راست کسی کی زندگی کی قربانی کا مطالبہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا یوں کلیئر میں داخل ہو چکی تھی۔“

اوپر جہاں آواز کے میڈیوم کی کھڑکی کھلی۔ تیز روشنی کا راستہ سانا لالاب تک بن گیا۔ زہرہ نے دیر میں سے جھانکا۔ پھر اس نے آواز دی۔ ”اذا ختم کرو۔ کھب سے یاسین یادگار کیٹلی دالے کا خون آیا ہے۔ وہاں لوگوں کا ڈر پر انتظار کیا جا رہا ہے۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ تالاب کی سیڑھی پر بیٹھی گولی مالا برائی۔

۴۳

ریچرڈ بارلو

ڈنر کی طویل میز پر بہت بڑھیا دلایتی کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پھولوں۔ سبھی یا سمن بلونٹ مرحوم کی تصویر رکھی تھی۔ شہر کے اہم انجیلکسٹس اخبار نویس، ادیب، چند وزراء اور باقی نئی دولت مند بنگلہ دشی اپہ کلاس کے مرد اور عورتیں چھری کاٹوں سے کھانے کھاتے ہوئے معروف گفتگو تاریخ کے اسباق سے انسان کی نصیحت حاصل نہ کرنے کا نام تار بخت ہے۔“ بکری نقاب مچھلیوں اب بھی چھپتا مار رہے ہیں۔

کھانے کے بعد وہ سب جا کر ایوان نشست میں بیٹھ گئے۔ ریحان الدین احمد بشارک اسکن کی سا شہروانی چوڑی عمارت پر انجامہ سلیم شاہی جوئے، سلوڈ گروے بال، پہلے سے زیادہ ہیٹڈ سم نظر آ رہے تھے اس جگہ جگمگاتے مجمع میں اب بھی بیرو بنے ہوئے تھے۔ اہم، کامیاب، دو لختند۔ کل صبح ارجمند منزل۔ بریکفا سٹکی میز پر وہ صاف گولی سے کہہ رہے تھے۔ میری موجوداتی کی روح خوش ہوگی جن کے ساتھ ا تایا نے بے انصافی کی تھی۔ ان کی جائداد ہڑپ کر کے ان کو ایک غریب کسان سے بیاہ دیا تھا۔ مگر قدرت۔ اب ان کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ یہ سن کر بھونچتی رہ گئی۔ انسان کا ذہن، انسان کا دل و دماغ قطعاً ناقص ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔ دیکھو میں نے مدتوں پہلے متحدہ بنگال میں جو تیاں چٹمائیں۔ جیل کاٹے پھر

نگال میں۔ پھر جب مجھے وہاں اور یہاں چانس ملائیں اسے دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرتا؟
 شام نہرو نے کہا تھا فرقان بھٹی بیڑھی کا شاعر بنے جا رہا تھا اب وہ اس ہیٹ بھری بیڑھی کا لیڈر ہوگا۔
 کھانا نہایت لذیذ تھا، کلب کے چیف شیف نے بہترین فرانسیسی دیش تیار کی تھیں۔ دیپالی نے دوبارہ
 سوچا اس "جشن یاسمین بلونٹ" پر کتنا بے تحاشہ روپیہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ جبکہ خود یاسمین نے برسوں در در کی
 ٹھوکریں کھائیں اور کارخانوں میں مزدوری کی۔

سیاہ چاند پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ یاسمین تم کیتکی کا پھول تھیں جس نے سانپوں کو
 اپنی اور کھینچا۔ زندگی کے سانپ تمہیں ڈس گئے۔

اس کے قریب ایک گردنہ پکستان اور جنگلہ دیش کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔ "ہم نے یہ کیا۔
 انہوں نے یہ کیا۔"

انگریز یا فرانسیسی یا جرمن کہتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑی۔ ہم نے وہ فتح حاصل کی۔ ہم نے فلاں ایکٹ
 پاس کیا۔ اس سب کو نیشنلٹی کی ہسٹری میں "ہم" کہیں نمودار نہیں ہوتا۔ مغلوں نے یہ کیا۔ ہندوؤں نے
 یہ کیا۔ پہلے اڈیا اور پاکستان الگ الگ "ہم" تھے۔ اب بنگلہ دیش اور پاکستان الگ الگ "ہم" ہیں۔
 اچانک اس نے خود کو کہتے پایا: "اگر جناب صاحب نے پاکستان بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش
 بھی نہ ہوتا۔" پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اودہ سوچنے لگی۔ "مراٹھیا" کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم
 پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو تخریب پسند کائی کے روپ میں شک کی پوجا کرتے تھے اور
 دیہی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان ادیبوں دہشت پسندوں میں جن کو انگریزوں نے
 ٹرڈسٹ کہا اور ہندوستانیوں نے انقلابی۔ کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔ اور بنکیم چندر کا آئندہ مشہد ان کا
 آدرش تھا۔ اور "مجھرا لوگ" کی سیاست اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے CROSS-CURRENTS
 نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش۔ اور انفرادی طور پر مختلف لوگوں کی شخصیتوں
 اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال کے CROSS-CURRENTS کے اثر سے افراد کی اور قوموں کی
 زندگیاں بنی اور بگڑتی ہیں۔

وہ جھپٹلا کر سامنے دیکھنے لگی جہاں آکر سٹراٹج رہا تھا۔ اور فلور پر ریحان الدین احمد کا کیس بزم چلے
 پٹا فرقان بھٹا نوی سفارت خانے کی ایک لڑکی کے ساتھ معروف رقص تھا۔ اس لڑکے کی تازہ ترین ذہنی

جدید، مغربی فوجوں کی فوجوں کی فوجوں نے کی تھی۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے "نیولٹ" اور طلحہ علی کے دور کے بعد کی پروڈکٹ تھا۔ کیا اس میں پرست اٹھکچوئل فرقان احمد کو معلوم ہے کہ ایک نانہ میں انقلابی نظیوں نکلنے کی سزا کا لاپانی تھی؟ کیا ہم پر تاریخ کے دروازے بند کر دے جائیں گے۔ میرے چچا دیش چندر سرکار بھانسی کے تختے پر کیوں لٹک گئے؟ ان کا نام اب کسے یاد ہے؟ یا اشفاق اللہ کا؟ اور اس باغی نامہ و غم اسکر کا کیا ہوگا؟ کیا بہت جلد وہ خود بھی اپنے موجودہ خیالات کو ترک نہیں کر دے گی؟ کیا کسی ایسے نئیے کے BACKLASH کے طور پر کھڑی نیاویہ نمودار نہیں ہوگا؟ نامہ و کب تک باغی رہ پائے گی؟ جب انقلابی مسلسل ایک دوسرے کو REVISIONIST کہہ رہے ہیں جب خود انقلابی اعتدال پسندوں کو انتہا پسند ایک ESTABLISHMENT بلکہ نامشروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لیڈروں کے ذاتی کرداروں اور ان تعصبات، کمزوریوں اور ان کے مزاجوں اور اعصابی کیفیتوں کا اثر ان کی رہبری پر پڑتا ہے؟ پالیٹک جو مسافر بردار طیارہ اڑاتا ہے اس کی صحت اور اعصاب کا برابر موازنہ کیا جاتا ہے۔ مگر لیڈر کی ذہنی اور اعصابی صحت کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہم لوگوں نے، ہماری جنریشن نے کیا کیا۔؟ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ پچ ہائیکر تھے راستے کے کنارے کھڑے آنگوٹھے دکھا رہے تھے۔ ایک کارروائی اس نے لفٹ دے کر ماسکو سپنچا دیا۔ دوسری کارروائی اس نے واشنگٹن۔ کچھ لوگ اونٹ پر بیٹھ کر مکہ مدینہ واپس گئے۔ کچھ سیل گاڑی پر بیٹھ کر بنارس۔ میرے لئے جو کارروائی وہ ذرا آگے جا کر ہی فیل ہو گئی۔

بنگال کی ولینٹائن میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کی تصویر ہے۔ گو اس کو ایہ بات معلوم نہیں۔ تو کیا ریمان کرشن تھا اور میں رادھا۔؟ لوگوں میں میں ہی ہی سمجھا کرتی تھی۔ ابھی گرمیاں آئیں گی اور یہاں میرے اس پیارے حسین دیس میں قدم کے دل کی شکل والے پتوں میں زرد پھول کھلیں گے۔ لاکھ کے پیڑ پھولوں سے لد جائیں گے۔ سلطانہ چمنپا کے گی۔ برسات آئے گی۔ ساگوان کے سفید پھول۔

"آپ، مجھے مسٹر ریمان الدین احمد نے بتایا کہ برطانوی راج کے خلاف بنگال کی انڈر گراؤنڈ انقلابی تحریک میں شامل رہ چکی ہیں۔ ایک صحافی نے قریب آکر بیٹھے ہوئے اس کا سلسلہ خیالات منقطع کر دیا۔ کل صبح میں آپ کا انٹرویو لے سکتا ہوں۔ مع تصویر۔"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ چلے جائیے میرے پاس سے۔" اس نے تقریباً چلا کر دشت سے جواب دیا۔

نک کہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

آئی ایم سوڈی مسز سین۔ ”صحافی نے نرمی سے کہا اوروہاں سے ٹل گیا۔

”عجیب بد مزاج بڑھیا ہے۔“ اس نے باہر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب بگپوش ڈانس پر تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ مادام یاسمین بلونٹ مرحومہ کو خراج عقیدت وضع تھا۔ ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی اس سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا۔ آخر اسی مقصد کے لئے اسے اتنی دور ویسٹ انڈیز سے مدعو کیا گیا ہے۔ عجیب بات تھی۔ اس سے ان میں آج تک کسی نے گانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ شاید لوگ یہاں کب کے بھول چکے تھے کہ وہ عباس لیلہ شاگرد تھی۔ کہ ایک زمانے میں اس کے ریکارڈ گھر بچتے تھے۔ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے گاتی تھی۔ وپاکستان ڈھاکہ بنا اور اب ریڈیو بنگلہ دیش۔ آزاد کی لہریں۔

ریحان نک نے یادگار کیٹی والوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ تقریرات میں کسی روز اس کے گانے کا پڑگلم ہیں۔ ہر طرف عجیب کنفیوژن تھا۔ ریحان اب بائی فنانس کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناقابل یقین! وہ ہال کے ایک کونے کی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب ایک اور نوجوان اس کی طرف آیا جھک کر ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس مادام یاسمین بلونٹ کی ڈائری ہے۔ کیا آپ اسے میں عنایت کریں گی؟ بڑے شائد طریقے سے کتابی صورت میں چھپوائیں گے۔ وہ ایک ادبی شاہکار ہو گا۔“

دیپالی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے زہریلی نظروں سے نوجوان کو گھورا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی جواب دہ دیا لوریز تیز چلتی ایوان نشست سے باہر نکل آئی۔ اور برآمدے کے آخری درمیں جا کر کھڑی ہو ماسٹرنے کے درختوں پر پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ چاند بھی بہت پشیمان معلوم ہوتا تھا جس طرح ان تھی۔ اور اندر سے دل ہی دل میں ریحان نام تھا۔ اور اوریا سین تو اتنی پھٹائی تھی کہ اس دنیا ہی سے نکلی تھی۔

در کے نزدیک بھی چھوٹی میز پر ایک سفید فام نوجوان تنہا بیٹھا ڈنر کھا رہا تھا۔ ایک خاتون کو کھڑا دیکھ کر مغربی تہذیب کے مطابق تعظیماً وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”اندر اتنا ہجوم ہے کہ میں گھبرا کر باہر آگئی۔“ دیپالی نے کھوکھلی آوازیں کہا۔ ”اس عمر میں انسان زیادہ بڑا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ ویسٹ انڈیز سے۔ یہاں بیٹھ جاؤں

”شیور۔ میم۔“

”وہ مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔“

”میں کرسٹوفر ٹیگرٹ ہوں۔ میں یہاں سیر کے لئے آیا ہوں۔ اس وقت بچے ایک دوست کا انتظار
ہوں۔ اب تک نہیں آیا۔ اسے لیجئے وہ آ رہا ہے۔“

ایک اور سفید فام سنہرے بالوں والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اگر مزے کے قریب کھڑا ہو گیا۔
”رجرڈ بارلو۔“

”مسز سین۔“ ہاڈ ڈو پوڈ ڈو۔“

”ہلو۔“ مسز سین نے کان کھڑے کئے۔

”یہ واقعی بہت مختصر دنیا ہے۔ میں تمہارے والد کو جانتی ہوں اور تمہارے بچے سے چند دفعہ
ایٹھن کے راستے میں ملی۔ تمہارا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم اند شکر پریمی۔“

”اوہ۔ آتم آئنڈ۔ کریزی گائے۔“ ڈگ بارلو نے شفقت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

”وہ اگلے مہینے رشی کیش میں تمہارا انتظار کرے گا۔“ مسز سین نے کہا۔

ڈگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں کامیہ
ایئر میڈیکورپٹرین چکا تھا۔ مگر زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے دوست کرسٹوفر نے اس کے لئے میرے
کا آرڈر دیا۔ ڈگ نے کہا۔ ”آرٹھر کو سیکر نے کہیں پر لکھ لیا ہے کہ اتفاقات کا سلسلہ عقل چکر ادا کرتا ہے۔
دیکھئے مسز سین۔ آپ کی میرے بھتیجے اور مجھ سے ملاقات!“

”ساری زندگی اتفاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔“ دوسرے انگریز نوجوان کرسٹوفر ٹیگرٹ۔
بہت زیادہ ذہین معلوم نہ ہوتا تھا۔ فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

میرے نے پھلی کی ڈش ملا کر رجرڈ بارلو کے سامنے رکھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سبزی خو
چکا ہوں۔ میرے لئے سلاڈے آؤ۔“ یہ پھلی۔ اس نے دیپالی کو مخاطب کیا۔ ”کیا معلوم میری مرحو
پھو بھی مس ایلس بارلو یہ پھلی رہی ہوں۔ وہ گاؤں میں خنری تھیں۔ اور لان کی بھی پھو بھیاں۔ میری
گریٹ کانت۔ مشنری میں بارلو سیتاپور میں پیٹھے سے مرے۔ اور مس ہاڈ بارلو چینی میں مشن چلاتی تھیں۔
باکسٹرفاؤت کے دوران چینیوں نے مار ڈالا۔ آٹ ایلس کو کاروبار میں کیونٹ قبائلی حملے نے قتل کر دیا۔“

اپنے خیال میں شہید ہوئیں۔ اس وقت رو پہلے پر اگلے فور کے ہالے پہنے لیسوئج سح کے سامنے
میں کامیابی ہوں گی۔ میٹھوڑ سٹ محمد۔

THERE IS A HAPPY LAND

FAR FAR AWAY

WHERE THE SAINTS IN GLORY

STAND BRIGHT BRIGHT AS THE DAY.

وہ لگنے لگا۔ وہ متواتر شراب پی رہا تھا اور اس کا عرق آلود چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ منتر میں
یہ آسٹریلیا میں بھی اسکول میں یہ حمد گایا کرتا تھا۔ لیکن سٹی لینڈ کہیں نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ،
تھان، بنگلہ دیش، انڈیا، پاکستان۔ کہیں نہیں۔ اور میرا سوتیلہ بھتیجا سوامی آٹم آئنڈ شکر کری
ہے ہم سب اپنی اپنی کمرہوں کا پھل۔ کھاد ہے ہیں۔ اور اپنے سنسکاروں کے مطابق میری بے چاری
ناچھوڑا خشک مزاج مجرم و مقدس آئنڈ ایلس دوسرا جنم لے چکی ہوں گی۔ تو کیا پتہ وہ اس ٹھٹھکی کی جوت میں
نکال کے ایک دیبا میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور وہ ٹھٹھکی اب اس پلیٹ میں میرے سامنے تلی ہوئی رکھی ہو۔
بے چاری آئنڈ ایلس بارلو کو کس طرح نوش کر سکتا ہوں۔ ۱۱۱۱۔

اب اس نے کرسٹوفر ٹیگرٹ کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے پکارتے لگا۔ دیپالی دفعتاً شدید کراہت
ماٹھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ڈک بارلو کہتا رہا۔ "سزسن۔ میم۔ گوئیں۔ B۱۔ ہوں مگر کچھ کرسٹوفر
نبت ہے کہ شاید ہم دونوں شادی بھی کر لیں۔ آپ کو ہتھ ہے GAY شادیاں اب کافی ہونے لگی ہیں۔"

کرسٹوفر ٹیگرٹ نے شراب زیادہ نہیں پی تھی اور اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ وہ دیپالی سین کے سامنے
پہ کمرٹھ ہو گیا۔ اندر ہال میں یا سبین بلونٹ مرحومہ کے متعلق تقریریں جاری تھیں۔ دیپالی نے کہا۔ "اچھا
نٹ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

ٹوک نے دہرایا۔ "کیا پتہ اس پلیٹ میں آئنڈ ایلس بارلو تلی ہوئی رکھی ہوں یا گریٹ آئنڈ سیل ان کو
SIZZLER پڑا گیا ہو۔ چھن چھن چھن۔ ہم سب BIZZLER پر تلے جا رہے ہیں۔ آپ بھی میں بھی
ب۔ میں۔ B۱۔ ہوں۔ اگر میرے بنگال سولین امپر پلیٹ بارلو ہند گول کو اور زانوس گریٹ گریٹ فادر
یڈورڈ بارلو احمد میرے چچا ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو کو جن کے اسم گرامی ریمبر ایام رچرڈ ایڈن رڈ بارلو کھا گیا۔

علوم ہو جائے اور میرے خاندان کی ان نامور وجود مشنری خواتین میں مثلاً، بیبل، ماڈ، آلیس کو معلوم کہ چارلس بارلو آئی۔ سی۔ ایس کا ایک پوتا جیمز و سوامی بن گیا اور جیمز بارلو کا ایک پوتا، چارلس بارلو کا gay۔ تو ان کی قبروں کے اندر۔ قبروں کے اندر بھوپال آجائے گا۔ مسز سین آپ اب بھی ہیں۔ ہم now جنریشن والے صاف گو لوگ ہیں۔ ریا کاری آپ لوگوں کا اور آپ کے پرکھوں کا تھا۔ میرے بارلو بزرگ اور ان کے ساتھی جب MERRY انگلینڈ کے پبلک اسکولوں میں پڑھتے بھی gay ہو کر تھے تھے۔ مگر اوسکو وائیلڈ کو پرسیکیوٹ کرتے تھے۔ لیڈی چیئر لیز اور ممنوع تھی خواتین وہی سب کرتی تھیں۔ آپ بہت جاذب نظر خاتون ہیں۔ میں۔ بی۔ ہوں۔ کیا آپ محض HERO ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو صد میں پہنچایا۔ آپ غالباً ایک CLOSET CASE میں وہ جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدم رکھتی واپس کلب کے اندر چلی گئی۔

۴۴

آتمارشانتی۔ ۹

بنگلہ دیش بمان سے ڈم ڈم پر اتر کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن گئی۔ پھر ڈکاس کا ٹکٹ لیا۔ ۱۰ کے تیس سال بعد کے ہندوستانی عوام کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹرین نکلتے سے نکلی۔ پرانے ٹھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کافی آلود و منزلہ بنگلوں کے برابر سے گذرتی۔ بولپور رواد ہوئی۔ مقابل کی سید ایک بوڑھی بنگالی بیوہ بال جندائے سفید موٹی دھوتی کے انچل سے سر ڈھانپے اکڑوں بیٹھی تھیں۔ انہماک سے کدو کے بیج نکال رہی تھی۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک تو مند لمبا ترنگا پوربی بھیا گلے میں تہ پہنے اپنی چار سالہ بچی کو گود میں بٹھائے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچی کی مانگ میں گہرا سبند و ررج چائیلڈ میرج اب بھی موجود ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دھکا سا لگا۔ کونے میں تین طالب علم ایک سیاسی میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے اگتا کر ایک ساتھ لمبی جمائی لی۔ دوسرے کونے میں ایک بد صورت مارو عورت کارچوبی نائیلون کی گلابی ساری کے انچل کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک اندھا دلشون بھگت ایک تارہ بیا تا بھیک ماگلتا کو ریڈور میں سے گذرنا ڈبے میں آیا۔ اور مادھو آچار یہ کا مدھر آشٹک اللہ اپنے لگا

دھرم مدھرم ددھن مدھرم نینم مدھرم ہستم مدھرم — دو مسافروں نے اسے پانچ پانچ پیسے دئے۔ وہ کچھ
 یر متوق کھڑا رہا۔ پھر ٹوٹا ٹوٹتا باہر چلا گیا۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ دو مسلمان کسان —
 بڑی سی چھجے والی تنکے کی ٹوپیاں، چار خاندانیں، چھ درمی دارٹھیاں، ایک کے باہر کھائے ہوئے دانت —
 ایک بوری اٹھائے اندر آئے۔ ڈبہ کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں فرس پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ٹرین پھر روانہ ہوئی۔
 دونوں طرف دھان کے کھیتوں میں سارس کھڑے تھے۔ سپاٹ غیر دلچسپ لینڈ اسکیپ۔ بنگلہ دیش
 کے مسکور کن پکھریسک مناظر سے اس قدر مختلف — وہ میرا وطن تھا۔ دیپالی نے سوچا اور اس کے دل پر ایک
 گھونٹہ سالکا۔ وہ میرا وطن تھا — مشرقی بنگال — جس کا دنیا میں کوئی ثنائی نہیں — اور میں جلا وطن۔
 بردوان اسٹیشن آیا اور نکل گیا۔ بولپور پر ٹرین رکی، بیگ اٹھا کر وہ پلیٹ فارم پر اترے۔ سامنے ہی شو
 کیس میں شانتی نکیتن کی مشہور ریشمی ساریاں رکھی تھیں۔ اور مرشد آباد میں اب بالوچر ساریاں دوبارہ بنائی
 جا رہی ہیں۔ روایتی باتوچر کا دیگر استاد عبدالباسط خان کوراشترتی کی طرف سے قومی انعام مل چکا ہے۔
 کلکتہ میں کھوکھو کی بیوی نے اسے بتایا تھا جو کالج انڈسٹریز کے محکمے میں ملازم تھی۔ اسٹیشن کے باہر سائیکل رکشاؤں
 کا ہجوم۔ بدقوق رکشاؤں والے۔ ایک لڑکا دانت نکوسے خالی رکشا چلاتا اس کی طرف آیا۔ سامنے چھوٹا سا بازار۔
 اسلامیہ ہسپتال بڑی مسجد پرانا ناموس شانتی نکیتن۔ چند منجھی سے طلبہ راٹھی کیس منہلے رکشاؤں پر بیٹھے
 اسٹیشن کی طرف آرہے تھے۔

”کہاں چلوں دیدی؟“ لڑکے نے پوچھا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آمار نام علی حسین۔“

”علی حسین!“ اس نے دہرایا۔ یہ بدقوق رکشا والا علی حسین انڈیا میں بھی موجود تھا۔ بنگلہ دیش میں بھی

پاکستان میں بھی۔ اس کے لئے کچھ نہیں بدلاتھا۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے اپنے پرانے پروفیسروں کے متعلق دریافت کیا۔ چند مرچکے تھے۔ پروفیسر نے

بھی مرچکے تھے جن کے اصرار پر وہ یہاں داخلہ لینے آئی تھی۔ ایک کمرے میں جا کر وہ دھم سے پینک پر بیٹھ گئی۔

باہرات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور کمرے میں پھر بھٹکا ہوا ہے تھے۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔ جلد از جلد پورٹ

آف اسپین اپنے گھر واپس پہنچنا چاہئے۔ اس نے اپنے نفیس شاندار بیڈروم کا تصور کیا۔ لذت پس وقت

دے جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہاں اس وقت نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ انھہ۔ اب یہ سوچنے میں کون سرگرم
 کہ اس وقت وہاں کیا بجا ہوگا۔

بے رونق ڈاننگ ہال میں جا کر اس نے برزہ کھانا کھایا۔ ہدزہ کھانا۔ بے نیلے لوگ۔ پہلی بار اسے
 احساس ہوا جنوبی امریکہ میں اٹھا۔ اسی سال گزارنے کے بعد وہ اس جگہ کے لئے اجنبی ہے۔

صبح تیز دھوپ میں وہ اپنی پرانی مادر در سگاہ پہنچی۔ بے رنگ۔ بے رونق۔ معمولی نو عمری میں یہ جگہ
 خوابستان معلوم ہوتی تھی۔ شانتی کی عین کاروانس! علم و فن اور آدرشوں کا گہوارہ! وہ ادھر ادھر تھی۔
 ٹیگور کے مکان کا چکر لگایا۔ واپس گیسٹ ہاؤس جا کر کھانا کھایا۔ سوئی۔ شام کو پھر باہر نکلی۔ یہ جگہ اس
 کے لئے اجنبی تھی۔ قحب! بیدی کے ساتھ اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانے
 میں بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں ہمارے ہی ہندناٹھ ٹیگور کو اچانک عرفان حاصل ہو گیا تھا۔

آمار پرانے آرام

مونیتر آئندہ

آمار شانتی

غلط۔ بالکل غلط۔ سب فراڈ ہے۔ کیسا عرفان۔ اور کس چیز کا۔

تسے کی اوٹ میں چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ احتیاج پتھن اور دھرم پتھن کا تذکرہ کر رہی تھیں
 سامنے فلم قیصر اسٹارڈسٹ اور اسٹارڈسٹ اسٹارڈسٹ رکھے تھے اور ایک ٹرانز سٹر۔

یہ برصغیر ایک ایسا خلا ہے جس میں معلق نوجوان ٹرانز سٹریز پر فلمی گیت سن رہے ہیں۔ ناصو بخم آنسو اور
 اس کے جیسے نوجوان شاید بہت جلد اب ان تینوں ملکوں میں انوکھے کچھے جائیں گے، آؤٹ سائیڈرز۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا دقت سے اٹھی۔ سبزے پر سے گزرتی بھانک کی سمت
 بڑھی۔ کلا بھون کے باغ میں مہاتما بدھ کا مجسمہ نظر آیا۔ سارا مجسمہ مٹی کا تھا۔ پاؤں بھی مٹی کے تھے۔

شام ہو گئی اور سالک ایتنوں کے پرے سے منتقال پر گئے کے کسان درانتی لئے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے
 تھے۔ کنول اور فصل اور دھنک کے دیوا! سورہ درن پر تھوی! تو کہ بیج ہے اور درانتی اور ہمارا لہتہ۔ اور
 ہمارا دل اور ہمارا گھر۔ تیری تقدیس ہم نے جھانجھ اور بانسری بجا کر کی۔ وہ جھل کی طرف بڑھی۔

چاند نکل آیا۔ کچ کچ پھرے شام۔ کچ کچ پھرے۔ دو ایک گول سفید سادھی چاندنی میں

بلک رہی تھی چاروں طرف سے بند کسی مٹھ کے جسہ خانے کی طرح بیتناک گول سادھی۔ سفید نیپا سا بند۔ پھلے کسی زمانے میں سستی ہونے والی کسی مظلوم بے چاری کی خوفناک یادگار۔ دیپالی نے اپنی بیشاپی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ دہشت زدہ وہ تیز تر قدم اٹھاتی کچھ سے باہر نکلی اور شرک پر چلنے لگی۔

بولپور کے ہینڈلوم کارخانے میں باہر مسلمان بنگالی جولاہے کرگول پر ساریاں بٹ رہے تھے۔ ان کے کھوں نے ڈھلے کی ملل اور مرد آباد کار شیم بناتھا۔ "بھورہ جیسے کرگھے پر بیٹھے، رات پڑے کرگھے پر بیٹھے در کے پردے ایسے رنگ والی سائیاں بننے والے۔ کسی ہمارا جکاری کے بیاہ کے لئے سائیاں بننے والے ولاہے۔ او میاں جولاہے۔" سروجنی دمی نے پوچھا تھا۔ "سرد چاندنی میں۔ اتنے سنجیدہ، گھبرائے یا بنے ہو میاں جولاہے؟

"شاعرہ! پردوں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا کفن بننے ہیں ہم۔ دلہن کی سرخ ساری موت کا سفید کفن۔ تانا بانا۔ زندگی اور موت۔ سکھ اور دکھ۔ نیکی اور بدی۔ امن اور تشدد۔ بھان اور جہاں آزار۔ یاسمین اور شہر زاد۔ فرقان اور ناصرہ نجم السحر۔ چارلس بارلوا اور سوامی آتم آند۔ اہدی ہنر جی اور رادھیکا سانیال۔ ریمان اور منہرہ۔ ریمان اور دیپالی۔ گوری۔ میں نے تمہارے لئے الٹا کھودا ہے۔ اور سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندھ کی ڈبیا اور ڈھال کے سے سینا کی بڑیا لادوں گا۔" یاسمین ایک بار کہہ رہی تھی وہ ایک مدد اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور مولوی جشیم الدین کے کشی کا تار ماٹھ کا سیلے تخلیق کرے گی۔ "دیکھو ہم نے اس کتاب پر سروجنی دیسی سے دستخط لئے ہیں۔ سے سنبھال کر رکھنا۔" دیپالی دیدی میں نے اور جند منزل کے جلسہ گھر میں سروجنی دیسی کے پانکی بردار کا سیلے ش کیا۔ سچ سچ پانکی چلے۔ پانکی چلے ہو۔ ہو۔ "میری ان کی ہریت پلائی ان بن۔ کل نہ پانڈ ہاں بٹھا دے تال ہی بیٹھوں۔ بیچے ٹوپک جاؤں۔ ارے وہ تو دھنک کی طرح غارت۔ چاند بچہ یا۔ چاندنی بکھ گئی۔

"آدھی رات کا جنگل جیسا سنیہ پرندوں کی آواز میں چہکا اور محبت ستاروں میں جھلملائی اور شام کیوں کے روپ میں بھی۔" خزاں نے گایا۔ الم کے دل پر برستی شفق بادلوں پر پھیلی۔ دھان کے گوشوں کے سنہرے طوفان کو تیز آدھی نے بادل کی طرح اٹا دیا۔ ہوانے مجھے آواز دی۔ تم سب کے ساتھ خوابان

پتوں کی طرح بکھر گئے۔ "سانپ ایفون کے پھولوں میں خوابیدہ اور جگنو خاموش چپے کا راستہ روشن رہے ہیں۔" جھکال کے ایک قدیم کوئی نے کہا تھا۔ "ہوائیں جنگلی کے مندر میں رقصاں ہیں اور خاموش کافا دیوتاؤں کو غود لبان چڑھا رہی ہیں۔" شہزادی زیب النساء — نہیں — بیگم جہاں آنا مرشد نلحہ پھول بن میں چھپی کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں آرا اور یاسین اور گوگلی مالا تینوں کائنات کے جملہ گھر میں پردے کے پیچھے سے مسلسل چلائے جا رہی ہیں۔

- OFF - STAGE

اب صبح کا نارنجی دیشو بیرونی سورج کا لوٹا ہاتھ میں لئے دریا کی اور بڑھ رہا ہے۔ وہ نیلو فرجوانے والی بہاروں میں کھلیں گے۔ وہ ستارے جو آنے والی راتوں میں جگمگائیں گے۔ وہ یا تری جو مستقبل کے مہما کی سمت بڑھیں گے۔ پتوں کی ہبک میں ساوتری کا الم اور سینا کی وفا اور رادھا کا عشق اور شکلا کے آنسو اور دینیتی کا خوف پوشیدہ ہے۔

شاعر نے کہا۔ اور زرد پھول جو بہار کے قدموں کے گھنگر وہیں۔ اس نیم تاریکی میں کسی پہلنے والے کے چمکیلے بھوت معلوم ہو رہے ہیں۔ آسمان کی منڈیر پر ستاروں کے دیئے جل رہے ہیں۔ بادل نڈکاؤں کی طرح آسمان کے دیا پر سے گزرتے جا رہے ہیں۔

بولپور ریلوے اسٹیشن کے سامنے مسجد کے نیچے برگد تلے ایک مسلمان بوڑھی اندھی بھکارن اللہ پکار رہی ہے۔

"زندگی کا میلہ جو ابدیت کے میلے کی سمت رواں ہے۔ ایک بوڑھی فقیرنی مسلسل کلمہ پڑھتی رہے۔ وہ بارش اور دھوپ میں ٹیٹھی افلاس اور بھوک اور دکھ سے معروف گفتگو ہے مگر نشان دنیا اس پکارنے یاد سننے اس کا ایمان اس کی حاجت اور مصائب سے زیادہ صاف شفاف ہے۔ لا الہ الا اللہ الرسول اللہ" سروسجی دینی نے کہا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکشاؤں کا جھوم۔ مہنس کھد قوق علی حسین اسے اپنی رکشا پر گھیت ڈوڑے لے آیا ہے۔ "دیدید اب کب آئے گا۔" وہ بغاشت سے پوچھتا ہے۔

"معلوم نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

سامنے مسجد کے زیر سایہ برگد تلے، بوڑھی اندھی بھکارن لوگوں کے قدموں کی چاب پر دھیان سے بیٹھی ہے۔

۴۵ ونگالہ راگنی

علی پور روڈ کلکتہ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں روکنگ چیر پر بیٹھی کماری ادمارے بالکل اپنی مرحومہ والوں پر پری قوش رائے معلوم ہوئیں۔ وہی غصیلہ چہرہ۔ وہی خیرتیاں۔ بایں ہاتھ میں بڑے سے سبز تودکی وہی انگشتری ریشال۔ ہر ت جیسے سفید بال۔ بالکل کوئی بیوہ مہارانی۔ راج مانا۔ پہلے جتنی موٹی تھیں بیماری کی وجہ ب اتنی ہی دہلی ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے پوڈ لڑکوں کو ناشتہ کروا رہی تھیں۔ باغ میں چند کالے کلوٹے نینگے پور بی بچے کھربے لئے مگھس کھودنے مروت تھے۔ چالیس سال قبل ووڈ لینڈز۔ رمنہ۔ ڈھاکہ میں بھی یہی منظر تھا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا بدل گئی۔ یا سوش انقلاب آگیا۔ یا ٹیکنالوجی تحریک چلی۔ اور وہی اوکو کریک اسٹو کریک عمارتیں۔ بے کالی والی۔

”نوشکار اومادیدی۔“

”نوشکار۔ کیسے آئیں۔“ اب وہ زیادہ کوششیں ہو گئی تھیں۔ دیپالی نے بنگلہ دیش اور انڈیا آنے کا

سد بتایا۔

”تم کو معلوم ہے۔ میرا بھائی نرملیندو شراب پی پی کر مر گیا۔ ریمان مجھے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلا دغا باز۔“ ان کی خیر جھری آواز بھرا گئی۔ ریمان کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی بڑی طریختی رہی۔ دیپالی سوس کیا۔ وہ خود کنارے پر کھڑی ہلکی پھلکی تماشائی ہے۔

”ریمان اپنی روتھ میں واپس گیا اومادی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک سوہوم ہندی تھام ادم ادبے آرامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے۔“

”کیا وہ تم سے یا مجھ سے شادی کر لیتا تو کلچر CLASH کا سامنا کرتا؟“

”شرع میں نہیں۔ مگر آخر میں۔ بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو اپنے ہندی گہوارے کی

تہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی ہندیب کا متلاشی ہوتا ہے۔“

”کیا ارجمند منزل اس کا گہوارہ ہے؟“ اودادی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ اور غصے سے اُٹھ کر کھانے لگیں۔

”فابا۔ ایک حد تک۔ ارجمند منزل بھی۔ اور زہرو بھی۔“ دیپالی نے اطمینان سے جواب دیا۔
 میں بڑکین سے ان سے ڈرتی آئی ہوں۔ اب میں کیوں ڈروں۔ اب یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اب یہ۔
 Bully نہیں کر سکتیں۔ اب میرے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ ادا اب ریمان الدین احمد بھی درمیا
 نہیں ہے۔ ڈاکٹر بنوئے چند سرکار۔ اور۔ اور۔ ایک لخت اسے ایک انتہائی کمینہ خیز
 کیا۔ اب ہمارے سے زیادہ دو لخت ہوں۔ پورٹ آف ایس میں میرا کوئیل مینشن ہو ڈیگنڈہ۔
 کم شاندار نہیں۔ تو رعب کس بات کا۔؟ کرسی پر آگے کو جھکی کھانسی ہوئی کھجور کی طرح سوکھی چہر
 اُٹھارے بید تابل رحم امد محکمہ خیز معلوم ہوئیں۔ کیا ہیں ان سب کو معاف کر دینا چاہئے۔ جیوں۔
 ہیں اذیتیں پہنچائیں؟ کیا یا حسین نے بھی معاف کر دیا تھا؟ شوا۔ شوا۔

”میں نے ریمان کو ہر حال میں دیکھا اور اس کا ساتھ دیا۔“ ادا کھانسی کھانسی کر کہہ رہی تھی۔
 ”جنگ سے پہلے کے لندن میں طالب علم۔ ڈھلکے میں باؤل فقیر کے بھیس میں انڈر گراؤنڈ انقلابی۔
 آدھش وادی۔ رومیٹک۔ پارٹیشن کے بعد کلکتے میں مرگواں پر لٹیاں حال۔ پھر کامیاب ایڈر۔ چند
 غٹر۔ اور اب تم اسے بنگلہ دیش کا نیا ٹائی کوئن دیکھ کر آ رہی ہو۔ اب وہ مجھے مدتوں خط بھی نہیں لکھ
 پچھلے دنوں اس کا امن پرست شاعر لکھا کلکتہ آیا تھا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے یوٹھ پروگرام میں اسے دیکھا۔ مجھ سے
 ملے تک نایا۔“ اچانک انہوں نے پیٹر ایل کر کہا۔ ”دیپالی۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم مجھ سے ہمیشہ باز
 لے گئیں۔“

”آپ کا ایسا خیال ہے اودادی؟“ اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا تھا محمد آن اسپورٹنگ
 اور موہن بنگان کے فٹ بال میچ کے خاتمے پر دو خواتین کھیل کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہی ہیں۔
 الم ایک حبیب سیاہ پرند کے مانند اڑتا ہوا آیا اور مڑھکا کر پھیل کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

بیرہ حاضر ہوا۔ ”مس صاحب۔ گاڑی تیار رہے۔“

”چلو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ ادا مارے نے دیپالی سے کہا۔

وقت کا کپالک کھوڑیل کی مالا پہنے۔ عصا میں گھٹیاں اور جھنڈیاں لگائے آگے چل رہا ہے

”کلب —؟“

”نہیں۔ مندر۔ ماں کے مندر۔“

اومارائے پہلے لاندہب تھیں۔ اب مذہبی ہو گئی تھیں۔ برہمہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اودایک جیانک۔ بے جان، گروٹسک مدتی کی پرستش کرنے کے لئے بجا رہی تھیں۔ ان میں اور جاہل جنتو تارتی ویسی میں ندگی نے کیا فرق باقی رکھا۔

وہ دونوں برآمدے کی مرمریں میڑھیاں اتر کرہ میں بیٹھیں۔

”کالی گھاٹ —؟“ شوفر نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ سیلور۔“ ماکن نے جواب دیا۔

سیلور مٹھ کے ایک مرمر میں ہل میں درگاہ کی بڑی صورتی کے سامنے سندھیا کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔
 براحاٹے میں چند تک دھاری یورپین اور امریکن سیاسی ٹپلے پھر رہے تھے۔ پھاٹک پر کالی کی خوفناک
 ویریں بک رہی تھیں۔

پوجا کے بعد وہ دونوں باہر آئیں۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ ڈالیوں پر بندر جھول رہے تھے۔
 باپڑ کے نیچے گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا کپٹی پر بنائے ایک یوگنی دھیان میں محو آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔
 پھیروی اور ”بادلوں کو کھینچنے والی“ میگھر سبھی راگنی کے مانند رنگالی یا بنگالی بھیروراک کی ایک
 قدیم پراچین بنگال کی راگنی ہے۔ سارے راگ راکنیوں کی طرح اس کے ”نادا یاروپ“ سے علیحدہ اس
 دیوتا یا یاروپ ”یا سائیکل پیکر کا بھی تصور کیا جاتا ہے یوں کہ بن گالی راگنی شو کی ایک یوگنی ہے جو گھنے
 باہنی گٹی کے سامنے ایک مرگ چھالا پر بیٹھی ہے۔ درختوں پر بندر اور مرگ چھالا کے پاس ایک شیر ہو جوتا
 سیلور مٹھ کے کچ میں بیٹھی یہ بنگالی۔ اگر بنگالی راگنی نہیں تھی۔ کوئی معمولی کمزور عورت تھی جس نے شاید
 لہو ملو مسائل سے تنگ آ کر یہ بیوہ ہونے کے بعد سنیا سولے لیا ہو گا۔ یا وہ بال دھوا تھی یا کیا پتہ وہ کچ
 رہ ہو۔ دیپاتی نے حیرت سے سوچا۔ وہ اور اومارائے کچ سے گذر کر ایک سنان صحن میں داخل ہوئیں۔
 بھی مکمل سنا تھا۔ وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ اومارائے نے اپنی سینڈل نیچے گرا دیں۔ پاؤں منڈیر پر
 ’۔ مراقبہ کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ دیپاتی نے بھی اپنے سینڈل نیچے گرائے پاؤں منڈیر پر سمیٹ لئے ان

دونوں کے جوئے سنگی، سپاٹ زمین پر اِدھر اُدھر پڑے نہایت مضحکہ خیز اور قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ دیبا نے سراٹھا کر اوپر دیکھا۔ ایک لنگور درخت کی شاخ پر بیٹھا اسے بڑے غصے سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

”کال راتری!“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔

”کوئن۔۔۔؟“ اودا دلپوی نے چونک کر دریافت کیا۔

”کوئی نہیں۔“ دیپالی نے ذرا کہنے پر اسے کہا۔ ”کال راتری۔ شو کے گھر کا ایک بھتیجا۔ لنگور

دب میں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ غائب ہو گیا۔“

اس دھتکناک عبورے کو اڈر سنگل میں چاندوں طرف آنکھیں مٹھ دھار یوں کے خالی تجربے بہت اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے خالی پلنگوں کے اوپر ان کے کھڑاؤں رکھے تھے۔ ہم اپنے جوتے دنیا ہی میں؟ جاتے ہیں۔

سانے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کالی اور تھورو کے دس دس ہاتھوں کے ہاتھ نہایت پھیلائے کی طرح پر بہہ رہے ہیں۔ نردان کی کیا ضرورت ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ پانی پانی میں مل گیا۔ میں شکر فرما نہیں شکر کھانا چاہتا ہوں۔

اس کی یاد خوشبو کا بیس بدل کر ہزاروں میل دور رہن قمری کے سائے میں ٹری ٹاپ لہاؤس کے بھی پہنچے گی۔

اودوگین ناؤ دانے مانجھی۔ تو جوار کے ساتھ آیا۔ بھاٹا کے ساتھ۔ شہد جیسے جیت مہنے میں کوٹلیں گڑوس کی چاندنی میں پھیرے پھل پکڑنے لگے۔ پُشپ بن میں بھنورے گونجے۔

محبت کی باؤلی نوز کا خشکی پر بھی چلتی ہے۔

غلط۔ بالکل غلط۔

ایک قتل کر دی گئی۔ ایک نے خودکشی کر لی۔ ایک جلاوطن ہے۔

اور اودا مارے برگد تلے منڈیر پر بیٹھی سر جھکائے آہستہ آہستہ دھونکنی کی طرح کھانس رہی ہیں۔

قہرناک کالی۔ قہرناک۔ رحیم۔ مادرِ عظیم۔ تیری قربان نگاہ میں میں نے پودینے کی پتیوں اور

چادل اور موت اور زندگی کے نذرانوں سے انجلی سجائی۔ اودا جھوٹی۔ میں تیرے لئے کلیاں اور جنگل کی۔

لے کر آئی ہوں۔ ایک بار دہائی۔ سارے سکھ اور سارے دکھ تیرے لئے۔ گری جا بھوی۔ درختوں نے سر

برایا۔ ڈایاں آدمیوں کے ہاتھوں کی طرح بنے گئیں۔ شیل پتری بخاشا کا نئی درگا۔ مری مدھر۔ دختر کوبا۔ جب رام پر خاد سلین ماں ماں پکارنے پکارنے ماجر آگئے تھے تو انہوں نے کہا تھا۔ ماں۔ ماں مت رو۔ پتہ نہیں وہ مر چکی ہے۔ درد آتی کیوں نہیں۔

اومارائے اپنی دولت اور اپنے پود لڑ اور اپنے ملازمین کی دوسرا فقہ میں دنیا میں بالکل تنہا تھیں۔ اچانک انہوں نے سراٹھا کر بڑے اضطراب سے کہا۔ ”مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ۔ میری زندگی۔ اچھی خبریں بہت کم ہیں۔“

”اچھی خبریں میرے پاس بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اومادی۔“ دنیا پی نے کہنے پر سے جواب دیا۔ ”دو بوڑھی بیٹیاں تھیں جو ایک سنسان گلی میں برگد تلے اپنے اپنے پیچھے تیرنے کے ایک دوسرے کے مقابلے پر وجود تھیں۔ چند لمحوں بعد دنیا پی نے کہا۔ ”جہاں آوارہ اپنے سارے خاندان کے گولی سے اڑادی گئی۔“

”اور کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”یاسین حمید نے خود کشی کر لی۔“

”اور۔۔۔۔۔“

”اوماس سے پہلے جہاں آوارہ کی چھوٹی بیٹی تھی، ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ آپس کے بازوؤں پر جھانڈ کر ان کی لاشوں کا پتہ تک نہ ملا۔“ وہ ایک مردہ خانہ کے سرید چوکیدار کی طرح اب ذرا تفصیل سے بیان کرنے لگی۔ ”اور جہاں آوارہ جب ماری گئی اس کے خون کے چھینٹوں سے سدا کر حلال ہو گیا اور اسے بھی مکمل کر دیو اسے چپک گیا۔ اور اب قمران ماں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے۔۔۔“

”اور کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”میرے بابا۔ آپ کے سابق ہینڈ مین گلتر بنوئے چندر سرکار کیسر سے مرے۔ بہت سخت تکلیف ہے جان نکلی۔ آخر وقت میں ان کی شکل دیکھی۔ جاتی تھی۔ اور ان سے دو سال پہلے میری بھوپتی ہوتا تھی۔ بی اندھی ہو کر مر گئی۔ اور اتنا شدید بلڈ پریشر کہ پاگوں کی طرح چمکتی تھیں۔“

”اور کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”اٹھا رہیں صدی کا بنگالی شاعر اور کالی بھگت۔ جس سے لیک مرتبہ ال کے گیت شاہی بجرے میں سفر تے ہوئے فواب سراج الدولہ نے بھی سنے تھے۔“

”اور — آپ سامنے دیکھ رہی ہیں — وہ ادھر دیکھئے — پریتوں کے منہ سے آگ نکل رہی ہے۔ سوچی کچھ بھوت آپ کے تعاقب میں ہیں۔ اور میرے تعاقب میں۔ زمانہ مغرورانہ انہوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔“ اب تم کالی کے روپ میں میرے سامنے ظاہر ہوئی ہو۔“ اومارائے نے خائف ہو کر کہا۔

”ہم اپنی جوڑیں اسی طرح جھگنیں گے۔ کالی بھی مر چکی ہے۔ سمجھ ٹھنڈا پڑنے والا ہے۔“ دیپالی سردہری سے جواب دیا۔ ”میں اپنے باپ اور بھوپھی کی راکھ لے کر ہر دو درباری ہوں۔ راستے کا انتہا ہے۔ سنے اُمادی سیور مٹھ کے سناسی کیا گاتے ہیں۔ میں آپ کو سناؤں — ’دنیا کے اس بات میں اتنی بیٹھی اپنی پتنگ اڑا رہی ہے۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے۔ اور جب پتنگ کو لے سکیں دسعت میں پہنچ جاتی ہے تو اس ہنس کر تالی بجاتی ہے۔“

۴۶ بھیروراک

آخر شب کی سیکراں تاریکی میں بونگ جٹ فضائے بسیط میں تیر کی طرح نکلتا چلا گیا۔ پھر اس کو جگمگ کرتی روشنیوں کو گھٹپ اندھیرے نے نگل لیا۔ تاریکی اور آسمان میں گھرے اس فولادی پتھرے ہوئی سواجلبی آتماؤں کے ساتھ مھصور غیر نام بے معنی دیپالی سین نے غیر اتم بے معنی یا سین بلونٹ کی ڈائری ٹٹھا جو اس کے بیگ میں محفوظ تھی۔ اُسے میں واپس لے آئی۔ کس کو دوں۔ کوئی اس کا وارث نہیں۔ خود میرا دیپالا سین کا کوئی وارث نہیں۔ ہر انسان اپنا آغاز اور انجام خود ہے۔ لیکن شاید یا سین بلونٹ کی ایک وارث موجود ہے — نامہ و نجم السحر قادی۔ شاید۔

ٹوکیو۔ ہونو ٹوٹو۔ سان فرانسسکو۔ پورٹ آف اسپین۔ بہت لمبا سفر ہے۔ وقت کا اندازہ مغرور میردنی۔ اور اس کے آگے ہڈیاں بھا کر لے جانے والے دریا کا سفر۔ اور قبر کے کیڑوں کی زمین کا سافٹ۔ دفعتاً اسے بڑی شدید طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ زندگی بڑی نعمت ہے۔

لہ مردہ غور بھوت — سوئی جیسے بابیک مندوالے بھوت
تہ رام پرشاد سین کا ایک مہین۔

اسمین نے اپنی "ٹری میں ٹک بگ لکھا۔ IT WAS GOOD KNOWING YOU, WORLD.

اس کے برابر بیٹھے ہوئے امریکن نوجوان نے پوچھا۔ "انڈین۔؟"

"ادورسین انڈین۔ ولیٹ لنڈیز۔"

"اوہ۔! جیکا۔ کننگز ٹاؤن۔؟"

"ٹری نیلڈاڈ۔ پورٹ آف اسپین۔"

اچانک بڑی سُرّت کے ساتھ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اسپیش کولونیل مینشن۔ وسیع باغ
الہ۔ رین ٹری کا بھڑمٹ۔ کلبسویوزک۔ مشٹس مسوٹی۔ مشٹس خیر النساء۔ قابل اعتبار غیر دلچسپ
نوہر لٹ سین۔ اس کی اپنی آرام دہ خوبصورت متمول دنیا خوش گوار موسم۔ موسیقی۔ لذیذ کھانے

سیر و سیاحت I SHOULD COUNT MY BLESSINGS اُس نے یک لخت بے انتہا
نوفز دہ جو کر مویا۔ ہوا میرے باپ۔ دھتی میری ماں۔ اگنی میرے دوست۔ پانی میرے عزیز۔ آسمان میرے
جانی۔ تمہارے ساتھ وہ کر جم ملتا ہے۔ انت سے تم کو سلام بھیجتا ہوں۔ یوگیشور نے کہا تھا۔

اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال کی رفاقت یا سمن مجید نے لکھا تھا۔ موبڈٹی نہیں۔ لکھا
ہیں۔ ہندول۔ موسم بہار کا بیسے۔ ساری کائنات کا بیسے۔

کہ اپنی ساری بدی اور ذالت اور کمینگی کے باوجود دنیا بڑی سہانی جگہ ہے۔ قابل قدر
اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات۔ چند لمحوں میں صبح کا
پچہ سیاہ سمندر اب نظر آنے لگا۔ اوپر سیاہ آسمان۔ تخلیق کی اولین رات۔ ہتیاک، لرزہ خیز بھیرو کے
شر۔ آہستہ آہستہ۔ بہت مدھم اُجالا۔ اب میں بھیرو راگ کا دھیان کرتی ہوں۔ اُس نے آنکھیں
ندکیں۔ شجہ۔ سپید پوشاک۔ ششی دھر۔ گلے میں مالا۔ حلق میں زہر۔ رکت نیرہ۔ خون سی سرخ آنکھیں۔
اتوں میں جگمگاتے کڈل۔ بخور جتنے جسے دیوتا لگاتے ہیں۔ آنکھیں کھولیں۔ افق پر ٹکی سی سپیدی آجلی
تھی۔ اپنا زسنگھ بھونکتا شدہ بھیرو ساری کائنات۔ اُس نے بہت آہستہ آہستہ مختلف ترگیں گنگانی
طرور اکیں۔ رتو بھیرو۔ ونگا بھیرو۔ آند بھیرو۔ غنہ دگی سی اگنی۔ دہ راگ کے سُرور پر تیراکی۔

یہ نویں صدی بنگال کا سنسکرت شاعر ۷۷ سر پر پال

